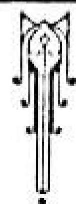
پارس

نمرہ احمد

مکمل ناول



پارس

نمرہ احمد

کانفرنس روم میں گفتگو کی بھنبھناہٹ سی تھی۔ لمبی میز کے گرد براجمان افراد میں سے کچھ آپس میں معمول کی بات چیت کر رہے تھے...... باقی اپنے کاغذات اور فائلز کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

یہ کسی اہم میٹنگ کے آغاز سے قبل کا ایک منظر تھا۔ کانفرنس ٹیبل کی سربراہی کرسی خالی تھی۔ کرسی کے دائیں طرف بیٹھے صاحب گاہے بہ گاہے کبھی کرسی پہ اور کبھی گھڑی پر نگاہ ڈال لیتے انتظار...... در انتظار......



www.paksociety.com

اس کمرے کی سڑک کورخ کرتی دیوار شیشے کی بنی تھی۔ اس کے پار نظر آتا منظر بہت حسین اور پُرفسوں تھا۔ نیلا آسماں، کپاس کے گچھوں جیسے بادل جو سرسبز پہاڑیوں نے اپنے سروں پہ تاج کی صورت پہن رکھے تھے، گہری کھائیاں اور ناگن کی سی بل کھاتی سرمئی سڑک۔ کہیں چہل قدمی کرتے سیاح...... کہیں اِکا دُکا گاڑیاں۔ وہ صبح اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ بہت ٹھنڈی سی اتر رہی تھی۔

یہ مری سے قدرے دور ایک الگ، تھلگ سی وادی کا منظر تھا۔ یہ سارا علاقہ شہر کے رش، دھوئیں اور شور سے محفوظ کسی پوشیدہ جنت کے مانند تھا اور اپنے شیشے سے اس کا حسن دکھاتا یہ کانفرنس روم اس علاقے کے سب سے بڑے اور واحد سکس اسٹار ہوٹل کا تھا۔ یہ جس بلاک کی سب سے اوپری منزل پہ واقع تھا، وہ ہوٹل کے رہائشی بلاکس سے ہٹ کر تھا اور مینجمنٹ کے زیرِ استعمال ہی رہتا تھا۔

شیشے کے پار جو سڑک دکھائی دے رہی تھی وہ ہوٹل کے عقبی طرف تھی اور اُدھر کے ہی گیٹ سے ہوٹل مالکان اور اہم آفیسرز داخل ہوا کرتے تھے۔ ابھی کافی دیر سے وہ سڑک سنسان پڑی تھی۔ سربراہی کرسی کے ساتھ بیٹھے صاحب نے گھڑی اور خالی کرسی کو بار بار دیکھ کر اکتانے کے بعد یونہی گردن موڑ کر نیچے دیکھا تو اسی پل داخلی گیٹ سے ایک سیاہ چمکتی کار اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ وہ صاحب الرٹ سے واپس سیدھے ہوئے، ایک نظر اپنے اردگرد بے پروائی سے بیٹھے عملے پہ ڈالی اور پھر ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے خاموشی سے اپنی فائل کھول لی۔

وہ سیاہ کار گیٹ کے اندر آرکی۔ شوفر نے جھٹ نکل کر پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک سیاہ کولہاپوری چپل میں مقید پیر زمین پر رکھتا دکھائی دیا اور پھر ایک لڑکی سیدھی ہوتی ہوئی باہر نکلی۔ اوپر سے اس کے چہرے کے خدوخال ٹھیک سے نظر نہیں آئے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز تھے۔ سانولی رنگت، سر کے وسط سے نکلی سیدھی مانگ...... مانگ کے دونوں اطراف کے بال دونوں کندھوں اور کمر کو ڈھانپتے سیدھے کنگھی گرتے، اتنے سیاہ اور یکجا تھے جیسے شیمپو کے اشتہار میں ماڈلز کے ہوتے ہیں کہ کہیں بھی دو بالوں کے درمیان خلا نہ دِکھتا۔

ایک سیاہ ہینڈ بیگ کہنی سے لٹک رہا تھا۔ سرمئی سادہ شلوار قمیص اور کندھوں پر سیاہ شال جو پیچھے سے آتی، کندھوں کو ڈھکتی اپنے دونوں سرے سامنے گراتی، جنہیں سینے سے نیچے اس کے بازوؤں نے سہارا دیا ہوا تھا، ایسے کہ شال کی بکل نہیں ماری گئی تھی۔ اس کا چہرہ البتہ اوپر سے دیکھنے پہ قطعاً واضح نہ تھا۔

وہ سر جھکائے اندر چلی گئی اور شیشے کی دیوار سے نظر آتے منظر سے غائب ہوگئی۔

ذرا دیر گزری اور کانفرنس روم کے گلاس ڈورز کے پار جو شیشے کی دیوار کے مقابل تھے وہی لڑکی آتی دکھائی دی۔

کسی ایک کی نظر اس پہ پڑی، سرگوشی ہوئی، ایک سے دوسرے تک، نگاہیں اوپر اٹھیں، پورے کانفرنس روم میں ہلچل سی مچ گئی۔ فوراً کمریں سیدھی ہوئیں، فائلز ٹھیک کیں، لیپ ٹاپس کھل گئے، دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی اور انتظار ختم۔

وہ اندر آرہی تھی۔ گلاسز جو خوب صورت سی چین سے متصل تھے گریبان پہ اٹکے تھے اور دروازے سے سربراہی کرسی پہ بیٹھنے تک اس کا چہرہ سب کی نگاہوں کا مرکز رہا تھا۔

بیضوی چہرہ، سانولی رنگت، پُرکشش نقش، سیاہ زلفیں، چوبیس پچیس سال کی عمر...... وہ سربراہی کرسی پہ آبیٹھی اور بیگ میز پہ ایک طرف رکھا۔ یوں کرتے ہوئے اس کے کانوں میں پڑی چوڑی کے سائز کی سلور بالیاں واضح ہوئیں جو اس کے چہرے کو ایک عجب جاذبیت بخشتی تھیں۔ بیگ رکھ کر اس نے سر اٹھا کر سب کو دیکھا اور تب اس کی آنکھیں دکھائی دیں۔ لانبی سیاہ آنکھیں، جن میں باہر آسمان کی سی شفافیت تھی، بادلوں کا سا مبہم سحر تھا اور پہاڑوں کی کھائی جتنی گہرائی تھی۔

اوران آنکھوں میں کچھ اور بھی تھا...... شاید عجب خالی پن اور ویرانی...... امید اور خوشی کا یکسر ناپید ہونا۔

''گڈ مارننگ ایوری ون!'' اس نے بنا کسی مسکراہٹ کے سب کو مخاطب کیا۔ جواب میں ہلکی سی بھنبھناہٹ ہوئی، سر اثبات میں ہلے۔

''تنویر صاحب! جیسا کہ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو آج آڈٹ کے متعلق بریف کرنا تھا۔'' وہ دائیں ہاتھ بیٹھے صاحب کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''کیا آپ تیار ہیں، ہم شروع کریں؟''

''یس میم!'' وہ صاحب سر ہلا کر کھڑے ہوئے۔ ان کے ''میم'' کہنے کے انداز میں لاشعوری سی بے آرامی تھی، وہی جو اس کے گڈ مارننگ کے جواب میں وہاں موجود ہر شخص کے انداز میں تھی۔ عزت بھی تھی، احترام بھی تھا، تابعداری کا عہد بھی اور تعاون کی یقین دہانی بھی۔ مگر ایک ذرا سی بے آرامی، جیسے ابھی تک یقین نہ آیا ہو کہ وہ اس کی عزت، احترام، تابعداری اور تعاون پہ راضی ہوگئے ہوں۔

مگر یہ زندگی کے بہت سے دوسرے جذبوں کی طرح محض ایک اَن کہا سا تاثر ہی تھا۔ پانی کے بلبلے کی طرح ذرا دیر کو فضا میں اُڑا۔ مگر اپنی شفافیت کے باعث محسوس ہوئے بنا ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ بات ہی ختم۔

تنویر صاحب نے کونے کی کرسی پر بیٹھی سیکرٹری کو اشارہ کیا، جس نے فوراً سر ہلاتے ہوئے لیپ ٹاپ پہ چند بٹن دبائے۔ پروجیکٹر پہ پریزنٹیشن چلنے لگی۔ میٹنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

تنویر صاحب ہاتھ ہلاتے ہوئے بریفنگ دے رہے تھے، اپنے تجربے، علم اور رائے کو باہم یکساں کر کے بیان کر رہے تھے اور وہ انہی کو دیکھتی، توجہ سے سن رہی تھی۔

اور اس وقت اس کی توجہ ہرگز' ہرگز بھی شیشے کے دروازے کے پار راہداری کی طرف نہیں تھی۔

راہدری میں اس پل کوئی آتا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ گرے ٹو پیس میں ملبوس، لمبا چوڑا، خوش شکل سا اٹھائیس' انتیس برس کا مرد تھا جس نے ہاتھ میں ایک فائل فولڈر پکڑ رکھا تھا۔ وہ کانفرنس روم سے ذرا دور، سیکرٹری کی ٹیبل کے ساتھ رکا، پھر متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا، چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور ایسے کرتے ہوئے اس کی پُرکشش بھوری آنکھیں سکڑ گئیں پھر کسی نتیجے پہ پہنچ کر اس نے اسی ٹیبل کی کرسی کھینچی۔ اس کے انداز میں اعتماد اور آنکھوں میں عجیب سا عزم تھا۔

بیٹھتے ساتھ ہی اس نے پہلے سامنے بنے ایک آفس کی گلاس وال کے پار دیکھا۔ اندر کوئی نظر نہ آیا پھر گردن موڑ کر کانفرنس روم کو دیکھا......

اور سربراہی کرسی پہ بیٹھی لڑکی پہ نظر پڑتے ہی اس کا سارا وجود رک گیا۔

''پارس......!''

☆☆☆

وہ جس جگہ بیٹھا تھا، یہاں سے شیشے کے دروازے کے پار جاری کانفرنس صاف دکھائی دیتی، البتہ ساؤنڈ پروف گلاس کی وجہ سے آواز نہ پہنچتی۔

سربراہی کرسی پر براجمان لڑکی کا اِدھر سے نیم رخ نظر آرہا تھا، دائیں آنکھ، دایاں گال، دائیں کان میں پڑی بالی، دائیں طرف کے بال۔ وہ تنویر صاحب کی طرف پوری یکسوئی سے متوجہ تھی۔

''پارس!'' وہ بے اختیار بڑبڑایا۔ پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کسی کے سن لینے سے ڈرتا ہو مگر وہ اکیلا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون واپس آیا۔

اس نے ، اس دفعہ قدرے اعتماد کے ساتھ، دوبارہ نگاہوں کا رخ اس لڑکی کی جانب کیا۔ منظر ویسا ہی تھا۔

مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے شیشے کے دروازے پر کسی ٹی وی اسکرین کی طرح ایک اور منظر چلنے لگا۔

آٹھ ماہ قبل کا منظر......

وہ ایک اپارٹمنٹ کا لونگ روم تھا، جس کی اونچی فرنچ ونڈوز سے باہر رات اور روشنی میں ڈوبی بلند عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ امریکا کی کسی ریاست کا اپارٹمنٹ لگتا تھا۔ لونگ روم کے وسط میں وہ خود، جینز اور سوئٹر میں ملبوس ایک ہاتھ میں نوڈلز سے بھری پلیٹ اور دوسرے میں موبائل پکڑے چلتا آیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے فون میں بولا۔

''خیریت...... بھائی جی؟ ایسی کیا بات ہے جسے بتانے کے لیے آپ اتنی لمبی تمہید باندھ رہے ہیں؟'' بولتے ہوئے اس کے چہرے پر تجسس بھرا اچنبھا تھا۔

جواب میں موبائل کے اسپیکر سے آواز گونجی ...... بھاری مردانہ آواز۔

''نامعلوم تمہیں سن کر کیسا لگے فیضی۔''

''آپ بتائیں تو سہی......!'' موبائل میز پر رکھ کر اب وہ کانٹے میں نوڈلز لپیٹ رہا تھا۔

''میں نے شادی کرلی ہے۔''

نوڈلز لپیٹتا اس کا ہاتھ ٹھہر گیا اس نے سر اٹھایا، چہرے کے تاثرات بلینک ہوگئے جیسے سمجھ نہ آیا ہو، پہلے حیرت پھر خاموشی پھر ہچکچاہٹ......

''جی؟ آ......ویل ......مبارک ہو مگر اتنے اچانک...... میں آجاتا پہلی فلائٹ سے......'' اب کے اس کی آنکھوں میں گلہ اترا۔

''نہیں، میں ابھی پارس کو اپنے خاندان سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے خود ہی کسی کو نہیں بلایا۔''

''پارس......؟'' اس نے دُہرایا۔

''میری بیوی......ہم نے ایک ماہ قبل شادی کی ہے، یہیں مری میں۔''

''اوہ، آپ ابھی تک مری میں ہیں؟'' وہ چونکا۔ ''ابھی ڈیڑھ ماہ پہلے آپ مری گئے تھے، برفباری دیکھنے اور مری والے ہوٹل کا وزٹ کرنے، میں سمجھا تھا کہ آپ واپس لاہور آگئے ہیں۔''

''نہیں فیضان، میں واپس نہیں آیا، مجھے یہاں کی آب و ہوا راس آگئی ہے۔''

اس نے نوڈلز کی پلیٹ رکھ دی۔ چہرے کے تاثرات عجیب تھے جیسے پریشان ہو، خفا ہو مگر ظاہر نہ کرنے کی کوشش کررہا ہو۔

''جیسا کہ میں نے بتایا فیضی، میں پارس کو اپنے خاندان سے دور رکھنا چاہتا تھا، اسی لیے میں تمہیں بتا نہیں سکا۔''

''مگر کیوں بھائی جی؟''

''دیکھو جب ایک چوبیس سال کی ہوٹل ریسپشنسٹ' اڑتالیس برس کے ہوٹل مالک سے شادی کرتی ہے تو لوگ ان کے رشتے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بالخصوص جب شادی سے قبل انہیں ایک دوسرے کو جانے محض پندرہ دن ہی ہوئے ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو رکے۔ ''میں اس پر شک نہیں کرتا مگر خاندان والے، تم، سویرا (بہن) تم لوگ اس کو اتنی جلدی قبول نہیں کروگے۔ اس لیے میں پہلے اس رشتے کو وقت دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد میں اپنے خاندان کو پارس سے اور پارس کو اپنے خاندان والوں سے متعارف کروادوں گا۔ تب تک وہ مری والے گھر میں ہی رہے گی، کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟'' وہ خاموشی سے لب کاٹ رہا تھا۔

منظر تحلیل ہوا۔ یادیں دھندلی ہوگئیں۔ حال واپس اردگرد آن ٹھہرا۔

شیشے کے دروازے کے پار کانفرنس روم میں میٹنگ ہنوز جاری تھی۔ سیاہ بالوں والی لڑکی اسی

طرح بیٹھی تنویر صاحب کو سن رہی تھی۔

اس نے سر جھٹک کر رخ پھیرا۔ سامنے سیکرٹری کی خالی نشست تھی جس پر کمر کے آرام کے لیے نیلی گدی رکھی تھی۔ وہ گدی کے نیلے فیبرک کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے ہی گزرے کہ حال پھر سے ماضی میں گم ہونے لگا۔ گدی کا نیلا کپڑا نیلگوں آسمان میں تبدیل ہوتا گیا۔

شام کا آسمان......لمبی سڑک، کنارے پر گھنے اونچے، درخت۔ وہ دور سے بھاگتا آرہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، پسینے میں تر، کانوں میں ہینڈ فری لگائے، چہرے پر دبا دبا غصہ تھا، وہ جیسے خفگی سے فون میں کچھ بول رہا تھا۔ بولتے بولتے اب اس کی رفتار آہستہ ہوگئی تھی۔ جب وہ مزید قریب آیا تو تیز سانسوں کے درمیان الفاظ واضح ہوئے۔

''بھائی جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ابھی آپ کی شادی کو ڈیڑھ ماہ ہوا ہے اور آپ نے مری والا ہوٹل اس کے نام کردیا؟''

''اُن کے نام، فیضی۔'' انہوں نے سختی سے ٹوکا۔

اس کے چہرے پہ برہمی در آئی۔ بہرحال وہ بولا۔

''سوری...... مگر 'ان' کے نام اتنی جلدی کیوں پورا ہوٹل لگا دیا؟ آپ تو کہہ رہے تھے کہ اس رشتے کو وقت دیں گے؟''

''وہ میں دے رہا ہوں مگر مری والا ہوٹل اس کے حق مہر میں لکھوایا گیا تھا فیضی۔''

''واٹ؟'' وہ اپنے قدموں پہ رک گیا۔ چہرے پر بے یقینی در آئی۔ ''انہوں نے حق مہر میں آپ کا اربوں کی مالیت کا سکس اسٹار ہوٹل مانگ لیا؟''

''اس نے نہیں مانگا تھا، اس کی والدہ نے کہا تھا اور دیکھا جائے تو یہ مطالبہ حق بجانب تھا۔ میں پورے ملک میں آدھ درجن ہوٹلز کا مالک ہوں، ان میں سے ایک ہوٹل اگر وہ اس سکیورٹی کے تحت مانگتی ہیں کہ یہ امیر بڈھا چھٹیاں ختم ہوتے ہی ان کی بیٹی کو چھوڑ کر یعنی اس کی زندگی برباد کرکے کہیں نہیں چلا جائے تو وہ غلط تو نہیں ہیں۔''

''مری والا ہوٹل آپ کے باقی تمام ہوٹلز کی کل مالیت سے بھی مہنگا ہے بھائی جی۔ آپ غلطی کررہے ہیں مگر آپ کو احساس نہیں ہے۔''

''اس کو جج مت کرو، وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔'' کانوں میں لگے ہینڈ فری سے گونجتی ان کی آواز تھکی تھکی تھی۔

''کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے آستین سے نم پیشانی رگڑی اور فون بند کردیا۔ پھر چند لمحے دبے دبے غصے سے فون کو دیکھتا رہا پھر فون بک سے ایک نمبر نکالا۔

''سویرا آپا، آسٹریلیا۔'' ڈائل کرکے فون کان سے لگایا اور پھر سے چلنے لگا۔

''سویرا آپا......کیا آپ یقین کریں گی رضوان بھائی نے کیا کیا؟'' وہ جھنجلایا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''انہوں نے مری والا ہوٹل اپنی بیوی کے نام کردیا۔ بھائی بہت سادہ ہیں، اس دفعہ تو حد ہی کردی. مگر میں جلد پاکستان جاؤں گا اور دیکھ لوں گا اس عورت کو۔'' وہ بات کرتے ہوئے اب دور جا رہا تھا۔ آواز مدھم ہوتی گئی...... نیلا آسمان نیلی گدی میں غائب ہوا۔

دروازہ کھلنے کی بار بار آتی آواز۔ وہ چونک کر حال میں پلٹا۔ میٹنگ برخاست ہوچکی تھی۔ تمام افراد یکے بعد دیگرے باہر نکل رہے تھے۔ وہ البتہ ویسے ہی ساکت اندر بیٹھی تھی جیسے کوئی مجسمہ ہو۔

وہ وہیں بیٹھا پارس کو دیکھتا رہا۔ کچھ تھا اس عورت میں......سحر......طلسم۔ بار بار نگاہ اس کی طرف اٹھتی تھی۔ اس کی نگاہیں بھی بار بار اٹھیں اور پھر پارس کی بالی سے الجھ گئیں۔

سلور بالی کے گول دائرے کے اندر یادوں کا رنگ پھر سے بھرنے لگا۔

اس کے اپارٹمنٹ کا بیڈروم، بیڈ پہ کھلا بیگ اور

وہ ساتھ کھڑا کپڑے تہ کر کے اندر رکھ رہا تھا۔ دفعتاً سائڈ ٹیبل پر دھرے فون کی اسکرین جلنے بجھنے لگی۔

''بھائی جی۔'' اس کے چہرے پر ہیجان نمودار ہوا۔ قدرے متذبذب انداز میں فیضان نے فون اٹھالیا۔

''جی، بھائی جی۔'' وہ فون کان سے لگائے ان کی باتوں کے جوابات دینے لگا۔

''بس ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟''

''نہیں کچھ خاص نہیں، روٹین، جاب، بس......''

''نہیں، پاکستان آنے کا ابھی تو پروگرام نہیں۔'' الفاظ ذرا اٹکے، نگاہ ترچھی کر کے سائڈ ٹیبل پر ڈالی۔ پاسپورٹ، کل کی تاریخ کا پاکستان کا ٹکٹ۔ اس نے نگاہ چرالی۔

''جی، میں نے سویرا آپا کو پچھلے ہفتے کہا تھا کہ آؤں گا مگر ابھی ارادہ بدل گیا ہے۔'' جسم راکھ ہو کر ہوا میں بہتا گیا۔ سلور بالی کے درمیان بھرے رنگ پارس کے بالوں میں مل کر سیاہ ہو گئے، وہ پھر سے چونکا۔

وہ باہر آرہی تھی۔ فیضان تیزی سے سیدھا ہوا، پھر اسے آتے دیکھ کر اپنے پتھریلے تاثرات میں زبردستی بشاشت پیدا کی۔

''مسز پارس!'' وہ اپنے آفس کی سمت جارہی تھی، آواز پہ پلٹی۔ سیاہ آنکھوں میں اجنبیت اور استفسار در آیا۔

''جی۔''

''میں...... آپ نے مجھے پہچانا؟'' سوال کرتے ہوئے فیضان کا سارا جسم تن گیا۔ خوفزدہ، پریشان، مضطرب ......وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فیضان جواب کی تلاش اس کی آنکھوں میں کر رہا تھا۔ ان میں دیکھتے ہوئے بھی سارے وجود پہ سحر سا چھانے لگتا تھا۔

''سوری، کیا ہم مل چکے ہیں؟'' پارس کی سیاہ آنکھوں میں اچنبھا ابھرا، انجان پن...... معذرت سے سر نفی میں ہلایا۔

''میں فائز ہوں۔'' اس نے دانستہ وقفہ دیا۔

''سوری آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟'' فیضان کے تنے تاثرات ریلیکس ہوئے، اطمینان، سکون۔

''آپ نے فنانشل ایڈوائزر کے لیے ایڈ دیا تھا۔ اسی سلسلے میں غالباً آپ کی سیکرٹری سے بات ہوئی تھی، مجھے گمان گزرا کہ وہ آپ تھیں، میں معذرت خواہ ہوں۔''

''اٹس او کے، انٹرویو ٹائم دس بجے ہے، آپ جلدی آگئے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے وال کلاک پہ نظر ڈالی......ابھی سوا نو ہوئے تھے۔

''شاید مجھے اس جاب کی باقی تمام امیدواروں سے زیادہ جلدی اور ضرورت ہے۔'' وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اندر آجائیں۔'' وہ مڑ کر اپنے آفس میں چلی گئی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی۔ وہ اس کے پیچھے آیا۔

جب پارس اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھی تو وہ بھی سامنے بیٹھا اور تب اس نے دیکھا۔ پارس کے بائیں ہاتھ پر میز پر رکھے ایک فریم میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تصویر لگی تھی۔ کھچڑی بال، معمولی صورت، سیاہ سفید مونچھیں، مہربان مسکراہٹ......فائز کے چہرے پر تکلیف سی ابھری مگر اگلے ہی پل اس کی جگہ مصنوعی مسکراہٹ نے لے لی۔

''آپ کے کریڈینشلز تو متاثر کُن ہیں۔'' وہ اب اس کی فائل کے صفحے پلٹتی کہہ رہی تھی۔ فائز اب کے قدرتی پن سے مسکرایا۔ لمحے بھر کو اس کے ذہن کے پردوں پر ایک منظر ابھرا۔

وہ درمیانی عمر کا ایک آدمی اس نیم تاریک کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اس کاغذ کو پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے کاؤنٹر کے اس طرف فائز کسی اونچے اسٹول پر بیٹھا تھا۔

''مجھے یہ تمام کاغذات جلد از جلد چاہئیں۔ ڈگریاں سرٹیفکٹ، سب۔'' آدمی نے فہرست پڑھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہوں......ہو جائے گا مگر پیسے لگیں گے۔''

''پیسوں کی فکر مت کرو، بس کام پکا ہونا چاہیے۔''

''اتنا پکا ہوگا کہ تم ان پر ایکشن بھی لڑ سکو گے۔'' وہ چہرہ اٹھا کر بھونڈے انداز سے ہنسا۔ فیضان حیات سنجیدہ رہا۔ آدمی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''کس نام سے بنوانا ہے؟''

''غور سے پڑھو......اوپر لکھا ہے فائز حسن۔''

''فائز!'' اس نے دُہرایا۔

''فیضان سے فیض......اور وہاں گورے فیض کو فائز بنا دیتے ہیں۔'' وہ وضاحت دے رہا تھا۔

منظر تحلیل ہو کر فضا میں بکھر گیا۔ پارس اب اس کی فائل بند کر رہی تھی۔ اس نے خود کو کمپوز کر لیا۔

''تو فائز صاحب، آپ آسٹریلیا سے اِدھر کیوں آئے؟'' اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے سنجیدگی سے فائز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میم میرے فادر کی کافی عرصہ پہلے ڈیتھ ہو گئی تھی۔ میں سب سے بڑا ہوں، چھوٹی چار بہنیں ہیں، ان کی پڑھائی، جہیز، شادی سب مجھے ہی کرنا ہے۔ آسٹریلیا میں رہ کر میں زیادہ کما سکتا تھا مگر امی اور بہنیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہتیں، ان کا کہنا ہے کہ بھلے کوئی کم آمدنی جاب ہی کرلوں مگر یہیں کروں، اسی لیے میں واپس آگیا۔''

پارس کی آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت ابھری، وہ مسکرائی نہیں مگر اس نے ستائشی انداز میں ابرو ضرور اٹھائی تھی۔

''اچھا......تو اب لاہور سے اتنی دور مری؟''

''آسٹریلیا سے تو قریب ہی پڑتا ہے ناں مری۔'' وہ مسکرایا۔ پارس نے بنا کسی تاثر کے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ اس جاب کی نوعیت سے واقف ہیں،

فائز صاحب......؟ آپ جانتے ہیں میں نے یہ ہوٹل حال ہی میں سنبھالا ہے، اس لیے مجھے کسی قابلِ اعتماد اور ذہین انسان کی ضرورت ہے جو میرے فنانشل ایڈوائزر اور اسسٹنٹ کے طور پر کام کر سکے۔''

''میں اس کام لیے خود کو اہل سمجھتا ہوں۔''

''او کے، دیگر انٹرویوز کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ ہمیں کس کو رکھنا ہے، آپ کو نتائج سے مطلع کر دیا جائے گا۔'' اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ یہ انٹرویو ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ وہ کھڑا ہوا پھر جیسے متذبذب سا رکا۔

''یہ...... آپ کے ہزبینڈ رضوان حیات کی تصویر ہے ناں؟'' پارس نے اشارے کی سمت دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چبھن سی اتری۔

''جی۔'' وہ بولی تو آواز ہلکی تھی۔

''ابھی باہر مجھے علم ہوا کہ چھ ماہ قبل ہی رضوان صاحب کی ڈیتھ ہوئی ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ یہ جان کر اور بھی زیادہ کہ اس وقت آپ کی شادی کو صرف دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا۔'' اس نے تاسف سے سر جھکا۔

پارس نے ہلکے سے اثبات کے ساتھ تعزیت وصول کی۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب آگیا تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کا انتقال کیسے ہوا؟'' اس کا لہجہ اب بھی متاسف تھا مگر پارس کو غور سے دیکھتی آنکھوں میں پتھراہٹ سی تھی۔ پارس کی نگاہوں کا مرکز اب بھی وہی سیاہ فوٹو فریم تھا۔

''وہ...... سیڑھیوں سے...... گر گئے تھے......''

اس نے تین حصوں میں فقرہ ادا کیا پھر نگاہیں اٹھا کر فائز کو دیکھا۔

وہ سمجھ کر افسوس سے سر ہلاتا چلا گیا تھا۔ وہ پھر سے فوٹو فریم کو دیکھنے لگی۔ اس کے سارے وجود میں اضطراب و بے چینی سی نظر آنے لگی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ فریم سے نظر ہٹائی تو امیدوار فائز

آفس کے باہر کھڑا تنویر صاحب سے بات کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے پیچھے شیشے کے دروازے بند کر گیا تھا۔ آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پارس نے سر جھٹک کر ایک فائل کھول لی۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی پارس کے آفس سے نکلا، سامنے سے آتے تنویر صاحب اسے دیکھ کر ٹھٹکے، رکے پھر حیرت سے اس کی طرف آئے۔ وہ ذرا سا مسکرایا پھر پلٹ کر دیکھا۔ پارس ویسے ہی ٹکٹکی باندھے فوٹو فریم کو دیکھ رہی تھی۔

''فیضی......تم امریکا سے کب آئے؟'' ساتھ ہی انہوں نے پارس کی سمت دیکھا۔ وہ اب مطالعے کے لیے کوئی فائل کھول رہی تھی۔

''آہستہ تنویر بھائی، یہاں مجھے فائز حسن کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اسی نام سے پکارا جائے گا، جب میں میڈم پارس کا فنانشل ایڈوائزر بھرتی کر لیا جاؤں گا۔''

''کیا مطلب یعنی تم......؟'' ان کی آنکھوں میں پریشانی اتری...... پھر سے پارس کو دیکھا۔ وہ متوجہ نہیں تھی۔

''میرے آفس میں آؤ۔'' دھیمی سرگوشی میں کہہ کر وہ مڑ گئے۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کے پیچھے ہولیا۔

چند منٹ بعد وہ تنویر صاحب کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا انداز پُرسکون تھا جبکہ تنویر صاحب فکرمند دکھائی دے رہے تھے۔

''مجھے شروع سے بتاؤ، سارا معاملہ کیا ہے؟''

''سمپل......! میں بھائی جی کی موت کا سراغ لگانے آیا ہوں۔'' اس کی بات پر تنویر صاحب کے چہرے پر تذبذب ابھرا۔

''تم جانتے ہو اُن کی موت کیسے ہوئی تھی!''

''آپ بتائیے، کیسے ہوئی تھی؟''

''وہ سیڑھیوں سے گرے تھے۔''

''کیا واقعی، تنویر بھائی؟'' اس کا انداز سرد سا تھا۔

''فیضی......''

''یہ سیڑھیوں والی بات تو پارس نے سب کو بتائی ہے مگر میرے لیے زیادہ اہم وہ بات ہے جو آپ نے مجھے ان کی وفات کے بعد امریکا فون کر کے بتائی تھی۔''

''وہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے اور......''

''وہ آپ کا وہم نہیں تھا۔ آپ بہت کلیئر تھے اس بارے میں کہ جب بھائی جی کو غسل دیا گیا تو آپ نے واضح طور پر ان کے سر کے پچھلے حصے میں کسی نوکیلی چیز کے کھب جانے کا نشان دیکھا تھا۔''

''میں اب بھی کلیئر ہوں۔'' وہ جلدی سے بولے۔ ''اور یہی وہ زخم تھا جو انہیں سیڑھیوں سے گرنے پہ آیا۔ جس کی وجہ سے اُن کا انتقال ہوا۔''

''بجا فرمایا آپ نے مگر یاد کریں، آپ ہی نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت سیڑھیوں پر یا ان کے دامن میں کوئی ایسی نوکیلی چیز نہیں تھی جس کے اوپر گرنے سے اس طرح کی چوٹ آتی۔''

''ایسا ہی تھا۔'' انہوں نے ہار تسلیم کر لی۔

''میں اپنی کہی ساری باتوں پر قائم ہوں، تم سے بحث کر کے میرا مقصد تمہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روکنا تھا فیضی مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن نے کبھی اس ظاہری حادثے کو قبول نہیں کیا۔''

''نہ ہی میں اسے قبول کر سکا ہوں۔'' اس کے چہرے پر کرب اتر آیا۔ چند ثانیے کو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

''تم جنازہ بھی نہیں پڑھ سکے، کاش میرا تم سے جلدی رابطہ ہو جاتا۔ پارس نے بس تھوڑا بہت اور انتظار کیا پھر تدفین کروا دی۔ سویرا کی فلائٹ کا مسئلہ تھا، وہ بھی نہیں آسکی...... اور تم سے تو بات ہی تیسرے دن ہو پائی۔'' وہ افسوس سے یاد کر کے

رہے تھے۔

''اور اس سے زیادہ دردناک بات کیا ہو گی تنویر بھائی کہ بھائی جی کے انتقال والے دن میں پاکستان میں ہی تھا اور تین دن بعد ہر شے سے بے خبر جب واپس پہنچا تو آپ کے میسجز دیکھے۔''

تنویر صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تم تب پاکستان میں تھے؟ تو کیا تم رضوان سے ملے تھے، تم کہاں تھے؟ آخری دفعہ کب بات ہوئی تھی تمہاری اُن سے؟'' وہ بے اختیار آگے کو ہوئے۔ چہرے پر پریشانی، تجسس، حیرت سب واضح تھا۔

''امریکا میں آخری بات چار دسمبر کی رات کو ہوئی تھی جب میں پاکستان آنے کے لیے پیکنگ کر رہا تھا۔ ان کا فون آیا تھا مگر میں نے انہیں اپنی آمد کا نہیں بتایا۔ اس سے ٹھیک چار دن بعد میں اِدھر پہنچ چکا تھا۔ یہ وہی دن تھا جس رات بھائی جی کی ڈیتھ ہوئی تھی۔'' وہ بول رہا تھا اور آنکھوں میں کرچیاں سی چبھ رہی تھیں۔ ''میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ میں ان سے ملنے سے پہلے پارس میڈم کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔''

تنویر صاحب سانس روکے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ میز پر رکھے پیپر ویٹ کو دیکھتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

''پہلے دو دن میں نے پارس کے بارے میں تحقیق کی، مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک عام، غریب سی لڑکی تھی جس کی گویا لاٹری نکل آئی تھی اور کچھ نہیں جان سکا پھر اسی دوپہر میں بھائی جی سے ملنے چلا آیا۔'' کہتے ہوئے اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ یہ کھڑکی چھوٹی تھی مگر اس سے بھی ہوٹل کا عقبی حصہ اور سیاہ گیٹ دکھائی دیتا تھا۔

''اُدھر اسی گیٹ پر کھڑے ہوئے میں نے دیکھا تھا، ان دونوں کو......'' کہتے ہوئے اس نے لمحے بھر کو آنکھیں موندیں۔ بند پلکوں کے پار ایک یاد جھلملانے لگی۔

ہوٹل کے عقبی گیٹ کے آس پاس پہاڑیوں اور سڑک پر برف جمی تھی۔ ہر سو سفیدی تھی۔ وہ گیٹ کے پیچھے کھڑا گردن اٹھائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوئٹر کے اوپر جیکٹ اور سر پر اونی ٹوپی لے رکھی تھی۔ اوپر دکھائی دیتا منظر دیکھ کر آنکھوں میں عجیب دکھ اور بے بسی سی آگئی تھی۔

اوپر شیشے کی دیوار کے پار کانفرنس روم نمایاں تھا۔ ایک کرسی پر سیاہ بالوں والی لڑکی بیٹھی تھی اور سامنے بھائی جی۔ لڑکی سر جھکائے مسلسل روتے ہوئے بار بار نفی میں سر ہلا رہی تھی اور بھائی جی جیسے اُسے چپ کروانے، بہلانے کی سعی کر رہے تھے۔

فیضی کے ابرو تن گئے۔ آنکھوں میں خفگی جھلکی۔ اس نے یخ بستہ ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کیا اور موبائل نکالا۔ امریکا کا نمبر رومنگ پر تھا۔ بھائی جی کو کال ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ گھنٹی جا رہی تھی بھائی جی نے گھنٹی سنی تو بات روکی، ذرا اکتا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ فون اٹھایا نمبر پر نگاہ ڈالی اور فون کان سے لگایا۔

''ہیلو فیضی!'' انداز مصروف تھا۔

پارس ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی جیسے جانے لگی ہو۔ جیسے بھائی جی کے منہ سے فیضان کا نام سن کر جانے لگی ہو۔ بھائی جی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جیسے روکا۔

''بھائی جی، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

''میں بعد میں بات کرتا ہوں تم سے، ابھی میں مصروف ہوں۔''

''بھائی جی میری بات آپ کی مصروفیت سے زیادہ ضروری ہے۔'' وہ دبے دبے اشتعال سے بولا۔ اوپر جمی نگاہوں میں تپش در آئی تھی۔

''کہا ناں فیضی بعد میں بات کرتے ہیں۔'' انہوں نے عجلت میں فون بند کیا اور پارس کو واپس بٹھایا۔

وہ ساکت ہوا ہاتھ میں فون پکڑے کھڑا رہ گیا پھر چند لمحے گزرے تو وہ ایک دم مڑا اور پیچھے کھڑی سفید کار کی طرف بڑھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ تنویر صاحب دلجمعی سے سن رہے تھے۔

''اس رات دیر تک میں انہی سڑکوں پر ڈرائیو کرتا رہا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ غصہ، بے بسی، احساسِ محرومی، پارس سے نفرت، میں نے ہر شے اپنے اندر محسوس کی تھی۔ وہ ایک اداکارہ تھی جو مصنوعی آنسو بہا کر بھائی جی کو اپنے سامنے باندھے بیٹھی تھی اور اس کے لیے بھائی جی نے مجھے دھتکارا۔''

''دیکھو انہوں نے تمہیں دھتکارا نہیں تھا صرف بعد میں بات کرنے کا کہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اہم مسئلے میں پھنسے ہوں۔''

''بات رویے کی نہیں اس سیاق و سباق کی ہے جس میں، میں نے وہ منظر دیکھا۔ صرف پارس کی وجہ سے میں ان سے نہیں مل سکا۔ اس دن انہوں نے دو تین بار مجھے کال کی، میں نے فون ہی آف کر دیا۔ بس پاگلوں کی طرح ڈرائیو کرتا رہا۔ اس رات میں ہوش میں نہیں تھا۔ دل کرتا تھا کسی پہاڑ سے گاڑی دے ماروں۔ ایسا تو نہ تھا میں مگر ...... پھر رات میں، میں اسلام آباد چلا گیا۔ فون آف رکھا۔ سب سے دور ہوٹل میں لیٹا رہا۔ اگلے دن فلائٹ تھی۔ تیسرے روز جب امریکا پہنچا تو گھر کے فون پر آپ سب کے پیغامات سنے مگر تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔'' اس کی آنکھیں شدتِ ضبط سے سرخ پڑ رہی تھیں۔ چہرے پر نفرت کی پتھراہٹ تھی۔

چند لمحے مزید سرکے۔ آفس میں چھایا تناؤ اب ڈھل کر ترحم و ہمدردی میں بدلنے لگا۔ تنویر صاحب کی پریشانی گم ہوئی، اب فقط فکرمندی رہ گئی۔

''اب تم نام بدل کر یہاں کیوں آئے ہو؟''

''پہلے میں اپنے نام سے آنا چاہتا تھا، بھائی جی کا بھائی بن کر، ان کی قبر دیکھنے مگر پھر رک گیا۔ یہ خیال کہ مجھے یہاں آپ کے اور افضل بابا کے سوا کوئی نہیں جانتا...... مجھے ایک دوسری نہج پر سوچنے پر مجبور کر گیا۔ اب اسی لیے میں فائز حسن کے روپ میں بھائی جی کے قتل کا سراغ لگانے یہاں موجود ہوں۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' تنویر صاحب قدرے توقف سے بولے۔

''سامنے کی بات ہے، بھائی جی کو قتل کیا گیا ہے اور یہ کام پارس کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔'' کمرے میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

''فیضی...... فائز...... یہ بہت بڑا الزام ہے۔''

وہ متذبذب تھے۔

''یہ حقیقت ہے اور ایک دن میں پارس کے خلاف تمام ثبوت اکٹھے کر کے اس کو اقرارِ جرم کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ آپ دیکھیے گا۔'' چند ثانیے پہلے کی تکلیف اب اس کے لہجے سے غائب تھی۔ اس کی جگہ سرد مہری، چبھن اور حد درجہ اعتماد نے لے لی تھی۔

''اور اگر اس نے تمہیں پہچان لیا؟''

''وہ مجھے نہیں پہچانتی، بے فکر رہیے۔ وہ مجھ سے کبھی نہیں ملی اور نہ ہی میری شکل بھائی جی سے ملتی ہے جو وہ پہچان جائے۔ تصاویر کا ویسے بھی مجھے شوق نہیں اور جو میری پرانی تصاویر فیملی البمز میں ہیں وہ سب لاہور میں پڑے ہیں۔ بھائی جی ایک دو دن کے لیے یہاں دورے پر آئے تھے بس اچانک سے شادی کی اور یہیں رہنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ یہاں کچھ ایسا نہیں لائے تھے جس میں میری تصویریں ہوں، نہ وہ کبھی پارس کو لاہور لے کر گئے۔ افضل بابا نے خود یہ بات کہی ہے کہ پارس نے رضوان حیات کے بھائی کو کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔

''ابھی جب میں اس سے ملا تو بھی اس کے چہرے پر شناسائی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ اچھی اداکارہ نہیں ہے۔ بھائی جی کا ذکر کیا تو اس کے تاثرات فوراً بدلے اگر وہ مجھے پہچانتی ہوتی تو اس کے تاثرات

زیادہ تیزی سے بدلنے چاہیے تھے۔'' وہ پُرسکون تھا مگر تنویر صاحب کی فکرمندی ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔

''اور اگر وہ تمہیں پہچان گئی تو؟''

''قتل اس نے کیا ہے، ڈرنا اسے چاہیے۔ میں کس بات سے ڈروں؟'' تنویر صاحب لاجواب ہوگئے۔

''فیضی...... نہیں فائز...... تم جذباتی تو ہو مگر اس کے باوجود تم نے کبھی کوئی احمقانہ حرکت نہیں کی۔ میں تمہیں عرصے سے جانتا ہوں اس لیے میری تم سے بس ایک درخواست ہے کہ پلیز جو بھی کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ واقعی یہ ایک حادثہ ہو۔''

''وہ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔'' وہ پُرعزم و ٹھوس انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تنویر صاحب کی فکر ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہوٹل کے عقبی حصے پر شام ڈھل رہی تھی۔ سرسبز پہاڑیاں، گہری کھائی، ویران مگر خوب صورت علاقہ...... وہ ہر شے سے بے نیاز صبح کے انداز میں چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلی۔ بس فرق یہ تھا کہ صبح گلاسز آنکھوں پر تھے تو اب گریبان پہ اٹکے تھے۔

ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ چند قدم آگے آئی پھر رک گئی۔ اس کی کار سے ذرا دور ایک چھوٹی، پرانے ماڈل کی کار کا بونٹ کھولے صبح والا امیدوار پریشان سا کھڑا تھا۔ کبھی کبھار کوئی تار چھیڑتا پھر فکرمندی سے سیدھا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا۔

پارس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا پھر اپنے منتظر کھڑے ڈرائیور کو...... ذرا سا تذبذب اس کی خوب صورت آنکھوں میں ابھرا پھر وہ آگے آئی، کار میں بیٹھی۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا تو اس نے اسے روکا۔

''فرید خان!'' ساتھ ہی اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔

''جی میڈم۔'' وہ مؤدب سا پلٹا۔

''وہ پیچھے جو صاحب کھڑے ہیں ان سے پوچھو کہ کیا مسئلہ ہوا ہے ان کی کار کے ساتھ اور دیکھو اگر تم ان کی مدد کرسکتے ہو تو میں انتظار کرلوں گی۔''

''جی میڈم۔'' وہ فوراً فائز کی طرف گیا۔ پارس نے گردن نہیں موڑی۔ محض ڈرائیونگ سیٹ کے ڈور

پر لگے بیک ویو مرر میں دیکھا۔

ڈرائیور فرید خان اب فائز حسن کے پاس کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ دونوں میں چند فقروں کا تبادلہ ہوا۔ فائز نے اس کی کسی بات پر چونک کر کار کی طرف دیکھا۔ چہرے پر شرمندگی اتری، وہ تیزی سے اس طرف آیا۔

”سوری میڈم، آپ کو میری وجہ سے زحمت کرنی پڑی۔“ وہ تشکر و احسان مندی سے کار سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے کہنے لگا۔ پارس کے تاثرات ویسے ہی سنجیدہ رہے۔

”کیا آپ کی کار خراب ہے؟“

”جی، پتا نہیں ایک دم سے کیا ہوگیا ہے۔ پرانی چیز کے تو ویسے بھی سو مسائل ہوتے ہیں۔“

”یہاں قریب میں کوئی ورکشاپ نہیں ہے، آپ کو مین سٹی جانا پڑے گا۔ آپ کار اِدھر لاک کردیں۔ فرید خان آپ کو شہر لے جائے گا۔“ فائز کے چہرے پر مزید شرمندگی ابھری۔

”میم...... آپ...... تھینک یو سو مچ مگر ابھی تو ڈرائیور کو آپ کو چھوڑنا ہوگا، میں کوئی دوسری کنوینس دیکھ لیتا ہوں۔“

”یہاں آپ کو پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ملے گی۔ آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ آجائیں۔ مجھے گھر ڈراپ کرکے فرید خان آپ کو لے جائے گا۔“ اس کا انداز بے تاثر تھا جیسے یہ آفر کا آخری حصہ ہو۔ اگر اب وہ انکار کرے گا تو وہ جیسے آپ کی مرضی کہہ کر آگے بڑھ جائے گی۔

”بہت شکریہ میم، میں کار لاک کرکے آتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ فرید خان کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اور پارس پچھلی سیٹ پر براجمان باہر دیکھ رہی تھی۔ کار خاموشی سے اونچے نیچے رستوں پر محوِ سفر تھی۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا فائز وقفے وقفے سے ایک نظر بیک ویو مرر پر ڈالتا جو یوں سیٹ تھا کہ پارس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ رخ ذرا موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کہیں بہت دور ہو۔ ایک سڑک پر آگے مڑ کر فرید خان نے گاڑی آہستہ کردی۔

”میڈم، اندر لے جاؤں گھر تک یا آپ یہیں اتریں گی؟“ فائز نے بے اختیار ونڈ اسکرین کے پار دیکھا۔

طویل سڑک جو اونچی ہوتی جارہی تھی کے اختتام پر اونچائی پر بنا ایک خوب صورت مخروطی چھتوں والا بنگلا تھا۔ جہاں کار رکی تھی۔ وہاں سے بنگلے تک کافی فاصلہ تھا۔

پارس بنا کچھ کہے دروازہ کھول کر اتر گئی اور بنگلے کی طرف چلنے لگی۔ فائز نے بظاہر گھبرا کر فرید خان کو دیکھا۔

”آپ انہیں گھر تک چھوڑ آتے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی، میری وجہ سے......“

”میڈم ہمیشہ یہیں اترتی ہیں۔“

”مگر کیوں؟“ وہ حقیقتاً چونکا۔ فرید خان نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے بلند ہوتی سڑک کو دیکھتا رہا۔ جہاں پارس قدم قدم اوپر چڑھ رہی تھی۔ جب تک وہ بحفاظت گھر نہیں پہنچتی فرید خان وہاں سے ہٹتا نہیں تھا جب وہ اندر چلی جاتی تب وہ گاڑی گھر تک لے آتا۔

فائز کی نگاہیں بھی وہیں جمی تھیں۔ پارس کے اٹھتے قدم ویسے نہیں تھے جیسے ہوٹل میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت تھے۔ اس کی چال آہستہ تھی۔ شکست خوردہ کسی اور سوچ میں گم، دنیا سے دور...... دھیرے دھیرے چلتی اب آدھا راستہ عبور کرچکی تھی۔ کار میں بیٹھے دونوں افراد کی نگاہیں لمحے بھر کو بھی اس سے نہیں ہٹی تھیں۔ ایک کی فرض شناسی و وفاداری سے لبریز تھیں تو دوسرے کی گہری سوچ اور مستقبل کی منصوبہ بندی سے۔

دفعتاً پارس رکی، سڑک کے درمیان میں کھڑی اس کی ان کی جانب پشت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ گہری کھائی اور دائیں ہاتھ پہاڑ تھا۔ وہ آگے جانے کے بجائے دائیں طرف کو آئی۔ وہاں پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی سیڑھیاں تھیں جو اوپر کسی پارک تک جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں طرف تا سڑک، پہاڑ سے چپکا جنگلا لگا تھا جس کا واحد مقصد اس جگہ کی تخصیص تھا۔

پارس سیڑھیوں کے قدموں میں رکی اور گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اس کا نیم رخ مزید واضح ہوا۔ گردن اونچی کرنے سے کان سے بال پیچھے کو گرے، سلور بالی چمکی پھر وہ مڑی اور جنگلے کو دیکھا جہاں تک جنگلا تھا وہاں تک نگاہ دوڑائی۔ نگاہ تھک گئی تو وہ گھر کی سمت مڑ گئی۔ ان کی طرف پشت کیے وہ اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے جارہی تھی۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے صاحب کا انتقال ہوا تھا۔“ ڈرائیور نے سادگی سے بتایا۔ فائز کو جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے ڈرائیور کو دیکھا۔

”وہ سیڑھیاں، یہ سیڑھیاں تھیں؟ میں سمجھا تھا کہ وہ گھر کے اندر کی سیڑھیاں ہوں گی۔“ وہ لمحے بھر کو غائب دماغ ہوا۔

”وہ یہی جگہ تھی۔ یہیں گرے تھے صاحب۔“ ساتھ ہی ڈرائیور نے مغموم انداز میں سر جھٹکا۔ پارس گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ فرید خان نے کار اسٹارٹ کردی۔ فائز ابھی تک گہری نگاہوں سے پارس کا تعاقب کررہا تھا۔

☆☆☆

پارس نے چھوٹا سا لکڑی کے جنگلے کا سفید گیٹ عبور کیا۔ اس کے قدموں میں تھکاوٹ تھی، چہرے پر بھی تھکان تھی۔ گیٹ بند کرتے ہوئے وہ پلٹی تو دور جاتی گاڑی اب موڑ کاٹ رہی تھی۔ پارس نے اب بھی گاڑی کے بجائے ان سیڑھیوں کو دیکھا۔ آنکھوں

ہائیکو

رُت پلٹتی نہیں، وقت رکتا نہیں
زور اپنا مقدر پہ چلتا نہیں
جینے والوں کو اب کوئی روتا نہیں

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

میں چھائی اداسی گہری ہوگئی۔

وہ پلٹ کر آئی ڈھلان پر بنے لان کے زینے چڑھنے لگی۔ آدھی سیڑھیوں کے درمیان وہ رکی اور جیسے غائب دماغی سے وسطی زینے کو دیکھا۔

اس وقت شام کا نیلگوں پن گہرا ہورہا تھا۔ ایسے میں اچانک کہیں سے سیڑھیوں پر ڈھیر ساری روشنی اتر آئی۔ لمحے بھر کو وہ سیڑھیاں ایک کچے پکے مکان کے صحن کے ساتھ بنے زینے میں ڈھل گئیں۔

صحن میں چند عورتیں جمع تھیں۔ سفید چادر پر دائرے میں بیٹھی گٹھلیاں پڑھتی عورتیں...... ان سب سے الگ تھلگ زینے کے وسط میں ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی بیٹھی تھی۔ لمبے بال، سانولا رنگ، بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں جن میں خوف و یاسیت اتری تھی۔ وہ گھٹنے سینے سے لگائے ہراساں سی بیٹھی تھی۔ گھٹنوں اور سینے کے درمیان ایک مردانہ گرم ٹوپی بھی جکڑ رکھی تھی۔

دفعتاً نیچے عورتوں کے درمیان سے ایک عورت اٹھ کر اوپر آتی دکھائی دی۔ اس کا رنگ سانولا، کانوں میں سونے کی بالیاں اور آنکھوں میں کرختگی و شاطر پن تھا۔ وہ اوپر وسطی زینے پر آرکی۔

”پارو، اِدھر کیوں بیٹھی ہے؟“ اس کے انداز میں نرمی و ہمدردی نہیں تھی، سختی یا کرختگی بھی نہ تھی بس مشینی سا انداز تھا۔ لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں ویرانی تھی۔

”امی...... ابا واقعی چلا گیا؟“ ساتھ میں سیاہ

آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے۔

''لے کتنی دفعہ بتاؤں، مر گیا ہے تیرا ابا۔'' آواز میں جذبہ ابھرا۔ غصہ، طیش مگر آواز ہلکی رکھی۔ ''چھوڑ گیا ہے وہ ہم سب کو اور یہ کیوں تو اس کی ٹوپی پکڑے بیٹھی ہے؟ اِدھر دے۔'' عورت نے لڑکی کے گھٹنے میں دبی ٹوپی کھینچی، وہ کراہ کر رہ گئی۔

''کس کام کی ہے یہ ٹوپی۔ ردّی والے کو بیچو تو دو آنے بھی نہ ملیں...... مگر تیرا بھی کیا قصور پارو۔ ابّے نے کون سا پیچھے خزانے چھوڑے ہیں جن کو دل سے لگا کر بیٹھے...... ہک ہا!'' وہ سر ہلاتی نیچے واپس جانے لگی پھر کسی خیال کے تحت واپس مڑی۔

''اور ہاں کل سے اسکول ضرور جائیو، پڑھ لکھ کر اب تو نے ہی یہ گھر چلانا ہے پارو۔ بھائی تیرا چھوٹا ہے، آگے اسے بھی پڑھانا ہے میری ہڈیوں میں اب زور نہیں رہا اور......'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''اب تو وہ عدت بھی پوری کرنی ہے۔ موئے مولوی بھی معافی نہیں دیتے۔ ایسا کر، کل اسکول کے بعد تو لفافے بنانے فیکٹری جانا، یہ ساتھ والی صفیہ بھی جاتی ہے اسی کے ساتھ چلی جانا۔ اب تو نے ہی کرنا ہے جو بھی کرنا ہے پارو۔'' ایک دم کسی بچے کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ہراساں بیٹھی لڑکی نے بے اختیار بیرونی دروازے کی سمت دیکھا۔

''امی شکیل پھر کسی سے لڑ رہا ہے۔''

''چپ کر، تیرا بھائی نہیں لڑتا وڑتا۔ یہ سارے محلے کے مرن جوگے بچے اسے تنگ کرتے ہیں۔ ٹھہر ذرا، میں ان کی خبر لیتی ہوں۔'' وہ جارحانہ انداز میں باہر کو لپکی۔

''بی بی، آپ آ گئیں کھانا لگواؤں؟'' افضل بابا سیڑھیوں کے اوپر کھڑے اسے پکار بیٹھے تو وہ جیسے کسی خواب سے جاگی۔ ایک نظر پھر زینے کو دیکھا اور سر جھٹک کر اوپر چڑھنے لگی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے بعد میں کھا لوں گی۔'' سنجیدگی مگر نرمی سے کہتی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ بوڑھا بابا سر ہلاتا ہوا برآمدے کی دوسری سمت چلا گیا۔

پارس نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ بڑے صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی عورت کا چہرہ اس کی یادوالے چہرے جیسا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اب اس کے سامنے کے بال سفید تھے، دوپٹا سر پر لے کر کانوں کے پیچھے اُڑس رکھا تھا۔ کانوں میں اب ہلکی بالیوں کی جگہ سونے کے بڑے، بڑے جھمکے تھے۔ ملازمہ پلیٹ میں روسٹ کا پیس لیے جھکی کھڑی تھی اور وہ عورت (فیروزہ مائی) نخوت سے بوٹی توڑ کر دیکھ رہی تھی۔

''ابھی پورا نہیں گلا، اندر گلابی پن ہے۔ بہت ہی ہڈحرام ہو گئی ہو تم۔ ٹھیک سے پکایا کرو، اب جاؤ اور باقی پیس ابھی تیل سے نہ نکالنا۔''

''جی میڈم۔'' ملازمہ سیدھی ہوئی اور جانے کے لیے مڑی۔

''یہ تو اِدھر دو۔'' فیروز مائی نے پلیٹ اسی نخوت سے اس کے ہاتھ سے لی۔ ملازمہ گڑبڑا کر پلیٹ اسے تھما کر کچن کی سمت بھاگی۔ فیروزہ مائی نے کرسپی چکن روسٹ کی ران کا پیس اٹھایا اور دانتوں سے کاٹا۔

پارس دروازے میں کھڑی تھی۔ فیروزہ مائی نے ابھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ویسے بھی اندھیرے میں تھی۔ ماں روشنی میں بیٹھی تھی پھر بھی اس کی نگاہوں کے سامنے والا منظر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

ایک نیم تاریک کمرا، چھت سے لٹکا زرد بلب، چارپائی پر بیٹھی سیاہ بالوں اور مرجھائی آنکھوں والی لڑکی جس کی نگاہیں ساتھ بیٹھے اپنے سے چار پانچ سال بڑے بھائی کی پلیٹ پر تھیں جس میں سالن کے اوپر ران والی ایک بوٹی اور ایک سینے کی بوٹی رکھی تھی پھر اس نے اپنی پلیٹ کو دیکھا۔ اس میں

گردن والی بوٹی تھی۔

''امی!'' اس نے منمناتی آواز سے دونوں کے مقابل بیٹھی ماں کو پکارا جو دونوں کی پلیٹ میں سالن ڈالنے کے بعد اب اپنی پلیٹ میں ڈال رہی تھی۔ ایک بڑی بوٹی کے ساتھ شوربا۔

''ہاں بول۔'' اس نے ڈونگا ڈھک کر اپنے پیچھے رکھ دیا۔ لڑکا اب دلجمعی سے بڑے بڑے لقمے لیتا کھا رہا تھا۔

''مجھے بھی ٹانگ والی بوٹی دو۔''

''چپ کر پارو۔ آدھا کلو مرغی بنائی ہے۔ ایک ہی ران تھی جو بھائی کے لیے تھی اب کیا اپنی ران کاٹ دوں؟'' وہ بگڑی۔ پارس نے سوگواری سے اپنی پلیٹ پر دوبارہ نظر کی۔

''امی مجھے گردن نہیں کھانی، دوسری بوٹی دے دو ناں!''

''وہ شام کے لیے رکھا ہے، اب یہی کھا۔ زیادہ کھائے گی تو سست پڑ جائے گی پھر کام پر کون جائے گا؟'' لڑکی سر جھکائے لقمہ توڑنے لگی۔

''دیکھ رہی ہو اماں، پارو جب سے سلائی سینٹر کام پر جانے لگی ہے، بہت بولنے لگی ہے اور اب میری بوٹیاں بھی گنتی ہے۔'' لڑکا چمک کر بولا۔ پارس نے سر اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا۔

''زیادہ آنکھیں نہ دکھا بھائی کو اور چپ کر کے کھا۔ چل کھا میرا بچہ۔'' دونوں کو مختلف لہجوں میں مخاطب کرتی وہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

''ارے پارو، تم کب آئیں؟'' خوشگوار حیرت میں ڈوبی آواز پر پارس چونکی۔ فیروزہ مائی، فیروزہ بیگم بننے کی کوشش میں تُو کے بجائے تم اور آپ کا استعمال سیکھ گئی تھی۔

''ابھی۔'' وہ سنجیدگی سے کہتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''تم فریش ہو کر آ جاؤ، میں کھانا لگواتی ہوں۔ روسٹ بنوایا ہے آج۔ تمہیں پسند ہے ناں۔'' وہ مسکراتے ہوئے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ پارس نے مڑ کر اسے دیکھا چند لمحے دیکھتی رہی۔

''نہیں، مجھے نہیں پسند، آپ کھائیے۔'' ہموار، بے تاثر لہجے میں کہہ کر اس نے پہلے زینے پر قدم رکھا۔

''اے سنو پارس۔'' فیروزہ مائی اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ ''ایک بات کرنی تھی تم سے۔'' انداز میں لجاجت و خوشامد تھی۔ پارس نے تکان سے اسے دیکھا۔

''بولو امی۔''

''وہ شکیل کا فون آیا تھا، آج کل کاروبار مندا جا رہا ہے اس کا۔ اُدھر دبئی میں حالات اچھے نہیں ہیں۔''

''کتنے پیسے مانگے ہیں اس دفعہ؟'' وہ ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذبات سے عاری انداز میں بولی۔

''وہ...... زیادہ نہیں بس یہی د...... دس پندرہ لاکھ تو لگ جائیں گے۔ وہ تو منع کر رہا تھا مگر میں نے کہا آخر بہن ہے اربوں کے ہوٹل کی مالک، اس کے لیے کیا مشکل۔'' وہ رکی اور امید افزا نگاہوں سے پارس کے چہرے کو دیکھا۔ ''پھر میں اسے بتا دوں کہ تم پیسے بھیج دو گی؟''

وہ خاموش رہی، بالکل خاموش پھر ایک دم پلٹ کر اوپر زینے پر چڑھنے لگی۔

فیروزہ نے حیرت و الجھن سے اسے اوپر جاتے دیکھا، وہ زینے چڑھتی بنا رکے اوپر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

اندر آ کر اس نے دروازہ ذرا زور سے بند کیا...... پھر شال اور پرس صوفے پر ڈالے، گلاسز اتار کر سنگار میز پر رکھے اور آئینے میں دیکھا۔

بیضوی مرر میں اس کا عکس ہلکی زرد روشنی سے جھلملا رہا تھا یا شاید اس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

ایک آنسو ٹوٹا اور گال پر لڑھکتا فرش پر جا گرا۔

''آئینہ بھی کیا عجیب شے ہے، ہر چیز دکھا دیتا ہے

کچھ نہیں چھپاتا...... مگر پھر بھی ایک غلطی یہ کر جاتا ہے۔‘‘ ایک تلخ مسکراہٹ پھیکے چہرے پر بکھری۔

’’دائیں کو بائیں اور بائیں کو دائیں دکھاتا ہے۔ یہ کیسی شفافیت ہوئی کہ اپنا عکس ہی الٹا نظر آئے۔ یہاں کوئی سچا نہیں ہے آئینہ تک دھوکا دے جاتا ہے۔‘‘ اس نے بے دلی سے کہتے ہوئے آنسو رگڑے۔ پھر نم ہتھیلی پھیلا کر دیکھی۔ سانولی لکیروں کے درمیان تصویریں سی بننے لگیں۔ فلم در فلم، چہرہ در چہرہ......

کرخت چہرے اور سونے کی بالیوں والی عورت نوٹ گن رہی تھی۔ سامنے وہ پندرہ سولہ برس کی لڑکی...سر پہ دوپٹا لیے کھڑی مضطرب انداز میں انگلیاں چٹخاتے اسے دیکھ رہی تھی۔

’’بس؟ یہ تو ہوئے فیکٹری کے پیسے اور سلائی والے کدھر گئے؟‘‘ اس نے تیز نظروں سے لڑکی کو گھورا۔

’’وہ......وہ تھوڑے سے تھے، کرایے کے لیے رکھ لیے۔‘‘

’’کرایہ؟ کس کا کرایہ؟‘‘ لڑکی نے نظریں جھکا دیں۔

’’سلائی سینٹر دور پڑتا ہے امی، میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ آئندہ حمیدہ خالہ کے ساتھ بس سے جاؤں گی۔‘‘

’’بہت پر پرزے نکل رہے ہیں تیرے پارس، میں دیکھ رہی ہوں اچھی طرح۔ انسان بن جا، کوئی ضرورت نہیں ہے بس کی عیاشیوں کی...... چار قدم اوپر چل لے گی تو کون سی قیامت آجائے گی؟‘‘ وہ پھٹ پڑی، لڑکی سہم کر پیچھے ہوئی۔

’’چل نکال سلائی سینٹر والے پیسے اور آئندہ یہ ڈرامے میرے ساتھ نہ کرنا۔ چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی، سمجھی۔‘‘ لڑکی نے جلدی سے بٹوے سے مڑے تڑے چند نوٹ نکالے، عورت نے انہیں جھپٹ لیا۔

’’میں نے تیرے باپ سے شادی کرتے وقت سوچا تھا، وہ میرے پہلے شوہر کا بچہ پال لے گا اور میں اس بن ماں کی بچی کو پال دوں گی تو احسان مانے گی مگر نہیں، تو...... تو بہت فراڈ نکلی پارو...... اسا ہے تیری ماں بھی ایسی تھی۔‘‘ وہ بکتی جھکتی، پیسے گنتی پلٹ گئی۔ لڑکی نے بھیگی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ گھر کی چوکھٹ پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ دفعتاً شکیل باہر سے آتا دکھائی دیا۔

’’اماں، پیسے دے جلدی، ورنہ رمضان چاچا دکان بند کر جائے گا اور صبح تک کہیں وہ اوپر پیسے نہ مانگ لے۔‘‘

’’ہاں یہ لے، جا جلدی سے سائیکل لے آ......‘‘ فیروزہ مائی کا لہجہ نرم ہوگیا۔ بیٹے کو پیار کیا، نوٹ تھمائے اور پھر ہمدردی سے خود کلامی کے انداز میں بولی۔

’’اب اسکول جا کر اچھا سا پڑھنا، بے چارہ بچہ اسکول جانا بھی مشکل بنا ہوا تھا۔‘‘ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی وہ کہہ رہی تھی۔ وہ بے نیازی سے انگلی پر تھوک لگاتا، نوٹ گن رہا تھا۔

لہجے بھی موسموں کی طرح ہوتے ہیں۔ وقت اور جگہ دیکھ کر بدل جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایک ہی وقت، ایک ہی جگہ پہ بھی وہ متضاد کیفیات میں سامنے آتے ہیں۔ جیسے ایک ساتھ دھوپ اور چھایا ہو۔ جیسے سمندر کے کڑوے اور میٹھے پانی کے درمیان ان دیکھی آڑ ہو۔ اور پھر کڑوا تو کبھی میٹھے سے مل ہی نہیں سکتا ناں!

باورچی خانے سے دیکھتی لڑکی نے سر جھکا کر اپنی پھٹی ایڑھیوں کو دیکھا۔ منظر بھیگتا چلا گیا۔ جیسے بن موسم کی بارش......

بیڈروم کا دروازہ ہلکا سا کھٹکا اور پھر چرچراہٹ سے کھلا۔ سنگار میز کے سامنے کھڑی پارس چونک کر پلٹی۔

فیروزہ مائی دروازے میں کھڑی تھی۔ اسے خود کو دیکھتا پا کر جلدی سے مسکرائی۔

’’بات کرنی تھی تم سے۔‘‘ وہ تمہید باندھتی آگے بڑھی۔ پارس اسی طرح سیدھی کھڑی رہی۔ اس کی فیروزہ پہ جمی آنکھوں میں سنجیدگی اور سرد مہری تھی۔

’’وہ ......تم شکیل کو پیسے کب بھجواؤ گی؟‘‘ وہ ذرا ہچکچا کر بولی تھی۔

پارس گہری سانس لے کر آئینے کی طرف پلٹی، برش اٹھایا اور اوپر سے نیچے بالوں میں پھیرنے لگی۔

’’تم ...... پھر کب تک بھیجو گی پیسے؟ اصل میں شکیل کو ضرورت ہے، کہہ رہا تھا ہو سکے تو کل ہی بھجوا دیں، تم یوں کرنا، کل دفتر جانا تو......‘‘

’’کیا میں نے کہا کہ میں شکیل کو پیسے بھیج رہی ہوں؟‘‘ وہ آئینے میں فیروزہ کا عکس دیکھتی، برش اوپر سے نیچے لے جاتے ہوئے پُرسکون انداز میں بولی۔ فیروزہ نے الجھن سے لبوں پر زبان پھیری۔

’’وہ تو تم بھیج ہی دو گی۔‘‘

’’سوری، میں نہیں بھیج سکتی۔‘‘ وہ اب اپنے عکس پہ نگاہیں جمائے سامنے کے بال سیدھے کر رہی تھی۔

’’یہ کیا بات ہوئی؟ بھائی ہے تمہارا، پیسے نہیں بھیجو گی تو وہ کیا کرے گا؟‘‘

’’بینک لوٹے یا بھیک مانگے، مجھے فرق نہیں پڑتا۔‘‘ اس کی بات پر فیروزہ کے ماتھے پر بل پڑے۔

’’ساری زندگی دیتی آئی ہو، اب کیوں نہیں دو گی؟‘‘

’’ساری زندگی دیتی آئی ہوں، اب نہیں دوں گی۔‘‘

’’آج کون سی انوکھی بات ہوگئی ہے؟‘‘ فیروزہ مائی کی آواز اشتعال سے بلند ہونے لگی۔ برش چلاتا پارس کا ہاتھ رکا، اس کی سماعت میں ایک آواز گونجی۔

’’امی اور بہنیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہتی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ بھلے کوئی کم آمدنی والی جاب ہی کر لوں مگر یہیں کروں۔‘‘ اس نے سر جھٹکا۔

’’شکیل کو کہیں، میرے پاس اس کے لیے پیسے نہیں ہیں، بات ختم۔‘‘

’’کیسے بات ختم؟‘‘ وہ تلملا کر بولی۔ ’’اربوں روپے کا ہوٹل ہے تمہارے پاس جس کے ایک کمرے کا ایک دن کا کرایہ پچیس تیس ہزار سے کم نہیں اور بھائی کے لیے دس پندرہ لاکھ نہیں ہیں تمہارے پاس؟‘‘

’’دس پندرہ ہزار بھی نہیں ہیں، بتا دینا اسے۔‘‘ وہ ہیئر برش رکھ کر دراز کھولے کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

’’کیسے نہیں ہیں؟ اس بڈھے کی ساری دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئی ہو، شادی کے دو ماہ بعد ہی اس کو مار کر سب ہتھیا کر اب تم......‘‘ الفاظ ابھی فیروزہ مائی کے لبوں میں ہی تھے کہ پارس کرنٹ کھا کر اس تک پہنچی۔ فیروزہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر دیوار سے لگایا اور چہرہ اس کے بہت قریب کیے، شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

’’آج تو یہ بات منہ سے نکال دی ہے، آئندہ کہا تو دو منٹ میں......‘‘ اس نے چٹکی بجائی۔ ’’دو منٹ میں تمہارا سامان لپیٹ کر اس گھر سے نکال دوں گی۔ سمجھ میں آئی میری بات یا نہیں؟‘‘ چبا چبا کر سنگین لہجے میں اس نے الفاظ ادا کیے۔

دیوار سے لگی فیروزہ مائی کی آنکھوں میں ڈھیروں خوف و ہراس اتر آیا تھا۔ بہ مشکل اس کے لبوں سے کپکپاتی آواز نکلی۔

’’پارس، کیا ہو گیا...... میں...... ماں ہوں تمہاری۔‘‘

’’سوتیلی ماں ہو، جسے میں نے صرف اس لیے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے کہ میرے باپ کی بیوی ہو، رہا تمہارا بیٹا تو وہ میرے باپ کا بیٹا نہیں ہے اس لیے اسے میرا بھائی مت کہنا اور اگر آئندہ تم نے رضوان کی موت کا الزام مجھ پر لگانے کی کوشش کی تو تم دیکھنا میں کیا کرتی ہوں تمہارے ساتھ۔‘‘ ایک جھٹکے سے وہ فیروزہ کے کندھے چھوڑ کر پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ فیروزہ فق چہرہ لیے تیزی سے

کمرے سے باہر نکل گئی۔

پارس دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلاتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ آئینے سے جھلکتے عکس میں اس کی بالیاں ابھی تک چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

☆☆☆

آفس میں معمول کی چہل پہل تھی، شیشے کی کھڑکیوں سے جھانکتی صبح، کافی کے کپوں کی اُڑتی بھاپ، مصروف فون کالز......

فائز نے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا، کام کرتی پارس نے گردن اٹھائی، اسے دیکھ کر سر کے اثبات سے آنے کا اشارہ کیا، وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے آبیٹھا۔

''جی فائز صاحب؟'' وہ اپنی پاور سیٹ پہ اب ٹیک لگا کر پیچھے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''میم مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اس دن آپ نے مجھے لفٹ دی اور پھر تین دن کے کڑے انتظار کے بعد اپائمنٹ لیٹر کا ملنا، میں اپنی خوشی بیان نہیں کرسکتا۔'' وہ بظاہر بہت احسان مندی سے کہہ رہا تھا البتہ اس کی گہری آنکھیں کچھ اور کہتی تھیں۔

''یو آر ویلکم......!'' پارس نے اسی سنجیدگی سے فائل اسٹینڈ سے ایک فائل اٹھائی، اسے کھولا، چند صفحے پلٹائے اور پھر ایک جگہ رکی۔

''فائز صاحب! آپ نے اپنے سی وی میں تجربے کے خانے میں ایک سال کے لیے ہمارے ہوٹل کی لاہور والی شاخ میں کام کرنے کا بھی لکھا ہے۔''

''جی میم......! رضوان صاحب کی ڈیتھ سے دو تین ماہ قبل ہی میں نے وہاں سے ریزائن کیا تھا۔''

''اور آپ نے وہاں پر پورا سال کام کیا تھا؟'' پارس پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی میم، اسی لیے میں آپ سے رضوان صاحب کی تعزیت کررہا تھا، میں ان سے مل چکا ہوں، بہت مہربان آدمی تھے وہ۔''

دونوں کی نگاہیں بے اختیار کونے میں رکھے فوٹو فریم کی طرف اٹھیں، پارس اسے دیکھتے ہوئے لمحے بھر کو کہیں اور کھوئی...... فائز اپنے تمام تر کھوجنے کے باوجود اس تصویر کے ساتھ بہت پیچھے چلا گیا......

جب وہ چھوٹا تھا...... ایک ٹین ایج لڑکا......

وہ ٹین ایج لڑکا صوفے پر بیٹھا، فکرمندی سے اپنے سامنے ٹہلتی سویرا آپا کو دیکھ رہا تھا۔

''اوہو آپا، کیا ہوگیا ہے؟'' آپا رکیں، خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا اور جیسے پھٹ پڑیں۔

''کیا ہوگیا ہے؟ دیکھا نہیں تم نے، وہ لڑکی ندا کیسے بے وقوف بنارہی ہے ہمارے سادہ سے بھائی جی کو؟'' وہ مضطرب انداز میں پھر کمرے کے چکر لگانے لگیں۔ فربہی مائل جسم اور چھوٹی آنکھوں والی سویرا آپا بے حد بے چین نظر آرہی تھیں۔

''خود ہی تو آپ نے ان کی منگنی کروائی تھی۔''

''میں نے نہیں کروائی تھی۔'' وہ ایک دم چمک کر بولیں۔ ''بھائی جی نے کہا، دوست کی بہن ہے، پسند ہے انہیں۔ سو میں رشتہ لے گئی کہ اب نہیں شادی کریں گے تو کب کریں گے، آخر بہن ہوں، مجھے ہی سوچنا ہوگا اور وہ نیچ لوگ بھی جیسے تیار بیٹھے تھے، ادھر رشتہ دیا اُدھر ہاں کردی...... اور وہ ندا...... سوائے خوب صورتی اور چند ڈگریوں کے اور کیا قابلیت ہے اس میں؟ مگر میں نے کہا، بھائی جی خوش تو ہم خوش...... مگر مجھے کیا پتا تھا کہ وہ دولت کے لالچی لوگ ایسے کام کرنے لگیں گے۔'' پھولے تنفس کے ساتھ جوشِ جذبات میں بولتی، وہ سامنے صوفے پر آبیٹھیں۔ ٹین ایج لڑکا بہت دھیان سے ساری بات سن رہا تھا۔

''اب تم بتاؤ فیضی، بھائی جی کے ساتھ پوری دنیا میں ہم سے زیادہ مخلص کون ہوسکتا ہے؟ اماں، ابا رہے نہیں ہمارے، بھائی جی ہی ہمارا سب کچھ ہیں۔

ایک چھوٹے ڈھابے سے شروع کیا جانے والا کاروبار آج میری دعاؤں کے سبب ہوٹلز کی ایک چین میں بدل چکا ہے، اب تم بتاؤ، ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم بھائی جی کا اچھا سوچیں؟''

''بالکل آپا!'' لڑکے نے سر ہلایا۔ سویرا آپا جوش سے کہتی آگے ہو بیٹھیں۔

''اب خود دیکھو، کل ندا کی سالگرہ پہ بھائی جی نے اسے ہیرے کی انگوٹھی گفٹ کی، ہیرے کی انگوٹھی فیضی...... اب یہ مت کہنا کہ مجھے بھی دی ہے کئی بار۔ بھئی میں تو بہن ہوں مگر وہ پرائی لڑکی، کبھی اس کا بھائی ٹاپ کرتا ہے تو اسے تحفے ملتے ہیں، کبھی بہن کے بچوں کے لیے خریداری کی جارہی ہوتی ہے۔ بھائی جی تو ٹھہرے معصوم اور سادہ، ہم تو اندھے نہیں ہیں، وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں سے ان کو لوٹتی رہی تو بھائی جی کنگال ہوجائیں گے پھر امجد (سویرا کا شوہر) کا آسٹریلیا میں بزنس کون سیٹل کروا کردے گا اور تم نے بھی تو امریکا جانا ہے پڑھنے کے لیے کہ نہیں؟''

''جانا ہے...... مگر بھائی جی کے پاس بہت دولت ہے آپا۔''

''اور ہمارا فرض ہے کہ ان کی دولت کو ان مفت خوروں سے بچائیں۔ دیکھو فیضی، وہ تو بھائی جی کو لوٹ کر بھاگ جائے گی، ہرٹ کون ہوگا؟ بھائی جی! ان کا تو دل ٹوٹ جائے گا۔ اب تم بتاؤ اس لالچی لڑکی سے بھائی جی کا پیچھے چھڑانا چاہیے یا نہیں؟''

''چاہیے آپا...... مگر بھائی جی کے پاس بہت دولت ہے، لوگ کہتے ہیں وہ پارس ہیں، جس چیز میں ہاتھ ڈالیں، اسے سونا بنادیتے ہیں۔''

''کیا آپ کی ملاقات رہتی تھی رضوان سے؟'' پارس کی آواز نے اسے چونکایا۔ لمحے بھر میں وہ یادوں کی بہتی ندی سے باہر آیا۔

''جی! چند ایک بار شرفِ ملاقات نصیب ہوا تھا۔'' وہ سنبھل کر اداسی سے مسکرایا۔ ''بہت کچھ سیکھنے کو ملا، ان فیکٹ ابھی مجھے یاد آرہا تھا کہ ان کے کام میں اللہ نے بہت برکت رکھی تھی۔ لوگ کہتے تھے، وہ پارس ہیں، ایسا آدمی جس چیز کو چھوئے اسے سونا بنا دیتا ہے۔''

پارس کے لبوں پر ہلکی سی تلخ مسکراہٹ آٹھہری...... یہ پہلی دفعہ تھا کہ جب فائز نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''ہاں، ایسا شخص جس کو چھوئے اسے سونا بنا دے مگر خود ساری زندگی پتھر ہی رہتا ہے۔''

''بجا فرمایا......'' فائز رسمی انداز میں مسکرایا۔ ایک نظر پھر سے اس مسکراتی تصویر پر ڈالی۔ دفعتاً فون بجا۔ پارس ریسیور اٹھائے دوسری طرف کی بات سننے لگی۔

تصویر کو دیکھتی فائز کی نگاہیں پھر سے بھٹکیں، یادوں کی جھیل میں دائرے بننے لگے۔

ایک چھوٹے مگر نفیس سے ڈرائنگ روم میں وہ گوری، خوب صورت لڑکی ٹرے اٹھائے ایک نوجوان کو جوس سرو کررہی تھی۔ قریبی صوفے پر ایک معمر خاتون بیٹھی، مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

ان سے ذرا دور دروازے کی چوکھٹ پہ وہ ٹین ایج لڑکا اور سویرا آپا چند لمحے دیکھتے رہے۔ سویرا آپا کی آنکھوں میں چمک در آئی تھی۔ جیسے ہی وہ لڑکی کباب کی پلیٹ اٹھائے نوجوان کے سامنے جھکی، سویرا آپا ایک دم سے اندر داخل ہوئیں۔

''بہت خوب ندا...... یہاں تو خاص الخاص مہمان آئے ہوئے ہیں، اتنے خاص کہ ہماری آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی۔'' لڑکی سیدھی ہوتی ہوئی چونکی پھر آپا کو دیکھ کر سادگی سے مسکرائی۔

''آیئے سویرا آپا، آپ کب آئیں؟'' معمر خاتون بھی مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں۔

''جب تم یہاں غیر مردوں کی خاطریں کرنے

میں مصروف تھیں۔"

ان کی بلند آواز، عجیب لہجہ، لڑکی کا چہرہ فق ہوا، اس نے پریشانی سے ماں کو دیکھا۔

"نہیں...... میں تو سرو کر رہی...... یہ میرے کزن ہیں، ماموں کے ساتھ آئے ہیں، ماموں اوپر ہیں اور......" "سویرا آپا کے الفاظ نہیں، ان کی تند و تیز نگاہیں تھیں جو وہ تینوں پریشان ہو گئے تھے۔

"بس بس...... سب دیکھا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے، میرے معصوم بھائی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تم یہاں یہ سب کر رہی ہو، بدکردار لڑکی۔" ندا کا چہرہ سرخ ہو کر دہکنے لگا۔

"اپنی حد میں رہیں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں، مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔"

"بیٹا...... تم غلط سمجھی ہو یہ تو......" ماں نے مداخلت کی کوشش کی۔

"آپ درمیان میں مت بولیں۔ میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے آپ کی بدکردار بیٹی کو۔" ندا کا کزن ہونقوں کی طرح کھڑا سب دیکھ رہا تھا چوکھٹ میں کھڑا ٹین ایج لڑکا بھی خاموش تھا، بالکل خاموش۔

"مجھے نہیں پتا آپ یہ کیوں کر رہی ہیں مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ میرے گھر میں کھڑے ہو کر آپ مجھے یوں بدکردار نہیں کہہ سکتیں۔" ندا حیرت زدہ بھی تھی اور اب اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ "اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ اس طرح اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بی بی کہ تم کیا کر رہی تھیں؟" وہ چمک کر بولیں۔

"کیا کر رہی تھی میں؟ جوس دے رہی تھی، کباب دے رہی تھی۔ آپ کیوں اس بات کو غلط رنگ دے رہی ہیں؟"

"یعنی کہ تم مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو؟"

"نہیں، نہیں سویرا بیٹا، اس کا یہ مطلب نہیں..."

"آپ خاموش رہیں امی، یہ خاتون سب کچھ سوچ کر آئی ہیں، انہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اور ہاں، میں آپ کو جھوٹا اور الزام تراش کہہ رہی ہوں۔" وہ لڑکی بہت اعتماد اور سختی سے بولی تھی۔

"بس بہت دیکھ، سن لیا...... میں بھی دیکھتی ہوں اب تم مزید کیسے میرے بھائی کو بے وقوف بناتی ہو۔ چلو فیضی!" وہ دھڑ سے آگے پیچھے باہر نکلے تھے۔

منظر ہوا میں تحلیل ہوا، رنگ بکھرے...... یادوں کے کینوس پہ ایک اور برش اسٹروکس لگنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پینٹنگ پھر سے بننے لگی۔

بھائی جی بڑے صوفے پر خاموش، افسردہ سے بیٹھے تھے۔ سامنے وہ لڑکا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سویرا آپا کرسی پر براجمان مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

"دیدہ دلیری دیکھیں ان لوگوں کی۔ ایک تو ہم نے ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا اوپر سے لڑکی نے شور کر کے سارا گھر اکٹھا کر لیا۔ کیسے لوگ ہیں، آنکھیں بند کر کے دوسرے کمروں میں پڑے تھے۔ اوپر سے اتنی بدزبانی کی مجھ سے، الٹا ہم پہ الزام لگانے لگے۔"

ٹین ایج لڑکے کا سر مزید جھک گیا۔ وہ اب اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے تو پہلے دن سے ہی ندا کے طور طریقے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن میں چپ رہی، آپ کی خوشی تھی، میں بھی خوش تھی۔ آج بھی زبان نہ کھولتی کہ میں تو دوبار پہلے بھی بازار میں ندا کو اس لڑکے کے ساتھ دیکھ چکی ہوں مگر آج تو فیضی نے بھی دیکھ لیا۔ اب خاموش رہتی تو چھوٹا بھائی مجھے بڑے بھائی کا مجرم قرار دیتا۔ کیوں فیضی؟" لڑکے نے سر اٹھایا، بھائی جی سے نظریں ملائیں۔

"جی بھائی جی...... آپا درست کہہ رہی ہیں،"

ایسا ہی ہوا تھا۔'' بھائی جی کی آنکھوں میں ڈھیروں اداسی تھی۔ ویرانی تھی۔

یادوں کی پینٹنگ چند دن مزید آگے سرکی۔ ایک فون کال ہر جگہ چھانے لگی۔ فیضی کے ہیلو کے جواب میں کہے گئے چند فقرے جو آج بھی اسے سنائی دیتے تھے۔

''ندا بول رہی ہوں، فیضان۔ بہت شکریہ تمہارا اور تمہاری آپا کا۔ آج تمہارے بھائی نے منگنی کا سامان واپس بھجوا دیا ہے اور جانتے ہو میں خوش ہوں۔ اس لیے کہ انہوں نے مجھے فون بھی کیا اور پتا ہے کیا کہا؟ انہوں نے کہا، میں جانتا ہوں تمہارا دامن بے داغ ہے مگر اس واقعے کے بعد تم کبھی میرے بہن بھائی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی۔ تمہیں بڑی تکلیف سے بچانے کی خاطر چھوٹی تکلیف دے رہا ہوں۔ تمہیں ہم سے بہتر لوگ مل جائیں گے اور ملنے چاہئیں....'' وہ رو رہی تھی۔

''یاد رکھنا فیضان، تم اور تمہاری بہن دنیا کے سب سے مفاد پرست اور خود غرض بہن بھائی ہو مگر آئے گا ایک دن جب رضوان تم لوگوں کی اصلیت ''مان'' لیں گے کیونکہ ''جانتے'' تو وہ اب بھی ہیں اور دیکھنا تب وہ تمہیں اپنی شادی میں بلانے کی زحمت بھی نہیں کریں گے۔''

''سوری، امپورٹنٹ کال تھی۔'' پارس نے ریسیور رکھتے ہوئے پیشہ ورانہ سی معذرت کی۔ اس کی آواز پہ یادوں کی رہ گزر سے وہ واپس لوٹا اور پھیکا سا مسکرایا۔

بعض یادیں ان نشتروں سے لبریز ہوتی ہیں جو دوسروں نے ہمیں ہرٹ کرنے کے لیے پھینکے ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہوتے ہیں کہ ہم ٹھیک تھے، جو ہم نے کیا وہ قطعاً غلط نہ تھا مگر پھر ہر دفعہ وہ نشتر چبھنے پر دل کے اندر چیر دینے والی تکلیف کیوں ابھرتی ہے؟ وہ تکلیف جو کسی ایسے گلٹ سے پیدا ہوتی ہے جس کا نہ انسان اعتراف کرے نہ ہی اسے خبر ہو۔

''تو فائز صاحب، اب آپ نے ہماری لاہور والی شاخ میں اپلائی کیوں نہیں کیا؟''

''رضوان صاحب کے بعد وہ جگہ ویسی نہیں رہی۔ فیضان صاحب ویسے بھی باہر ہوتے ہیں۔'' بظاہر بے پروائی سے کہتے ہوئے اس نے غور سے پارس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی پیشانی پہ ہلکا سا بل پڑا تھا۔ ''منیجر ہی سب سنبھالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اُدھر اپلائی کیا تھا مگر مجھے جاب نہیں ملی۔''

''اور آپ نے وہ جاب پہلے چھوڑی کیوں تھی؟''

''رضوان صاحب کے بھائی فیضان صاحب کا کوئی سفارشی بھرتی ہونا تھا اس لیے منیجر نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ میں کوئی اور نوکری تلاش کروں سو میں نے ریزائن کر دیا۔''

پارس کے لب بھنچ گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں ناگواری سے سکڑ گئیں...... جیسے اسے کچھ بہت ناپسند آیا ہو مگر وہ اظہار نہ کرنا چاہتی ہو۔

''فیضان صاحب ابھی تک امریکا میں ہیں؟'' اپنی ناگواری دبائے وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''دو تین ماہ قبل تک تو باہر ہی تھے، اب کا معلوم نہیں۔''

''آپ کا کوئی رابطہ ہے ان سے؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ ساتھ ہی وہ اضطرابی انداز میں لاشعوری طور پر اپنی بالی کو چھیڑ رہی تھی۔

''جی میم، ایک کام کے لیے فون کیا تھا انہیں ایک دفعہ، کیا آپ کو ان کا کانٹیکٹ نمبر چاہیے؟'' وہ ذرا سا چونکا۔

''نہیں، مجھے کیوں چاہیے ہوگا۔'' وہ ایک دم اتنی ناگواری سے پہلو بدل کر بولی کہ وہ خاموش ہوگیا۔

پارس کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے انگلی بالی پر پھیرتے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ

ایسا چل رہا تھا جس سے ماتھے پر شکنیں اور آنکھوں میں نفرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''مجھے اجازت ہے، میم؟'' وہ اپنی حیرت چھپاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پارس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک وہی کلفت چھائی تھی۔

☆☆☆

سرسبز پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پہ اس کی گاڑی دوڑ رہی تھی۔ باہر کے ٹھنڈے، خوشگوار موسم سے بے نیاز وہ اندر بیٹھا، اسٹیئرنگ وہیل پر ایک ہاتھ رکھے وہ دوسرے ہاتھ سے موبائل پر ایک نمبر ملا رہا تھا۔ سلسلہ ملتے ہی اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہیلو سویرا آپا، کیسی ہیں؟'' کار اس نے آہستہ کر دی۔ اب اس کی ساری توجہ کال کی طرف تھی۔

''میں ٹھیک ہوں فیضی، تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' وہ اس کے لیے پریشان تھیں۔

''بھائی جی کا حساب ادا کرنے آیا ہوں۔'' اسے لگا وہ اب ڈرائیو نہیں کر سکے گا سو گاڑی سائڈ پر روک دی اور شیشہ نیچے کر دیا ایک دم یخ بستہ ہوا اندر گھسی۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف کھائی۔ مری کا خوب صورت، ٹھنڈا لہلہاتا موسم۔

''پارس نے تمہیں نہیں پہچانا؟'' وہ حیران تھیں۔

''اس نے میری کبھی کوئی تصویر نہیں دیکھی سو کیسے پہچان سکتی تھی!''

''ہاں یہ بھی ہے، بھائی جی نے بھی اُسے ہم سے بالکل کاٹ کر رکھا تھا۔'' ان کی آواز میں گلہ در آیا۔ ''خیر، اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''پارس کو سزا دوں گا یا دلواؤں گا اور وہ سب جو بھائی جی نے اس کے نام لکھوایا ہے، سب واپس لوں گا۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں فیضی مگر ایسا کیسے ممکن ہو سکے گا؟'' وہ فکر مند تھیں۔ اس نے شانے اچکائے۔

''میں آہستہ آہستہ اس کے کاغذات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جلد ہی مجھے کامیابی ملے گی۔ تنویر بھائی میری پوری مدد کریں گے۔'' سڑک پر اس کی کار اکیلی کھڑی تھی۔ دور دور تک ویرانی چھائی تھی۔ یہاں وہ بہت آرام دہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

''یہ تنویر پر زیادہ اعتبار نہ کرنا۔ مجھے تو یہ پارس کے ساتھ ملا ہوا لگتا ہے۔'' وہ مشکوک انداز میں بولیں۔

''کیوں؟'' فیضی کے ابرو حیرت سے سکڑے۔

''دیکھو بھائی جی کی موت سے پارس کے بعد سب سے زیادہ فائدہ تنویر صاحب کو ہوا ہے۔ وہ سب سے سینئر عہدیدار تھے۔ بھائی جی کے بعد بہت کچھ ان کے ہاتھ میں آیا ہے۔ کیا انہوں نے فائدے نہیں اٹھائے ہوں گے؟''

''ایک تو آپا، آپ ہر کسی پر شک کرتی ہیں۔'' اسے ان کی بات ناگوار گزری تھی۔ ''وہ ایسے نہیں ہیں، بھائی جی کے پرانے دوست ہیں۔ ہمارے گھر میں برسوں سے آنا جانا تھا ان کا۔ وہ تھوڑی سی ترقی یا عہدے کے لیے ایسا نہیں کر سکتے۔''

''ارے پاکستان میں تو ایک موبائل کے پیچھے چور اُچکے گلے کاٹ جاتے ہیں اور تم کہتے ہو تھوڑی سی ترقی؟'' وہ باقاعدہ برا مان گئی تھیں۔

''پتا نہیں...... مگر میں ان پر شک نہیں کر سکتا۔ مجھے تو پارس کا ہاتھ لگتا ہے اس میں۔'' وہ متذبذب تھا۔

''ہاں تو اسی کا پلان کیا ہوگا سب... تنویر صاحب کو کسی بڑی چیز کا وعدہ دیا ہوگا اور اب وہ ساتھ مل گئے اور تو اور ہمارے ملازم تک اس لڑکی کا دم بھرنے لگے ہیں۔'' ڈیش بورڈ پر رکھا اس کا دوسرا موبائل بجنے لگا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر

آپا سے فون پر بولا۔

''فون آرہا ہے میرا' بعد میں بات کرتا ہوں آپ سے پھر مجھے پارس کے گھر بھی جانا ہے۔''

''ہمارے گھر، فیضی۔'' انہیں اس کا لاشعوری طور پر ہی سہی اس گھر کو اس کی ملکیت تسلیم کرلینا بھی ناگوار گزرا تھا۔

''اونہوں، پارس ہمارے گھر میں نہیں رہتی۔ بھائی جی نے اسے اور اس کی ماں کو ہوٹل کے قریب بڑا سا بنگلا لے کر دیا تھا وہ اس کے ساتھ وہیں رہتے تھے۔ ہمارا گھر تو یہاں سے کافی دور ہے۔''

''اچھا تو وہ گھر کس کے نام ہے؟'' وہ تیزی سے بولیں۔

''پارس کے۔'' اس نے گہری سانس لے کر فون بند کردیا اور اپنا دوسرا موبائل اٹھالیا۔ آفس کے ساتھی کی کال تھی۔ اسے سننی تھی۔

☆☆☆

ٹھنڈی ٹھنڈی سی شام پہاڑیوں پر اتر رہی تھی۔ پارس کے بنگلے کے ٹیرس سے دور دور تک پھیلے پہاڑ، کھائیاں، بل کھاتی سڑک سب نظر آرہا تھا۔ وہ وہیں ٹیرس پر کھڑی تھی۔ شال پیچھے سے دونوں کندھوں کو ڈھکتی آگے آکر بکل کی صورت تھی...... اس نے گہرا بھورا رنگ پہن رکھا تھا۔ چوڑی کے سائز کی کانوں میں پڑی بالیاں ہوا کے ساتھ ذرا ذرا سی ہلتیں۔ آنکھیں دور نیچے جمی تھیں جہاں سڑک کے ایک طرف بنی پتھریلی سیڑھیاں اوپر پارک تک جاتی تھیں۔

واقعات روشنائی کی طرح ہوتے ہیں جس جگہ ڈالے جائیں وہاں اپنا نشان ضرور چھوڑ جاتے ہیں مگر وہ ہر شخص کو نظر نہیں آتے۔ صرف وہی انہیں اس جگہ رچ بسے ہوتے دیکھ سکتا ہے جس کی نظر میں یادوں کا عدسہ لگا ہو پھر ہر جگہ، ہر گھر، ہر سڑک کا نام بدل جاتا ہے۔ ہم انہیں اپنے حساب سے یاد رکھتے ہیں اور پھر ساری زندگی ہم دنیا کو اپنے نقشوں، اپنے سائن بورڈز کے تحت ہی دیکھتے رہتے ہیں۔

''پارس بی بی!'' افضل بابا کی آواز پر اس کا ارتکاز ٹوٹا۔ وہ قدرے چونک کر پلٹی۔

''جی بابا؟''

''آفس سے کوئی صاحب آئے ہیں، میں نے لان میں بٹھایا ہے۔ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔'' بابا نگاہیں چرا کر بولے، جیسے انہیں بہت شرمندگی سی ہو۔

''اچھا کب؟'' اس نے محسوس کیے بنا حیرت سے نیچے لان کو دیکھا۔ فائز حسن خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ خیر میں آتی ہوں۔''

اس نے گہری سانس لے کر اپنے ذہن پر چھائے نقشے لپیٹے، خود کو کمپوز کیا اور نیچے چلی آئی۔

وہ لان میں بیٹھا تھا۔ جینز، ہلکے سوئٹر اور جاگرز میں ملبوس اسے آتا دیکھ کر احتراماً کھڑا ہوگیا۔

''کہیے، کیسے آنا ہوا؟'' وہ تمکنت بھرے انداز میں سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میم آپ نے برا تو نہیں مانا کہ میں یہاں آگیا؟ دراصل آپ جلدی چلی گئی تھیں اور مجھے ایک ضروری درخواست کرنی تھی۔'' وہ بیٹھتے ہوئے قدرے ندامت سے بولا۔

''میں سن رہی ہوں۔''

''میم، بات یہ ہے کہ مجھے ہوٹل کی طرف سے یہاں قریب میں ہی رہائش مل گئی ہے مگر وہ بیچلرز پورشن ہے۔'' انگلیاں باہم پھنسائے وہ تذبذب سے کہہ رہا تھا۔ ''امی اور بہنیں...... کیا کروں میں ان کا...... وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں، اصرار کررہی ہیں۔'' پارس انہماک سے سنتی رہی کچھ بولی نہیں۔

''تنویر صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کے گھر کی پچھلی طرف جو دو تین گھر ہیں وہ بھی ہوٹل ملازمین کے لیے ہیں۔ ان میں سے ایک گھر خالی ہے۔ میں

ایک بہت جونیئر عہدیدار ہوں، نیا ہوں پھر بھی سوچا درخواست کرلوں۔ اگر مجھے وہ گھر مل سکے تو......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شال لپیٹے پیچھے ہوکر بیٹھی پارس مسکرائی۔ کل صبح وہ تلخی سے مسکرائی تھی، آج نرمی سے، دل سے مسکرا رہی تھی۔ بعض لوگ مسکرانا بالکل بھول جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے ہونٹوں کے گرد لاف لائنز بھی غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر اگر کبھی وہ ذرا بھی مسکرادیں تو لگتا ہے ان کی گردن پر کوئی اجنبی چہرہ آٹھہرا ہے۔ ایسا اجنبی جس سے آپ شناسا بھی ہوں اور وہ آپ کو اچھا بھی لگے۔

''میں کبھی وہ گھر آپ کو نہ دیتی اگر یہ درخواست آپ کی فیملی کی طرف سے نہ ہوتی۔ قدر کیجیے گا ایسے رشتوں کی جو آپ کے سینے کے اوپر پہنی جیب کے بجائے سینے کے اندر دھڑکتے دل میں دلچسپی رکھتے ہوں۔''

''میم میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش ہوں۔ عالیہ اور حمیرا تو خوشی سے پاگل ہوجائیں گی۔'' وہ بہت خوش، بہت احسان مند نظر آرہا تھا۔ پارس کی مسکراہٹ مزید نرم ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی تھی۔

''مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ آپ مان جائیں گی۔ امی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ خود آکر درخواست کریں گی لیکن ظاہر ہے یہ مناسب نہ تھا۔''

پارس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔ ہوا کے گرم جھونکے کی طرح ایک بازگشت سے ایسی ٹکرائی کہ لمحے بھر کے لیے سب گھوم گیا۔

''میں پارو کی ماں ہوں جی، خود آئی ہوں آپ کے پاس...... ایک درخواست کرنی تھی۔ پارو کہنے میں ہچکچا رہی تھی۔'' دانت نکوس کر کہتی فیروزہ مائی نے تائیدی نظروں سے ساتھ بیٹھی مضطرب واداس سترہ، اٹھارہ برس کی لڑکی کو دیکھا جس کی ٹھوڑی ندامت کے باعث سینے سے لگی تھی۔

''کہو۔'' سلائی سینٹر کی مالکن آنٹی نے بیزاری سے کہا۔

''پارو کی تین ماہ کی ایڈوانس تنخواہ اگر مل جائے تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ اصل میں اس کا بھائی بڑا بیمار رہا ہے جی، دوا دارو پر بہت خرچا ہوگیا، قرض پڑ گیا ہے گردن پر۔ کچھ مدد ہوجائے گی......'' لڑکی کی ٹھوڑی جیسے سینے سے چپک گئی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ہر طرف دھند چھا رہی تھی۔ ماں منتیں کررہی تھی، آنٹی انکار کررہی تھی۔

''تین مہینے کی تو مشکل ہے ہاں دو مہینے کی مل سکتی ہے وہ بھی اس شرط پر کہ یہ کوئی ناغہ نہیں کرے گی اور ہاں یہ آخری بار ہے جب میں تنخواہ ایڈوانس میں دے رہی ہوں۔'' نخوت سے بولتی آنٹی اٹھی اور اندر چلی گئی۔ لڑکی نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

''شکیل نے دکان والے کا جو شیشہ توڑا تھا، وہ دو تنخواہوں سے تو نہیں پورا ہوگا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو مگر آواز میں دبی دبی سی تلخی تھی۔

''اے شش......!'' فیروزہ مائی نے گھرکا۔ ''اعلان کرے گی کیا اب؟ اور پورا ہوجائے گا ناں ٹیوشن والی باجی سے بھی دو ماہ کی ایڈوانس پکڑ لیں گے، یہ آنٹی پیسے لے آئے تو وہیں چلتے ہیں۔''

''کیا امی، کیوں مجھے سب کے سامنے شرمندہ کرواتی ہو؟'' وہ پھر روہانسی ہوئی۔

''زیادہ بک بک نہ کر، آرام سے بیٹھ۔''

دھند میں سب غائب ہوتا گیا۔ گرم ہوا کا تھپیڑا کب کا گزر چکا تھا۔ اس نے زبردستی توجہ فائز کی جانب مبذول کی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے اس روز فیضان صاحب کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے بعد میں بہت شرمندگی ہوئی۔ یوں لگا

جیسے میں نے آپ کو ڈسٹرب کردیا ہو۔ غالباً آپ فیضان صاحب کو کچھ خاص پسند نہیں کرتیں۔“

پارس کی پھیکی مسکان بھی غائب ہوگئی، لب بھنچ گئے، آنکھوں میں تنفر سا در آیا۔ ایک تلخ سانس خارج کرکے اس نے سر جھٹکا۔

”پہلے مجھے لگتا تھا کہ جذبوں کے پیمانے نہیں ہوتے۔ آپ یا تو کسی سے محبت کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ نفرت کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ کم یا زیادہ محبت اور کم یا زیادہ نفرت، ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“ بات کرتے ہوئے وہ چہرہ پھیر کر دور سرسبز پہاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ ”مگر اب مجھے لگتا ہے کہ جذبے بھی ناپے جاسکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی نفرت ہر نفرت سے بڑھ جاتی ہے۔ آپ کا قصور نہیں ہے، میں اس آدمی سے اتنی شدید نفرت کرتی ہوں کہ کسی کے بھی منہ سے اس کا ذکر سنتی تو ناگوار ہی گزرتا۔“ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

فائز نے بہ مشکل اپنے تاثرات چھپائے۔

(مجھ سے نفرت؟ میرے بھائی کو تم نے قتل کیا اور نفرت بھی تمہیں مجھ سے ہے؟ حیرت ہے!)

”بہرحال فائز صاحب، آپ اس گھر میں شفٹ ہوجائیں۔ میں تنویر صاحب کو مطلع کردوں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک دفعہ پھر بہت شکریہ میم۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ جیسے ذہن پچھلی باتوں میں الجھا تھا۔ ”کیا میں آپ کے ملازم افضل بابا کو ساتھ لے جاؤں؟ اس گھر کی چابی انہی کے پاس ہے۔“

”اچھا۔“ وہ حیران ہوئی۔ گردن موڑی تو افضل بابا چائے کی ٹرے اٹھائے چلے آرہے تھے۔

”بابا اس گھر کی چابی آپ کو کس نے دی؟“

”تنویر صاحب نے بھجوائی تھی بی بی۔“ بابا نے نگاہیں جھکائے ٹرے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”بہرحال آپ فائز صاحب کو لے جایئے گا اُدھر۔ میں چلتی ہوں مجھے کچھ کام ہے۔“ وہ اٹھ کر گھر کی سمت بڑھ گئی۔ فائز واپس بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں پارس پر جمی تھیں۔ جو اَب گھر کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

دفعتاً اندر سے فیروزہ مائی باہر آتی دکھائی دی۔ پارس آخری اسٹیپ پر تھی جب وہ اس کے سامنے آرکی۔ پارس نے خاموش مگر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ...... بات کرنی تھی مجھے۔“ فیروزہ مائی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”اگر شکیل کے بارے میں ہے تو مت کرنا۔“ وہ دبے دبے تنبیہی انداز میں بولی۔

”نہیں، نہیں میں تو سوچ رہی تھی شاپنگ کے لیے چلی جاؤں بازار، تم بھی چلوگی؟“

”نہیں۔ ویسے بھی افضل بابا مصروف ہے اور ڈرائیور چھٹی لے کر گیا ہے۔ پیدل جاسکتی ہو تو چلی جاؤ۔“ وہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ فیروزہ مائی نے تلملا کر اسے دیکھا پھر دور لان میں بیٹھے آدمی کو جسے اب افضل بابا چائے سرو کررہے تھے اور پیچ کر واپس ہولی۔

”بابا۔“ فائز نے پیالی اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے انہیں پکارا۔ وہ جی کہتے ہوئے سیدھے ہاتھ باندھے کھڑے ہوگئے۔

”یہ پارس، فیضان صاحب سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟“ وہ چائے کے گھونٹ بھرتا اتنی احتیاط سے بول رہا تھا کہ دور سے اس کے لب ہلتے بھی نہ نظر آتے۔

”مجھے نہیں معلوم فیضی بابو۔ جب کبھی آپ کا ذکر کروں تو اٹھ کر چلی جاتی ہیں بی بی یا خاموش ہوجاتی ہیں۔“ فائز نے کپ رکھا اور پُرسوچ نگاہوں سے بنگلے کی طرف دیکھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ مجھے پہچان گئی ہو؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں بابو۔“ بابا نے افسوس سے سر ہلایا۔

”حالانکہ غصہ مجھے اس پر ہونا چاہیے۔ وہ ہے بھائی کی قاتل۔“

”اللہ توبہ استغفار فیضی بیٹے، یہ بہت بڑا الزام ہے“ بابا نے بے حد دکھ سے کہا۔

”آپ کا بہت خیال رکھتی ہے شاید...... اسی لیے آپ اس کے خلاف کچھ نہیں بولتے۔ کیا بھائی جی کا سارا خیال اور فکر بھول گئے ہیں آپ؟“ وہ خفا ہوا۔

”بڑے صاحب کو کون بھول سکتا ہے مگر یہ لڑکی ...ن اچھی ہے۔ یہ کسی کا قتل نہیں کرسکتی، کبھی نہیں۔“ انہوں نے جیسے جھرجھری لی۔ فائز نے خشمگیں ...ہوں سے انہیں دیکھا۔

”یاد ہے آپ نے بتایا تھا کہ بھائی جی کے سر کے پچھلے حصے .... پر کسی نوکیلی چیز کا نشان تھا۔ ...ڑھیوں سے گرنے پر ایسا نشان کیسے پڑسکتا ہے؟“

”بیٹے وہ تو تھا مگر ہوسکتا ہے سیڑھیوں پر یا نیچے ...کچھ ایسا پڑا ہو جس پر وہ گر گئے ہوں۔ وہ رات تھی ...ی تو بہت خوف ناک اور یہ لڑکی اداکاری نہیں کررہی تھی۔“ بابا نے نفی میں سر ہلایا۔ سارا منظر ایک ...دہ پھر ان کی نگاہوں کے سامنے تازہ ہوگیا۔

”میں اس وقت برآمدے میں آیا تھا اندر سے ...ھ لے کر جب وہ مجھے آتی دکھائی دی......“ جب وہ ...دونوں پچھلے گھر کی سمت چلنے لگے تو راستے میں افضل ...با بتانے لگے۔ وہ منظر انہیں آج بھی یاد تھا۔ اپنی ...تمام تر جزئیات سمیت۔

دسمبر کی سفید رات، برفباری، بنگلے کی مخروطی ...چھت برف سے اٹی تھی۔ اردگرد پہاڑیاں بھی سفید ...تھیں۔ بنگلے کے سامنے سڑک شام کو ہی صاف کی گئی ...تھی سو وہ سرمئی دکھائی دیتی تھی۔ باقی ہر سو سفیدی تھی۔

اس وقت نرم نرم سی برف گررہی تھی جب ...افضل بابا جیکٹ ٹوپی اور مفلر میں لپٹے باہر برآمدے ...میں آئے۔ وہ جس کام سے آئے تھے ابھی وہ انجام

دینے کا سوچا ہی تھا کہ سامنے بڑے گیٹ سے وہ بھاگ کر آتی دکھائی دی۔

وہ گرتی پڑتی دوڑتی آرہی تھی۔ سیاہ لمبے اوور کوٹ میں ملبوس جس کی ہُڈ سر کی پشت پر گری تھی اور بالوں پر برف کے ذرات ٹھہرے تھے۔ وہ حواس باختہ تھی، گھبرائی ہوئی، پریشان، رو بھی رہی تھی۔

”افضل بابا...... افضل بابا......“ وہ جس طرح چلا چلا کر انہیں پکار رہی تھی، وہ سب بھول کر پریشانی سے اس کی طرف لپکے۔

”کیا ہوا بی بی؟“

”جلدی چلو، بڑے صاحب گر گئے ہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔“ وہ پھولے تنفس اور آنسوؤں کے درمیان تیز تیز بولتی فوراً پلٹی۔

”میں گاڑی کی چابی لے لوں۔“

”وہ میرے پاس ہے، کار وہیں کھڑی ہے۔ جلدی آئیں۔“ وہ آگے دوڑتی گئی۔ افضل بابا جانتے تھے کہ پارس کو ڈرائیونگ نہیں آتی۔ وہ جتنی تیزی سے چل سکتے تھے چلتے گئے۔

وہ سیڑھیاں برف سے اٹی تھیں۔ آخری سیڑھی سے ذرا دور رضوان حیات سر کے بل گرے پڑے تھے۔ ان کی جیکٹ کی ہُڈ ان کے سر پر ہی تھی اور خون ہُڈ سے بھی باہر ابل ابل کر سڑک اور برف پر بہہ رہا تھا یعنی زخم اتنا شدید تھا کہ ہُڈ میں بھی سوراخ ہوگیا تھا۔

”رضوان، آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔ بس ہم آپ کو اسپتال لے جائیں گے۔“ وہ جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑے انہیں سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ وہ رو بھی رہی تھی، بدحواس بھی تھی۔ افضل بابا نے دوسری طرف سے سہارا دیا۔

رضوان حیات کی آنکھیں اس وقت کھلی تھیں۔ ان میں ایک عجیب سی حیرت اور شاک تھا، استعجاب...... بے یقینی......

''پارس...... پارس......!'' وہ بار بار اس کا نام پکارتے۔ آواز مشکل سے نکل رہی تھی مگر اس میں بھی حیرانی تھی، بے یقینی تھی۔

☆......☆

''میں آخری وقت تک بڑے صاحب کے ساتھ تھا۔ انہوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا تھا۔ آخری سانسوں میں یا تو انہوں نے پارس بی بی کا نام لیا یا آپ کا۔'' وہ دونوں اب اس چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑے تھے اور افضل بابا بتا رہے تھے۔

''میرا......؟'' وہ چونکا۔ ''بھائی جی نے مجھے یاد کیا؟'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''جی...... بہت دفعہ فیضی، فیضی کہا۔ میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے اتنا سمجھ آیا کہ وہ پارس کو مخاطب کر کے آپ کا نام لیتے تھے۔ ایک دفعہ تو مجھے لگا کہ انہوں نے کہا ہے۔ ''فیضی سے کہنا......''

''کیا...... کیا کہنا؟'' اس کی تو گویا سانس رک گئی۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پارس بی بی ان کے قریب تھیں۔ انہوں نے ہی سنا تھا۔ وہ سمجھ کر سر ہلا رہی تھیں، رو بھی رہی تھیں۔'' فائز بالکل خاموش ہو گیا۔ پارس نے اس سے فیضان کا رابطہ نمبر بھی پوچھا تھا پھر جیسے ارادہ بدل دیا۔ ایسا کیا تھا جو بھائی جی نے فیضان کو کہنے کو کہا ہو اور وہ بتانا نہ چاہتی ہو؟ شاید انہوں نے ہوٹل آخری لمحات میں فیضان کے نام کر دیا ہو، شاید پارس کو اس کا خیال رکھنے کو کہا ہو۔ پتا نہیں وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔

''میں نہیں جانتا بڑے صاحب کو قتل کیا گیا ہے یا نہیں مگر پارس بی بی ایسا نہیں کر سکتیں۔'' گھر کا تالا کھولتے ہوئے افضل بابا کہہ رہے تھے۔ فائز نے جواب نہیں دیا اس کی پیشانی پہ پُرسوچ لکیروں کا جال بچھا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کی لابی میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کا سماں تھا۔ لوگوں کی چہل پہل، ویٹرز کا آنا جانا، ریسپشن ڈیسک کے پیچھے کھڑے سوٹڈ بوٹڈ افراد جو ہر ایک کو مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

ایسے میں وہ کاریڈور سے چل کر آتی دکھائی دی تو ریسپشنسٹ ذرا سے مستعد ہو گئے مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ چہرہ لیے، کانوں میں بالیاں، کندھوں پہ شال جو آگے لا کر بازوؤں پر اکٹھی کر کے ڈالی تھی۔ وہ چلتے ہوئے اپنے سے ایک قدم پیچھے آتے فائز کی بات سن رہی تھی۔

''میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں، عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔'' وہ ہاتھ میں ٹیبلیٹ پکڑے، سمجھانے والے انداز میں بولتا چلا آ رہا تھا۔ ''ہمارا ہوٹل مین سٹی سے تیس چالیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ آس پاس کوئی اچھا ہوٹل تک نہیں ہے صرف رہائشی بنگلے ہیں یا چند ایک شاپس اور ایک دو ڈھابے۔ ایسے میں سیاح کرتے یہ ہیں کہ دن بھر ہمارے ہوٹل کے وسیع وعریض لان، پول، کورٹس وغیرہ میں سیر کرتے ہیں، تصویریں بنواتے ہیں اور پھر ساتھ والے کسی ڈھابے پر لنچ کر کے یہ جا وہ جا۔ ایسے میں نقصان ہمارا ہو رہا ہے۔'' لابی کے ایک طرف لگے دو آمنے سامنے صوفوں میں سے ایک پر وہ بیٹھی اور اپنا پرس میز پر رکھا پھر اسے سر کے اثبات سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نشست سنبھالتے ہی کہنے لگا۔

''ہمیں اس خواہ مخواہ کے رش کو ذرا ڈسپلن کرنا ہوگا۔ لوگ جن کورٹس، پولز، لانز کی مفت میں سیر کرتے ہیں ان کی مینٹیننس پر ہم مہینے کا لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں اس لیے میرا ایک مشورہ ہے میم۔''

پارس نے میز پر رکھے پانی سے بھرے وائن گلاس کو اٹھایا اور لبوں سے لگایا۔ وہ خاموشی بھرے دھیان سے سن رہی تھی۔

''ہمیں ہوٹل اینٹری کا ٹکٹ رکھنا چاہیے۔ فی

فس چند سو روپے، یوں ہر چیز بیلنس ہو جائے گی۔''

پارس نے گلاس میز پر رکھا اور آنکھیں سکیڑے پُرسوچ انداز میں اسے دیکھا۔

''یہ تو کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والی بات ہوئی۔''

''کیا لوگ ہماری مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاتے؟ کیا یہ ethical ہے کہ آپ کسی ہوٹل میں جائیں، دو تین گھنٹے وہاں گھومیں پھریں اور پھر وہاں ایک پیسہ خرچ کیے بغیر واپس چلے جائیں؟ ہم بھی تو لوگوں کو زبردستی نکال نہیں سکتے۔''

''مگر صرف داخلے کا اتنا ٹیکس؟''

''میم، دیکھیں یہ ٹیکس ان کے کھانے کے بل میں ایڈجسٹ ہو جائے گا۔ ہم کہیں گے کہ جتنا آپ کا ٹیکس بن رہا ہے آپ اتنے کا کھانا فری کھا سکتے ہیں، سمپل۔''

''اوکے، اب آپ نے درست بات کی ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ فائز ذرا سا مسکرایا۔

''ایسا کرتے ہیں، میں......'' پارس بولتے بولتے رکی۔ ایک ویٹر اس کے قریب آیا اور جھک کر کہنے لگا۔

''یہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' ساتھ ہی اس نے ایک کارڈ پارس کے سامنے رکھا۔ اس نے اچنبھے سے کارڈ اٹھایا۔

''شجاع طاہر علی۔''

الفاظ پڑھ کر اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ جیسے سانس رک گئی ہو پھر اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔

''کدھر ہیں یہ صاحب؟'' اس نے دھیرے سے ویٹر سے پوچھا۔ اتنے آہستہ سے کہ فائز کو بمشکل سنائی دیا۔ وہ اب کسی بھی ڈیسنٹ آدمی کی طرح سر جھکائے بظاہر اپنے ٹیب پر کچھ کام کر رہا تھا۔

''اس طرف۔'' ویٹر نے ریسپشن پر کھڑے ایک گرے کوٹ والے شخص کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ پارس نے اس طرف دیکھا۔ اس شخص کی پشت تھی اس جانب۔ وہ بالکل ساکت سی ہوئی چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے پر اضطراب بکھرا۔

''انہیں بلا لیجیے۔'' ذرا بے چینی سے وہ بولی۔ ویٹر سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ پارس نے فائز کو دیکھا۔

''آپ کے وزیٹر ہیں تو میں ذرا ایڈمن بلاک سے اپنے کچھ پیپرز لے لوں۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پارس نے بے توجہی سے سر ہلا دیا۔ اس کا دھیان بٹ چکا تھا۔

فائز نے لابی سے نکلتے ہوئے غور سے ریسپشن پر کھڑے آدمی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ یادداشت میں محفوظ کیا اور آگے بڑھ گیا۔ ویٹر نے اس آدمی کے قریب جا کر کچھ کہا وہ سر ہلا کر مڑا اور پارس کی میز کی جانب دیکھا پھر نرمی سے مسکرا دیا۔

وہ گندمی رنگت کا خوش شکل سا آدمی تھا جس کی آنکھوں پر لگے فریم لیس گلاسز اس کے چہرے کی نرمی میں اضافہ کر رہے تھے۔

پارس مسکرائے بنا اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہوئی۔ گھونٹ بھر کر اسے واپس رکھا تو اندر موجود دو گھونٹ پانی ہولے ہولے ہلتا ساکت ہونے لگا۔ کن انکھیوں سے اسے وہ آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ لابی کافی وسیع وعریض تھی۔ درمیان میں نصب فوارہ، لوگ، میزیں، وہ ہر رکاوٹ کی سائڈ سے نکلتا اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ گھٹا رہا تھا۔

گلاس کا پانی اب ساکت ہو چکا تھا۔ شفاف مائع پر ابھی تک پارس کی آنکھیں جمی تھیں۔ کارڈ پر لکھے ایک نام نے پانی پر بہت سی تحریریں لکھنی شروع کر دی تھیں۔

ان دیکھی مگر ان مٹ تحریریں......

دروازہ دھیرے سے کھٹکا تھا۔ پہلے دو دفعہ ہلکی دستک پھر تیسری تیز دستک۔ وہ جو کتابیں کھولے صحن میں بیٹھی تھی چونک کر سر اٹھایا۔ یہ دستک وہ پہچانتی تھی۔اس نے کتاب پرے ہٹائی، ماتھے پر شکن لیے اٹھی۔ ایک نظر برآمدے کو دیکھا۔ اماں اور شکیل دوپہر سو کر گزار رہے تھے۔وہ دروازے پر آئی اور اسے کھولا۔

''کیا ہے؟'' اس نے اسی پُرشکن پیشانی کے ساتھ سوال کیا۔

''وہ......تائی سو رہی ہیں؟'' سامنے کھڑا لمبا تڑنگا مگر نرمی سے مسکراتا لڑکا ذرا جھجکا۔

''ہاں،اب بتاؤ کیا کام ہے؟'' وہ جلدی میں تھی اور بیزار بھی۔

''وہ صبح میں نے تمہیں گلی میں جاتے دیکھا تھا۔تم لنگڑا کر چل رہی تھیں۔'' وہ سر جھکائے جلدی، جلدی بولنے لگا۔ ''مجھے لگا تمہارے پاؤں میں زخم ہے پھر لگا کہ جوتا ٹوٹ گیا ہے۔''

''ہاں ٹوٹ گیا تھا جوتا، آگے بولو شجاع۔'' وہ کوفت سے بولی۔ ایک اسی کے آگے تو ساری بیزاری دکھائی جا سکتی تھی۔

''ہاں تو میں ابھی بازار جا رہا ہوں، جوتا دے دو موچی سے بنوا تا لاؤں گا۔''

''میں خود بنوا لوں گی، زیاد فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اب جاؤ، امی نے دیکھ لیا تو غصہ کریں گی۔'' وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

''دے دو ناں، میں بنوا تا لاؤں گا۔ساتھ میں ہی تو ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کہا ناں میں خود بنوا لوں گی، اب جاؤ۔''

اس نے ٹھک سے دروازہ بند کر دیا۔

یہ طے تھا کہ اسے زندگی میں کوئی تبدیلی چاہیے تھی نہ ہی تبدیلی لانے کی کوشش کرتا تھی۔اس نے خود کو پانی کے دھارے پر چھوڑ رکھا تھا...... پانی جو اب بھی گلاس میں ٹھہرا تھا۔

پارس نے نگاہیں اٹھا کر پھر دیکھا۔ شجاع فوارے کے ایک طرف سے نکل کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی درمیان میں بہت راستہ تھا۔ ابھی اسے فوارے کا آدھا چکر پاٹنا تھا۔

فوارہ، جس سے نکلتی پانی کی دھاریں اُبل اُبل کر حوض میں گر رہی تھیں۔ ان قطروں میں چہرے تھے۔ادھورے، ان مٹ چہرے......!

''تمہیں کس نے بولا تھا میرے لیے جوتے لانے کو؟'' اس نے چڑنے والے انداز میں پلاسٹک کے جوتوں کا تھیلا اس کے ہاتھوں میں واپس تھمایا۔

شجاع نے سر جھکا دیا۔

''میں نے آج صبح پھر دیکھا تم نے جوتا ٹھیک نہیں کروایا۔ تم تائی کی کھلی، پرانی جوتی پہن کر جا رہی تھیں۔''

''ہاں تو تمہیں کیا؟''

''مجھے اچھا نہیں لگتا پارو۔ میں تمہارے چچا کا بیٹا ہوں۔ ساتھ والے گھر میں رہتا ہوں۔ ایک جوتا بھی نہیں لا کر دے سکتا کیا؟'' اس کے انداز میں پھر بے بسی در آئی تھی۔

''نہیں...... مجھے کچھ لینا ہوگا تو اپنے پیسے سے لوں گی تمہاری خیرات نہیں چاہیے مجھے۔'' وہ چوکھٹ پر کھڑی دبے دبے غصے سے بول رہی تھی۔

اندر جمع ہوتے غصے کو اگر باہر نکلنے کے لیے صرف ایک ہی سوراخ ملے تو وہ پورے زور سے اسی جگہ سے نکلتا ہے اور پھر وہ نہیں دیکھتا کہ وہ کس پر گر رہا ہے۔ پارس اور شجاع کا بھی یہی معاملہ تھا۔

''اچھا سارے پیسے تو تم تائی کو دے دیتی ہو اپنے لیے کیا لوگی؟'' وہ بھی جیسے جرأت کرکے بول پڑا۔ پارس لمحے بھر کو چپ ہوگئی۔

''یہ جوتے رکھ لو جب تنخواہ ملے تو پیسے دے دینا۔''

''نہیں مجھے نہیں رکھنے۔ یہ مت سمجھنا کہ میرے

پاس پیسے نہیں ہیں۔ بہت پیسے ہیں مگر...... ہاں جب تنخواہ ملے گی تو میں تمہیں پیسے دوں گی، لے آنا کچھ بازار سے مگر میرے پیسوں کا، ہاں۔'' اس نے پھر سے دروازہ ٹھک سے بند کیا۔ منظر دھندلا گیا۔ اس دھند سے ایک اور دن، ایک اور پہر، ایک اور گھڑی طلوع ہوئی۔ دھند چھٹنے لگی۔ وہ چھت کی منڈیر کے ایک طرف کھڑی تنقیدی نظروں سے الٹ پلٹ کر ان چوڑی کے سائز کی سلور بالیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں پچاس روپے دیے تھے۔ یہ پچاس کی تو نہیں ہیں۔''

منڈیر کے اس طرف کھڑے شجاع کا رنگ پھیکا پڑا اس نے تھوک نگلا۔

''نہیں تو.... پورے پچاس روپے کی ہیں۔''

''نہیں، میں اس دن سلائی کے لیے لیس اور بٹن لینے گئی تھی صدر، وہاں بالکل ایسی بالیاں دیکھی تھیں مگر وہ سو روپے کی تھیں۔'' وہ شش و پنج میں پڑ کر نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''ہاں نہیں، یہ بھی ستر کی تھیں مگر میں نے بھاؤ تاؤ کر کے کم کروالی قیمت۔ تم نے بھاؤ تاؤ تھوڑی کیا ہوگا۔ ایک ہی دفعہ قیمت پوچھی ہوگی۔''

''ہاں یہ بھی ہے۔'' اس نے نیم رضامندی سے سر اثبات میں ہلا دیا پھر چھت کے دروازے کو دیکھا۔ ''اچھا اب تم جاؤ، امی نے دیکھا تو قیامت آجائے گی۔ مجھے بھی نہیں پسند یوں 'ملنا'، آئندہ کام ہو تو سیدھے دروازے سے آنا۔'' وہ دوٹوک کہہ کر بالیوں کا پیکٹ اٹھائے اندر کی طرف بھاگ گئی۔ شجاع نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں چمک تھی۔ فوارے کے چمکیلے پانی کی طرح ٹپ ٹپ گرتے قطرے ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

پارس نے اب کی بار نگاہیں اٹھائے بغیر محض کن انکھیوں سے جانچنا چاہا کہ وہ کتنا فاصلہ عبور کر چکا ہے۔ وہ اب میزوں کے اس طرف گلاس وال کے ساتھ ساتھ چلتا آرہا تھا۔ گلاس وال کے دوسری جانب ہوٹل کا کھلا سا شفاف نیلا چمکتا سوئمنگ پول تھا۔ وہ ایسا تھا جیسے مستطیل گڑھے میں نیلا کانچ بھر کر جما دیا ہو۔

نیلے کانچ میں بھی کہانیاں تھیں۔ ادھوری، ان مٹ کہانیاں......

وہ رات کے وقت چھت پر کرسی ڈالے بیٹھی تارے دیکھ رہی تھی۔ گردن کرسی کی پشت سے ٹکا کر، چہرہ آسمان کی طرف کر رکھا تھا۔ چوٹی پیچھے گری تھی اور بالیاں کانوں میں چمک رہی تھیں۔

''جہاں پورا سال نہیں پہنی تھیں بالیاں وہاں اب بھی نہ پہنتیں۔'' آواز پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ منڈیر پہ بازو رکھے کھڑے وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی پچھلی یادوں کی نسبت وہ اب خاصا.. پُراعتماد لگ رہا تھا۔ اور خود پارس کے چہرے پر نہ کلفت آئی نہ بیزاری۔ بس سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہے؟''

''اس ایک سال میں تین دفعہ تائی نے تمہاری الماری سے یہ بالیاں ڈھونڈ کر کوڑے میں پھینکی ہیں، ہر دفعہ اٹھا لاتی ہو واپس اور دھو کر سنبھال لیتی ہو۔ کیا یہ اس لیے ہے کہ انہیں میں لایا تھا؟''

پارس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

''مجھے لانے والے سے فرق نہیں پڑتا۔ اگر پڑتا ہے تو صرف اس بات سے کہ یہ میری وہ پہلی کمائی ہے جو میں نے خود پر خرچ کی ہے۔''

''اور شاید واحد بھی۔'' وہ اٹھ کر اندر جانے لگی جیسے بیٹھنا بیکار ہو۔

''میں برطانیہ جا رہا ہوں۔'' وہ ٹھنک کر رکی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔

''کیوں؟'' سیاہ آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔

''لوگ کیوں جاتے ہیں؟ پیسہ کمانے، گھر کے

حالات اچھے کرنے۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا سے کندھے اچکائے۔

''اچھی بات ہے، کرو گھر کے حالات اچھے... میں جاؤں اب؟''

''ایک منٹ سنو!'' وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر اب سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی۔ ''تم میرا انتظار کرو گی؟''

''نہیں۔'' وہاں تبدیلی کی کوئی خواہش نہ تھی۔

''اگر میں کہوں کہ کرنا تب بھی نہیں؟'' اسے جیسے دکھ ہوا۔

''نہیں، میرے پاس کرنے کو اور بھی بہت کام ہیں۔'' چند لمحے دونوں کے درمیان تاریک خاموشی چھائی رہی پھر وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

''میں خط لکھوں گا، فون بھی کروں گا۔ اماں تمہیں میرے خط ضرور دے گی۔''

''مت لکھنا، نہ ہی فون کرنا۔ اگر مجھے تمہارا انتظار کرنا ہوا تو مجھے خط یا فون کی ضرورت نہیں ہوگی۔ نہ کرنا ہوا تو تمہارے سارے خط، سارے فون بیکار۔''

''میں آؤں گا پارو، تمہارے لیے آؤں گا۔''

''بالکل ویسے ہی اگر تمہیں آنا ہوا تو آجاؤ گے اور جب آؤ گے تب کی تب دیکھی جائے گی، اللہ حافظ!'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے آخری بار دیکھا۔ وہ اپنی چھت کی منڈیر کے پیچھے کھڑا یاسیت سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

پارو کی آنکھوں میں پانی چمکا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا پھر اپنی بالیوں کو چھوا۔ پانی کا ایک قطرہ گال پر لڑھکا پھر دوسرا پھر تیسرا مگر چوتھا نہیں گر سکا۔ شعوری کوشش نہیں تھی۔ لاشعوری اسٹاپ لگ گیا تھا کہ جذبہ بس اتنا ہی تھا۔

نیلے کانچ پر سورج کی شعاعیں رقص کر رہی تھیں۔ وہ گلاس وال کے ساتھ چلتا ہوا اس کی میز کے سامنے آرکا۔ پارس نے سر اٹھایا۔ وہ نرمی سے مسکرا رہا تھا۔ وہ بدل گیا تھا۔ زیادہ خوش شکل ہو گیا تھا، کپڑے بھی اچھے تھے، سوٹ اور ڈریس شرٹ...... بہت امیر نہیں مگر ڈیسنٹ۔ وہ ہلکا سا مسکرائی، رسمی سی مسکراہٹ لیے جگہ سے اٹھی۔

''السلام علیکم، کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟''

شجاع کی مسکراہٹ لمحے بھر کو پھیکی پڑی پھر وہ دوبارہ سے مسکرایا اور سر جھٹکا۔

''کیا تم یہ پوچھنا چاہ رہی ہو کہ میں تمہیں جانتا ہوں یا نہیں، پارس؟''

''مسز رضوان حیات...... اور نہیں، آپ مجھے نہیں جانتے، بیٹھیے۔'' وہ ہاتھ سے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واپس بیٹھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ نفاست، تمکنت، اعتماد۔ شجاع نے جیسے تسلیم کرتے ہوئے سر کو اثبات میں خم دیا اور بیٹھ گیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ مجھے نہیں جانتیں مگر میں آپ کو جانتا ہوں، ہمیشہ سے۔''

پارس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''کتنا عجیب لگتا ہے ناں شجاع جب آپ کے ماضی سے کوئی اٹھ کر آپ کے سامنے آئے اور دعویٰ کرے کہ وہ آپ کو جانتا ہے۔ پتا ہے میں تو ہنس دیتی ہوں ایسے قرابت داروں پر۔'' وہ ہلکا سا ہنسی۔

''وہ کیسے ہمیں جان سکتے ہیں جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی برسوں کی خلیج حائل ہو چکی ہو۔ وقت اور وقت کے لگائے زخم، یہ جتنا بڑھتے جائیں اتنا ہی ماضی کے قرابت داروں سے آپ کو دور کر دیتے ہیں اور ہمارے درمیان تو آٹھ سال حائل ہیں اور پتا ہے شجاع، یہ خلیج نہیں ہے...... یہ تو خلا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔'' اپنی بات کہہ کر وہ پھر ذرا سا

مسکرائی۔ شجاع نے اسی نرم مسکراہٹ کے ساتھ سر ہولے سے جھٹکا۔

''مسز پارس، آپ اس خلا کے پار بھی ویسی ہی ہیں جیسا آپ کو ہونا چاہیے تھا۔ ان آٹھ سالوں میں، میں نے جتنی دفعہ بھی تمہارے بارے میں سوچا یہی لگا کہ اب تم ایسی ہوگی، بالکل ایسی ہی اور میں غلط نہ تھا۔''

''انسان بہت پیچیدہ مشین ہے۔ جتنا انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے اتنا کوئی دوسرا انسان اسے نہیں جان سکتا۔''

''یعنی میں اس دعوے سے پیچھے ہٹ جاؤں کہ میں آپ کو جانتا ہوں؟ ٹھیک ہے شاید اسی میں بہتری ہو۔'' پارس اسی طرح بے تاثر آنکھوں سے اسے دیکھتی، مسکرا رہی تھی۔

''سو شجاع، اب اتنے عرصے بعد اچانک کیسے آئے ہو؟'' فقرہ ختم کرتے ہی پارس نے گردن ہلائے بغیر، نگاہیں آگے پیچھے دوڑائیں۔ ہوٹل ریسپشن، لابی کی اونچی چھت، چاردیواری، باہر کے کھلے ہرے بھرے میدان، پول اور واپس اپنے پرس تک پھر نگاہیں اس کی طرف اٹھائیں اور مسکرائی۔ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک اداسی در آئی تھی۔

''نہیں پارس، میں ان چیزوں کے لیے نہیں آیا۔ جانتا ہوں کہ یہ ہوٹل اب تمہاری ملکیت ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک امیر بیوہ بن چکی ہو۔ یہ نہیں جانتا کہ تم نے رضوان حیات سے شادی کیوں کی تھی مگر میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''مل لیے؟'' اس کی مسکراہٹ سمٹی، شجاع اٹھ کھڑا ہوا۔

''تمہارے گھر کا ایڈریس ہے میرے پاس مگر تمہاری اجازت کے بغیر نہیں آنا چاہتا۔ تائی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اس بہانے۔''

''جب جی چاہے آؤ، میرے کزن ہو مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' پارس نے ہلکے سے ابرو اچکائے۔

''تھینکس۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی پارس کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ بے رحم مسکراہٹ کی جگہ سپاٹ سنجیدگی چھا گئی۔ آنکھوں میں البتہ لمحے بھر کو اضطراب جھلکا تھا پھر خاموشی...... سرد پن۔

وہ لابی سے نکل کر باہر چلا گیا تھا۔ پارس موبائل پر فائز کا نمبر ملانے لگی۔ اس کے انداز سے البتہ بے توجہی عیاں تھی۔

☆☆☆

افضل بابا نے پانی کی ٹونٹی بند کی۔ ڈھلی دیگچی سلیب پر رکھی مگ ٹوکری میں ڈالے اور صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اپنے خیال میں پلٹے کہ ایک دم ڈر گئے۔ سامنے فیضان کھڑا تھا۔ انہیں ڈرتے دیکھ کر مسکرایا۔

''سوری، میں نے آپ کو ڈرا دیا۔''

''نہیں، تم کب آئے؟'' وہ شرمندگی سے مسکرائے۔ ''بلکہ کیسے آئے؟''

''یہیں کچن کے پچھلے دروازے سے۔'' اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ افضل بابا نے پریشانی سے اسے دیکھا اور پھر لاؤنج میں کھلتے دروازے کو۔

''اس طرح تمہیں یہاں کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''میرے ٹیرس سے سب نظر آتا ہے۔ پارس نکل چکی ہے اور اس کی ماں بھی ساتھ ہی گئی ہے۔'' وہ بے فکر تھا۔

''ہاں، انہیں دفتر جانا تھا اور فیروزہ بیگم کو کہیں راستے میں اتارنا تھا۔'' افضل بابا پھر بھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ چہرے پر پریشانی ہنوز موجود تھی۔

''ان میں سے کوئی کسی بھی وقت آسکتا ہے۔''

''جانتا ہوں، میرا کام زیادہ لمبا نہیں ہے۔ پہلے مجھے بتائیں پارس کے اپنی ماں سے کیسے

تعلقات ہیں؟'' افضل بابا شش و پنج میں پڑ گئے۔

''ہاں ٹھیک ہیں، دونوں زیادہ بات نہیں کرتیں۔ ویسے وہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔''

''اچھا!'' وہ چونکا۔ ''بھائی جی کو پتا تھی یہ بات؟''

''ظاہر ہے۔'' افضل بابا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اب کھڑکی کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے تاکہ باہر سے کوئی آتا تو انہیں نظر آ جاتا۔

''بھائی جی سے اس کا کیسا رویہ تھا؟''

''بہت اچھا، دونوں میں بہت محبت تھی۔'' بابا کے لہجے میں نرمی گھل گئی جیسے ان دونوں سے زیادہ بابا کو ان سے محبت ہو۔ فائز نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''سب ڈراما ہے اس کا۔ بھائی جی کی موت کا سب سے زیادہ فائدہ پارس کو ہوا ہے۔ ان کا سب سے بڑا ہوٹل اس نے اپنے نام لکھوالیا ہے اور جانتے ہیں بھائی جی نے کراچی اور پنڈی والا ہوٹل بھی اس کے نام کر دیا تھا۔ یہ بات مجھے دو تین ماہ پہلے معلوم ہوئی ہے۔'' وہ دبے دبے غصے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ''پتا نہیں ایسا کیا جادو کیا اس نے بھائی جی پر کہ وہ اس پر سب لٹاتے گئے۔''

''وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے فیضی بیٹا۔''

''مجھے یقین نہیں ہے۔ مجھے کسی بات کا یقین نہیں ہے۔ میرے نزدیک وہ میرے بھائی کی قاتل ہے اور میں اپنے بھائی کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔''

''کیا کرو گے تم؟'' افضل بابا خوف زدہ نظر آنے لگے۔

''وہی جو اس نے بھائی جی کے ساتھ کیا۔'' وہ بے رحمی سے مسکرایا پھر سر جھٹکا۔ ''خیر آپ نے مجھے بتایا تھا کہ بھائی جی کے سر پر لگی چوٹ سے ان کی جیکٹ کی ہڈ بھی پھٹ گئی تھی۔'' افضل بابا نے بہ مشکل اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جو سمجھ رہے تھے کہ وہ صرف پارس سے متنفر ہے تو وہ غلط تھے۔ وہ تو برابر کا بدلہ چاہتا تھا۔

''وہ جیکٹ پارس نے سنبھال کر رکھی ہے، آپ نے بہت پہلے بتایا تھا؟''

''جی، ایک دن کمرے کی صفائی کرتے ہوئے مجھے وہ نظر آئی تھی۔''

''مجھے وہ جیکٹ چاہیے۔''

''فیضی بیٹا، اسے شک ہو گیا تو؟'' وہ مزید پریشان ہو گئے۔

''بے فکر رہیں بس دیکھ کر لوٹا دوں گا، ساتھ نہیں لے کر جاؤں گا۔''

''اچھا بیٹھو، لاتا ہوں۔'' وہ گومگو کیفیت میں سر ہلاتے اندر چلے گئے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سرسری نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ چند منٹ گزرے تو وہ آتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک پلاسٹک کا پیکٹ تھا جس میں ایک جیکٹ تہ کی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''جلدی سے دیکھ لو، وہ آ نہ جائے۔'' وہ تشویش سے کہتے ہوئے کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ فائز نے پیکٹ میز پر رکھ کر کھولا۔ جیکٹ نکالی۔ اس میں سے خون کی بُو ابھی تک نہیں گئی تھی۔ اسے جیسے کبھی دھویا نہیں گیا تھا۔ پیکٹ میں بند ہونے کی وجہ سے بُو بھی اندر ہی تھی۔

اس نے جیکٹ سیدھی کی۔ اس کی ہڈ درمیان سے پھٹی ہوئی تھی۔ سوراخ اخروٹ کے سائز کا تھا اور اس کے گرد خون کے واضح نشان تھے۔ اس نے ہڈ دیکھنے کے لیے جیکٹ کو اوپر اٹھایا تو کچھ نیچے گرا۔

چھن...... چھن...... چھن۔ افضل بابا اور فائز دونوں چونکے۔ جیکٹ کے اندر شیشے کا ایک ٹکڑا تھا جو فرش سے ٹکرایا مگر ٹوٹا نہیں۔ اس نے حیرت سے ٹکڑا اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ سرخ نہیں تھا یعنی جیکٹ کا خون خشک ہونے کے بعد اندر ڈالا گیا تھا۔ وہ دھندلا سا تھا۔ کس چیز کا حصہ تھا؟ کچھ کہا نہیں

جاسکتا تھا۔

''کیا یہ شیشہ ان کے سر میں لگا تھا مگر یہ تو......''

وہ حیرت میں پڑ گیا دفعتاً افضل بابا کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''فیروزہ بیگم آ گئیں، تم جاؤ جلدی۔'' وہ کرنٹ کھا کر اٹھا اور جیکٹ تہ کرنے لگا۔ افضل بابا نے تیزی سے روکا۔

''تم جاؤ میں کرلوں گا، بس جاؤ۔'' اس نے جیکٹ اور شیشہ وہیں چھوڑا پہلے متذبذب نگاہوں سے افضل بابا کو دیکھا پھر کھڑکی سے باہر جہاں فیروزہ بیگم لان کے اسٹیپس پر تھیں اور پارس پیچھے گیٹ پر تھی۔ وہ یقیناً سڑک کی سیڑھیاں دیکھنے کے لیے رکی ہوگی اسی لیے پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ افضل بابا نے جلدی جلدی پیکٹ میں سب ڈالا، اسے بند کیا اور اوپر چلے آئے۔ اس کی الماری میں وہ رکھ کر دونوں دروازے بند کر کے جب وہ کمرے سے نکلے تو پارس سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلتا دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرت ابھری اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''جھاڑ پونچھ صبح رہ گئی تھی آپ کے کمرے کی، وہی کر رہا تھا۔'' وہ مسکرا کر جلدی سے بتانے لگے۔ وہ ہوں کہہ کر سر ہلاتی اوپر زینے چڑھنے لگی۔

''بیٹی۔'' جب وہ ان کے ایک طرف سے ہو کر نکلنے لگی تو وہ بے اختیار پکار اٹھے۔

''جی۔'' پارس نے رک کر انہیں دیکھا۔ افضل بابا چند لمحے دکھ سے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں پھر بولے۔

''احتیاط کرنا۔''

''کس سے؟'' پارس ہلکا سا چونکی۔

''ہر کسی سے...... رضوان صاحب کے بعد تمہارے دشمن بہت سے بن گئے ہوں گے۔'' پارس اداسی سے مسکرائی۔

''بابا، اگر مجھے کسی سے خطرہ ہے کہ وہ مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ اور کوئی نہیں، صرف فیضان ہے، رضوان کا بھائی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' افضل بابا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ آنکھوں میں خوف اترا۔

''مگر فیضی تو...... امریکا میں ہے۔'' پارس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ ایک گہری نظر پھر ہلکا سا مسکرائی۔

''جانتی ہوں۔'' وہ اندر کی سمت بڑھ گئی۔

حریص انسان

جس دن سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے ضرورتوں کا حصار اس کے گرد وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ بعض ناگزیر ضرورتیں ہیں مگر حریص فرد اور حریص معاشرہ مادّی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہوا دیوانہ وار آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ایک اخلاقی گراوٹ اور رذالت کی وجہ سے اس میں سیکڑوں دوسری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حسد، بخل، قطع رحم، خیانت، بزدلی، بدگمانی اور عداوت کے شعلوں میں حریص انسان عمر بھر جھلستا رہتا ہے، اس کے دل کو سکون اور طمانیت کی دولت کبھی میسر نہیں آتی۔ یہ حرص و طمع کا جذبہ ہی ہے، جو ایک دوسرے کی جان لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''حرص سے بچو کیونکہ اس نے اگلوں کو دعوت دی کہ وہ بے گناہوں کا خون بہائیں، اس نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھیں۔''

اقتباس: از مضمون حرص و طمع، شہید حکیم محمد سعید
مرسلہ: فضہ بتول، اسلام آباد

افضل بابا کے قدم گویا زمین میں گڑ گئے۔

''جانتی ہوں'' ...... وہ کیا جانتی ہے؟

☆☆☆

رضوان حیات کے بنگلے کے عقبی طرف اونچا نیچا سا جنگل تھا۔ سروقد درخت، ویرانہ، خاموشی۔ دور کہیں جانور بولتے، پرندے چیختے تو زندگی کا گمان ہوتا ورنہ بس ایک جامد چپ سی تھی۔

صبح ابھی نیلے رنگ سے سفیدی میں تبدیلی کے ارتقا میں تھی۔ ہوا ٹھنڈی سی چل رہی تھی۔ فائز نے اپنے گھر کی اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانکا تو وہ ڈھلان اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ سیاہ شال اب کہ اس نے بکل ڈال کر اوڑھ رکھی تھی۔ ایسے کہ سینے پر لپٹے بازو شال کے اندر تھے۔ کولہا پوری چپل کے بجائے کینوس شوز پہنے اور بالوں کو ڈھیلے جوڑے میں باندھے وہ سر جھکائے چل رہی تھی۔ وہ یقیناً واک پر نکلی تھی۔ فائز ہلکا سا مسکرایا اور جھک کر جوگرز پہننے لگا پھر سیدھا ہو کر اس نے دوبارہ نیچے دیکھا۔

وہ جنگل کی طرف جارہی تھی۔ فائز نے ایک نگاہ اطراف میں دوڑائی جیسے اس تک پہنچنے کا متبادل مگر اتفاقیہ ٹکراؤ کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو پھر جیسے سمجھ کر مسکرا دیا۔ اسے لمبا چکر پڑتا تھا مگر ظاہر ہے وہ ایک ''اتفاق'' ہوگا۔

پارس کے کینوس شوز بنا چاپ پیدا کیے نیچے گرے پتوں کو روندتے چلے جارہے تھے۔ وہ زمین کو دیکھتی چل رہی تھی۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دور الجھا تھا۔ چلتے چلتے اب وہ جنگل کے اندر پہنچ چکی تھی۔ دفعتاً اونچے درختوں کے درمیان ایک جگہ وہ رکی، جوتے کی نوک سے پتے ہٹائے۔ ایک کاکروچ کی شکل کا کیڑا پتے کے نیچے سے نکل کر تیزی سے آگے جارہا تھا۔ پارس رک کر اس کیڑے کو دیکھنے لگی۔ وہ رینگتا ہوا اس سے دور جارہا تھا۔ وہ پنجوں کے بل زمین پر بیٹھی اور نگاہوں سے کیڑے کا تعاقب کرنے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اداسی تھی، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ بے حد اداس مسکراہٹ۔

درختوں کے پتے ہوا سے ذرا ذرا کھڑکنے لگے۔ ہلکی سرسراہٹ میں اس سے بھی ہلکی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ اَن مٹ کہانیاں پھر سے ہر جگہ چھانے لگی تھیں......

ہوٹل کی لابی میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ریسپشن ڈیسک کے پیچھے سیاہ لیڈیز سوٹ میں ملبوس کھڑی لڑکی مسکرا کر سب کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال کر بالوں کو کس کر جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

وہ بہت پیشہ ورانہ مہارت اور خوش اخلاقی سے سامنے کھڑے صاحب کو کچھ بتا رہی تھی جب لابی میں ایک غیر محسوس ہلچل مچی۔ ایک الرٹ سی کیفیت جو مہمانوں کو کبھی نہیں اور عملے کو ہمیشہ محسوس ہوجاتی تھی، تب جب باس قریب ہوتے۔

اس نے بھی بات ختم کرتے ہوئے ایک نظر کاریڈور کو دیکھا۔ رضوان حیات وہاں سے چلے آرہے تھے۔ ان کے عقب میں سیکریٹری اور بائیں طرف ایک اعلیٰ آفیشل تھے۔ مہربان صورت، سیاہ سفید مونچھیں، سرمئی کنپٹیاں وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر ساتھ والے صاحب کی بات سن رہے تھے۔

''پارس، باس از ہیئر۔'' لڑکی کے ساتھ کھڑا سوٹ میں ملبوس ریسپشنسٹ اس کا نام لے کر زیر لب بولا۔ وہ بھی ذرا زیادہ الرٹ سی کھڑی ہوگئی۔ ہمارا بڑا ہمیں دیکھ رہا ہے، یہ احساس ہی انسان کو سیدھا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

وہ چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ طاری کیے کھڑی کن انکھیوں سے رضوان حیات کو ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آفیسر سے بات کرتے کرتے ایک دم رکے، ان کی نگاہیں پارس کے اوپر ٹکیں، وہ یکا یک

معذرت کرتے تیزی سے اس طرف آئے۔ پارس نے بے اختیار اُن کو دیکھا اور مسکرائی۔

''خوش آمدید، مسٹر حیات۔'' مگر انہوں نے مسکرائے بنا ذرا ناراضی بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ریسپشن ڈیسک سے پین اٹھایا اور اس کی نوک سے پارس کی مانگ کے دائیں طرف چھوا، جیسے کچھ دھکیلا ہو۔

وہ ایک دم پیچھے ہوئی، ایک کاکروچ اُڑتا ہوا پیچھے رکھے بڑے سے گملے پر جا بیٹھا تھا۔ پارس نے بے اختیار اپنے بالوں کو چھوا اور پھر باس کو دیکھا۔ وہ برہمی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کے بالوں پر کاکروچ تھا مس اور آپ کو احساس تک نہیں ہوا؟''

''کوئی بات نہیں سر، میں اس سے تو بڑی ہی ہوں۔'' وہ بہت نرمی سے مسکرائی۔

''ناٹ فنی، لیڈی۔'' پھر انہوں نے پریشان کھڑے ساتھی لڑکے کو دیکھا۔ ''میٹرن کو بلاؤ، صفائی کے عملے کو بلاؤ۔ میرے ہوٹل کی لابی میں کیڑے کہاں سے آئے؟''

''یس سر۔'' وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا۔ پارس نے پلٹ کر گملے کو دیکھا۔ کاکروچ سکون سے ایک پتے پر چڑھا بیٹھا تھا۔

''سر یہ اِن ڈور پلانٹس ہیں مگر انہیں بھی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج جب دھوپ نکلی تھی تو گھنٹے بھر کے لیے انہیں باہر رکھا گیا تھا۔ یہ تبھی گملے پر چڑھ گیا ہوگا۔''

''آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ ہمارا صفائی کا عملہ اتنا بے پروا ہے کہ وہ اتنا بڑا کیڑا گملے میں نہیں دیکھ سکتا یا ہمارے ڈرین ہولز پر باقاعدہ اسپرے نہیں کیے جاتے۔''

''سر اسپرے بالکل کیے جاتے ہیں، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا...... رہی اس بے چارے کی بات تو یہ کاکروچ ہے سر۔ ہیروشیما اور ناگاساکی میں جب ایٹم بم برسائے گئے تھے تو وہاں کتنے انسان مر گئے جو بچے ان کی نسلیں تک معذور ہوگئیں مگر ایک چیز وہاں تب بھی اثر لیے بغیر مزے سے پھر رہی تھی۔'' وہ مسکرائی۔ ''کاکروچ! اب جس چیز کو امریکا کے ایٹم بم نہیں ختم کرسکے اسے اسپرے اور دوائیاں کہاں ختم کرسکتی ہیں سر۔'' وہ بہت پُرسکون، ٹھنڈے مگر مؤدب انداز میں کہہ رہی تھی۔

''آپ کو احساس ہے کہ ہمارے ہاں کون لوگ آتے ہیں، کس اعلیٰ پائے کے عہدیدار آتے ہیں، ملٹی نیشنلز آتی ہیں۔ اگر کوئی اس کاکروچ کو ہماری لابی کا فرش استعمال کرتے دیکھ لیتا تو؟'' وہ اسی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''سر یہاں تو ہمیں ساری زندگی ہمارے اپنے رشتے استعمال کرتے رہتے ہیں اگر ایک کیڑے نے ذرا سا فرش پر چل لیا تو کیا ہوا؟ اپنا دل بھی تو بار بار دھو لیتے ہیں ہم، فرش بھی دھل جائے گا۔'' پارس نے گہری سانس لے کر شانے ذرا سے اچکائے۔ وہ ہلکا سا چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ جب وہ کچھ دیر اور کچھ نہ بولے تو پارس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ اسے جیسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''سر، میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، میں فرزانہ میڈم سے کہہ دوں گی۔ سارے عملے کو پھر سے تنبیہہ ہوجائے گی۔ میری بات کو درگزر کردیجیے گا۔ مجھے ہوٹل یہاں کھڑے ہونے اور بڑی سے بڑی تلخ بات کو بھی خوش اخلاقی سے مٹا دینے کے پیسے دیتا ہے۔ میں بس اپنی جاب کررہی تھی۔'' وہ محض ایک نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ صفائی کا عملہ پہنچ گیا تھا۔ پریشانی، ہلچل، مگر رضوان حیات کچھ کہنے بنا جاچکے تھے۔ پارس کو ذرا سی فکر ہوئی پھر کندھے اچکا کر کام کرنے لگی۔

اس کے سامنے اچھلتے فوارے کا پانی ہنوز گر رہا

تھا۔ ہیروں کی طرح گرتے قطرے آہستہ آہستہ منظر مٹاتے گئے اور صفحے کو کورا کر دیا پھر اس سفیدی پر مٹے رنگ ابھرنے لگے۔

"دیکھ شکیل کو پیسے چاہیے ہیں۔ تو کسی بھی طرح تین لاکھ کا بندوبست کر۔" وہ کچن میں کھڑی سلیب صاف کر رہی تھی جب پیچھے سے فیروزہ مائی آکر بولی۔ اس نے جیسے تھکن سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بال پونی میں باندھے، سادہ شلوار قمیص اور سوئٹر میں ملبوس وہ تکان زدہ لگ رہی تھی۔

"امی، تم جانتی ہو میری نئی، نئی نوکری لگی ہے۔ مجھے اتنی جلدی ایڈوانس نہیں مل سکتا اور تین لاکھ تو ایڈوانس سے بھی اکٹھا نہیں ہوگا۔"

"مجھے باتیں نہ سنا پارو۔ تیرے بھائی کا تازہ تازہ کاروبار شروع ہوا ہے دبئی میں۔ اب پیسے نہیں دے گی تو برسوں کی محنت ضائع جائے گی۔"

"کون سی محنت؟" وہ واپس سلیب پر جھکتے ہوئے ہلکا سا بڑبڑائی۔ "پہلے غیر قانونی طور پر دبئی گیا وہاں پکڑا گیا، ضمانتوں کے پیسے بھرے وہ قرضے اترے نہیں کہ......"

"منہ میں مِن مِن نہ کر، دیکھ رہی ہوں میں تجھے جب سے مری آئی ہے بہت زبان چلنے لگی ہے تیری مگر یاد رکھ میرے ساتھ جھوٹ بولا ناں تو......"

"کون سا جھوٹ امی؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"اتنا قرضہ نہیں مل سکتا، خود کو گروی رکھ دوں کیا؟"

"زبان نہ چلا میرے آگے۔ بس مجھے اپنے باس وغیرہ کے پاس لے جا میں خود بات کرلوں گی۔"

"امی، خدا کا خوف کرو۔" وہ دہل گئی۔ "میں ہوٹل کی ایک معمولی ریسپشنسٹ ہوں۔ میں باس سے خصوصی ملاقات کا سوچ بھی نہیں سکتی کہاں یہ کہ آپ کو ساتھ لے جاؤں، ویسے بھی وہ یہاں نہیں ہوتے۔"

"مجھے سب پتا ہے یہ ہمارے آس پاس ہوٹل کا عملہ ہی رہتا ہے۔ سن لیا ہے میں نے کہ بڑے صاحب صبح سے اِدھر ہی ہیں اور فون بھی آگیا تھا ابھی تجھے رضوان صاحب نے بلایا ہے اپنے آفس۔ شام پانچ سے چھ بجے کے درمیان۔ بس میں تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔"

"مجھے بلایا ہے رضوان صاحب نے مگر کیوں؟" وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

"یہ ڈرامے کسی اور کے سامنے کر...... پانچ بجے تیار رہنا میں بھی ساتھ چلوں گی۔ وہ وائل کا نیلا جوڑا پہن لوں گی۔" وہ جیسے ہوش میں آئی۔

"نہیں امی پلیز، کیوں بے عزتی کرواتی ہو۔ انہوں نے مجھے ڈانٹنے کے لیے ہی بلایا ہوگا۔ خدا کے لیے میرے لیے اور مشکلیں کھڑی نہ کرو۔" وہ پریشان ہوگئی تھی۔ اسفنج، صابن سب رکھ دیا۔

"میں کچھ نہیں سن رہی۔ میں چل رہی ہوں تیرے ساتھ۔ دیکھنا وہ تجھے فوراً قرضہ دے دے گا۔" وہ حتمی لہجے میں کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ پارس بے بسی سے اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں متوقع توہین کے احساس سے پانی بھرنا شروع ہوگیا تھا۔

"اوہ میڈم آپ!" پھولی سانسوں کے درمیان آتی آواز۔ یادوں کا بلبلہ ٹوٹا بے رنگ پانی کے ساتھ رنگ فضا میں قطروں کی صورت بکھر گئے۔ پارس چونک کر پلٹی۔

وہ جنگل میں تھی۔ اس کے دائیں طرف سے فائز بھاگتا چلا آرہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، بال گیلے، چہرہ ورزش کی تمازت سے گلابی ہوتا ہوا۔ اس کے قریب آکر وہ رکا اور حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی اِدھر واک کرتی ہیں۔" پھر اس نے ذرا فکرمندی سے اسے دیکھا۔ "خیریت میم، آپ ٹھیک ہیں؟" پارس نے جواب دیے بنا اس سمت دیکھا جہاں وہ کیڑا ریگ رہا تھا۔ اب وہ اُدھر نہیں تھا۔ وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی جھینپ گئی۔

"ہاں، تھینکس۔ کچھ کھو گیا تھا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔" پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مگر ہر کھوئی چیز واپس نہیں ملتی۔ اپنے ہاتھوں سے کسی کو کھو دو تو وہ کبھی واپس نہیں ملتا۔"

فائز کے چہرے پر سایہ سا لہرایا، لب بھنچ گئے آنکھوں میں پتھراہٹ آگئی۔

"کیا اس نے ابھی اعترافِ جرم کیا ہے؟ اپنے ہاتھوں سے بھائی جی کو کھونے کا مطلب انہیں جان سے مارنا ہے؟" پارس اسے دیکھے بنا سست روی سے آگے چلنے لگی۔ وہ چہرے پر ڈھیروں سختی اور کرب لیے اس کے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔

"آپ نے کس کو کھو دیا؟" وہ دھیرے سے بولا حتی المقدور کوشش کی کہ آواز میں سرد پن نہ جھلکے مگر وہ اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرنے سے بہت دور تھی۔

"میں نے بہت کچھ کھویا ہے اور سب خود ہی کھویا ہے۔ سب میرا قصور تھا۔" وہ جیسے قدم کہیں اور اٹھا رہی تھی پڑ کہیں اور رہے تھے۔

"کیوں خود کو بلیم کر رہی ہیں؟ جو ہوتا ہے قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔"

"میں نے بہت کچھ گنوا دیا خود ہی۔ سب خود ہی کیا۔" وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ اپنے فارمل personna کو بھلائے وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ کسی ایسے مسافر کی طرح جو سب کچھ ہار کر ننگے پاؤں صحرا میں چل رہا ہو۔ جسے نہ پیاس ہو نہ منزل کو پانے کی چاہ......

فائز کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ آنکھوں کے سامنے ان گزرے برسوں میں بیتے بہت سے پل لہرائے۔ بھائی جی، اس کے باپ جیسے بھائی...... اور اس عورت نے خود ہی انہیں مار دیا، اپنے ہاتھوں سے اور کوئی اسے سزا نہیں دے گا؟ پارس آگے چل رہی تھی۔ وہ نامحسوس انداز میں جھکا اور جوگرز کے تسمے

جلدی جلدی کھول کر نکالے پھر ان کے درمیان گرہ لگائی اور سیدھا ہوگیا۔

"میڈم، آپ کو نہیں لگتا کہ آپ بے جا خود کو پریشان کر رہی ہیں؟" وہ اس کے عین عقب میں چل رہا تھا۔ لمبا تسمہ دونوں ہاتھوں میں لپیٹتے ہوئے اس کی پارس کی پشت کو دیکھتی آنکھیں نفرت سے بھری تھیں۔

"رضوان صاحب چلے گئے تو وہ اللہ کی مرضی تھی۔ اب بھی بہت کچھ ہے آپ کے پاس والدہ، خاندان والے، گھر، ہوٹل بہت کچھ۔" وہ اب اس کے بہت قریب تھا۔ صرف ذرا سے بازو آگے بڑھا کر تسمہ اس کی گردن کے گرد لپیٹ سکتا تھا۔

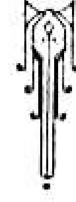
"پتا نہیں فائز صاحب، آپ نہیں سمجھ سکتے۔" وہ سر جھکائے بولی تو واضح ہوا کہ وہ اس کی اتنے نزدیک موجودگی سے بخوبی واقف تھی۔

"چیزیں حیثیت نہیں رکھتیں، انسان بھی نہیں رکھتے، اہم ہوتے ہیں رشتے جب ہم سے چیزیں چھین لی جائیں تو دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے مگر جب رشتے کھو جائیں تو دل ایسا ڈوبتا ہے کہ ابھر نہیں سکتا، سانس تک رک جاتی ہے پھر زندگی میں کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے بھی کچھ اچھا نہیں لگتا پارس بی بی۔ مجھ سے میرا باپ جیسا بھائی چھین لیا تم نے۔ تمہیں حساب دینا پڑے گا، لازماً۔" اس نے تسمے ہاتھوں میں ٹائٹ کرتے ہوئے سوچا اور بازو اونچے کیے۔ پارس ایک دم رک گئی۔ فائز کے ہاتھ فضا میں ہی ٹھہر گئے، سانس بھی ٹھہر گئی۔ پارس کی پشت ابھی تک اس کی طرف ہی تھی۔

کیا رضوان حیات کا قتل فیروزہ مائی نے کیا؟ کیا فیضان اپنے مشن میں کامیاب رہا؟ کیا پارس بھی اپنے منصوبے میں کامیاب رہی......؟ یہ سب جاننے کے لیے اختتامی حصہ ضرور پڑھیے مگر اگلے ماہ۔

مکمل ناول



پارس

نمرہ احمد

دوسرا حصہ



پارس کی ابھی تک اس کی طرف پشت تھی۔
''اوہ........ کاکروچ......!'' اس نے سر جھکائے، جوتے کی نوک سے پتے ہٹائے تو.... سرانے کی آواز آئی جیسے کوئی کیڑا تیزی سے آگے دوڑا ہو، وہ اداسی سے ہنسی۔ جنگل کے ویرانے میں اس کی ہنسی نے زندگی بھردی۔
''پتا ہے، میری اور رضوان کی پہلی بار ملاقات بھی ایک کاکروچ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

کہتی ہوئی پھر سے آگے بڑھنے لگی۔ ''رضوان...... آپ کیوں چلے گئے !''

فائز کے تسمہ لپیٹے ہاتھ ابھی تک فضا میں تھے، سانس بھی رکی ہوئی تھی۔ وہ اس کی دسترس سے دور ہونے لگی، تب بھی وہ نہیں ہلا، بھائی جی کا ذکر ہر شے پہ چھانے لگا۔کوئی منتر سا تھا جو وہ پھونک گئی تھی۔

''بہت اکیلا کر گئے ہیں وہ مجھے، یہ شکوہ ان سے ہمیشہ رہے گا۔'' وہ اب اس سے چند گز دور تھی۔ اس کی آواز ہلکی ہوگئی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں مڑی تھی، بس اپنی رو میں چلتی جارہی تھی۔

''حالانکہ جانے والا جان کر ساتھ نہیں چھوڑتا، پھر بھی شکوہ اسی سے ہوتا ہے، پتا نہیں کیوں...... فائز؟'' وہ جیسے اس کو اپنے عقب میں محسوس نہ کرتے ہوئے رکی اور دوبارہ ''فائز'' پکارتے ہوئے مڑی۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے جھک کر بظاہر جوتے کو ٹھیک کرنے لگا تھا۔

''کیا ہوا؟'' پارس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''کچھ چبھ گیا تھا، بس نکل آیا۔'' جوتے میں ایڑھی کی طرف انگلی ڈال کر کچھ نکالتے ہوئے وہ جبراً ذرا سا مسکرایا۔ پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا۔ گرہ بندھے تسمے پہلے ہی جیب میں ڈال چکا تھا۔

''ہوں......'' وہ سر ہلا کر واپس مڑ گئی اور اسی رفتار سے چلنے لگی جیسے اس کے ساتھ ملنے کا انتظار بھی نہ ہو جیسے ایک دفعہ بس رسماً پوچھا ہو۔ وہ اب جاگنگ کے بجائے شکست خوردہ سا دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ دوبارہ جیب میں پڑے تسمے کی طرف نہیں گیا تھا۔ جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا، بے بسی تھی، تذبذب بھی تھا اور مایوسی بھی۔

''آفس میں ملتے ہیں۔'' وہ اب بھی اس سے کافی آگے تھی۔ جب جنگل کے اختتام پہ رک کر مڑی پھر اس کا چہرہ بس لمحے بھر کے لیے دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ سر بھی نہ ہلا سکا۔ مسکرا بھی نہ سکا۔

''رضوان، آپ کیوں چلے گئے؟''

''رضوان، آپ کیوں......''

''رضوان......''

اگر وہ منتر تھا تو اس کا طلسم فائز کے پورے وجود پہ چھا رہا تھا اور اگر وہ جھوٹ کا جالا تھا تو وہ اس میں لپٹ جانے کو تیار تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کیا لگتا ہے، اگر وہ یہ الفاظ نہ کہتی تو تم اسے قتل کردیتے؟ میرا خیال ہے تب بھی تم ایسا نہ کرتے۔'' کافی کا کپ اٹھا کر گھونٹ بھرنے سے قبل تنویر صاحب نے بغور اسے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا اور پھر کپ لبوں سے لگایا۔

فائز کا کپ اس کے سامنے رکھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ دونوں تنویر صاحب کے آفس میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ تنویر صاحب گھونٹ بھرتے ہوئے اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، البتہ وہ الجھا الجھا سا اپنے کپ پہ نگاہیں جمائے، وہاں سے بہت دور لگ رہا تھا۔

''اگر وہ یہ نہ کہتی تو میں اس کا گلا واقعی دبا دیتا۔'' وہ لب بھینچے بولا۔ جیسے خود پہ غصہ آنے لگا ہو۔ تنویر صاحب نے بھی اڑانے والے انداز میں سر جھٹکا۔

''فیضی، ایسا نہیں ہوسکتا، تم بہت کچھ ہوسکتے ہو، قاتل نہیں...... اسے مار کر تمہیں کیا ملے گا؟''

''بھائی جی کا بدلہ...... اور ہوٹل......'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

تنویر صاحب نے کپ میز پہ رکھا، ٹیک لگائی اور آنکھیں سکیڑے غور سے اس کے تاثرات دیکھے۔

''فیضی تم مری اپنے بھائی جی کے لیے آئے ہو یا ہوٹل کے لیے؟''

فیضان چونکا پھر اپنے کو سنبھال کر سر جھٹکا۔

''آف کورس بھائی جی کے لیے، ہوٹل کی بات سے میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر ہوٹل بھی تو ہمارا ہے، پارس نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

''غلط، ہوٹل رضوان اپنی زندگی میں ہی پارس کے نام کرچکے تھے، قانونی طور پر وہ تمہارا نہیں ہے۔''

''مگر چھ میں سے تین ہوٹلز بھائی جی نے اس کے نام کردیے، ہم ان کے سگے بہن، بھائی تھے ساری زندگی ساتھ گزاری، اس جائداد کے اہل ہم تھے وہ نہیں۔'' اس کا چہرہ پھر سے تمتمانے لگا۔ ''وہ اداکارہ ہے، جادوگرنی ہے، اس نے بھائی جی کو نہ معلوم کس طرح ورغلا کر ہوٹلز اپنے نام لگوائے مگر وہ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی، ڈیم اٹ۔'' اس نے غصے سے مٹھی میز پر ماری، رہ رہ کر خود پہ تاؤ آرہا تھا۔

''کتنا اچھا موقع تھا، میں مار سکتا تھا اسے...... پھر اس کا گلا دبا کر لاش پہاڑی سے نیچے پھینک دیتا اور جیسے اس نے بھائی جی کا پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دیا تھا اس کا بھی نہیں ہونے دیتا مگر نہیں...... میں چھ فٹ کا آدمی اس کے ایک فقرے پہ ہار گیا۔'' وہ اٹھ کر بے چینی و طیش سے ٹہلنے لگا۔ ''ڈفیج کیا ہوگیا تھا مجھے آخر؟ کیوں بھول گیا میں کہ وہ میرے بھائی جی کی قاتل ہے، کیوں میں نے لمحے بھر کو اسے معاف کردیا...... آخر کیوں؟'' اس نے دیوار پہ مکا مارا...... تنویر صاحب نے تاسف سے سر جھٹکا۔

''اس ایک فقرے میں ایسا کیا خاص تھا جو تمہارا اتنا اٹل ارادہ بدل گیا فیضی؟'' اس نے کرب سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنکھیں موندیں۔ وہ اب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

''مان تھا اس میں، محبت تھی۔ جیسے وہ بھائی جی کو بہت مس کرتی ہو جیسے ان کے پاس جانا چاہتی ہو، بہت خالص لہجہ تھا اس کا۔'' اس نے آنکھیں کھولیں اور انہی زخمی نگاہوں سے تنویر صاحب کو دیکھا۔

''اور اس کے اس خلوص کے بعد تم دوبارہ سے کیوں سمجھنے لگے ہو کہ وہ رضوان کی قاتل ہے؟''

جواب میں بے بسی سے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''کیونکہ وہ خلوص، وہ مان، وہ لہجہ سب دکھاوا تھا، وہ اداکاری کررہی تھی اور میں اس کے فریب میں آگیا۔''

''صبح کی اس گھڑی، ویران جنگل میں اپنے فنانشل ایڈوائزر کے سامنے اسے اداکاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بالکل بھی الجھے ہوئے انداز میں سوال نہیں کررہے تھے بلکہ ان کا لہجہ بہت نپا تلا، بہت محتاط تھا۔ جیسے گرم لوہے کی تپش کا اندازہ لگانے کو احتیاط سے انگلی کی پور اس سے چھوؤ اور چھوتے ہی واپس کھینچ لو۔ جیسے گرم لوہے پہ ضرب لگانے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

''کیونکہ...... ڈیم اٹ...... کیونکہ میں اس کا فنانشل ایڈوائزر نہیں ہوں.. میں رضوان حیات کا اکلوتا بھائی ہوں اور یقیناً وہ یہ بات جانتی ہے۔'' اس نے شکست خوردہ انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ ''وہ میرے ساتھ کھیل، کھیل رہی ہے، وہ میرے اعصاب آزما رہی ہے، وہ یقیناً میری اصلیت جانتی ہے، وہ انتظار کررہی ہے کہ کب میں اس کے سامنے آجاؤں اور......''

''اور؟'' تنویر صاحب نے ابرو اٹھائی، گرم لوہے کو پھر ہلکا سا چھوا۔

''اور اس سے یہ کرسی چھین لوں، جس پہ بھائی جی مجھے بٹھانا چاہتے تھے۔'' وہ بے بسی و تنفر سے کہتا ان کے سامنے واپس آبیٹھا۔

''رضوان اس کرسی پہ تمہیں بٹھانا چاہتے تھے؟ آر یو شیور فیضی؟'' انہوں نے اس کی کافی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا کپ پھر سے اٹھا لیا۔

فائز نے جواب دینے کے لیے لب کھولے اور ساتھ ہی نگاہیں کافی کے کپ پہ گرائیں۔ جھاگ بیٹھ چکا تھا اور سطح پہ بچی کھچی کریم اور کڑوے مائع نے

عجیب ہیئت اختیار کر رکھی تھی۔ جیسے براؤن، پنک اور سفید ٹیڑھی میڑھی سڑکیں ہوں اور وہ واقعی سڑکیں ہی تو تھیں، گزرگاہیں جن پہ بہتے مائع کے ہر قطرے میں کوئی صبح، کوئی شام، کوئی رات چھپی تھی۔

یادوں کی گزرگاہیں......

رضوان حیات نے کافی کا گھونٹ بھرا اور اس کی ساری بات پر جیسے سر ہلاتے ہوئے کپ میز پر رکھا۔ قلموں کے سفید ہوتے بال، بارعب مونچھیں مگر آنکھوں میں چھایا ایک باوقار، مہربان اور مشفق سا تاثر۔ اسٹڈی کی بلائنڈز جو رضوان کے عقب میں تھیں، آدھی کھلی تھیں اور اُن سے چھن کر آتی روشنی، ان کے اطراف سے نکل رہی تھی۔ ایسے میں ان کا چہرہ مزید تاریکی میں چلا گیا تھا۔

مہربان سی تاریکی......

”آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“ اسٹڈی ٹیبل پر اُن کے مقابل، میز پر ہاتھ ملا کر رکھے آگے ہو کر بیٹھا فکرمند سا نوجوان بولا...... رضوان ہلکا سا مسکرائے۔

”تم ہوٹل سنبھالنا چاہتے ہو، اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لیے کیا ہوگی؟“ انہوں نے پیالی پرچ میں واپس رکھی...... کانچ سے کانچ ٹکرایا...... فکرمند نوجوان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے...... وہ بالآخر مسکرا دیا۔

”مجھے معلوم تھا کہ آپ خوش ہوں گے پھر کب سے کام شروع کروں میں؟“

”کل سے کر دو بے شک!“ وہ محبت سے مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔

”اوکے۔“ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

”مگر تم کس ہوٹل میں کام کرنا چاہو گے؟“ انہوں نے اپنی ادھوری چھوڑی فائل دوبارہ کھولی اور میز پر رکھی عینک آنکھوں پہ لگائی۔

”جانتا ہوں کہ مری والا ہوٹل آپ کا سب سے قیمتی ہوٹل ہے مگر پہلا ہوٹل اور ہیڈ برانچ تو لاہور والا ہی ہے ناں، اس لیے یہیں کام کرنا چاہوں گا۔ ویسے......“ وہ جیسے سوچنے کو رکا...... ”آپ سیٹھی صاحب کو کہاں ایڈجسٹ کریں گے؟“

رضوان نے عینک کے اوپر سے اسے حیرت سے دیکھا۔

”سیٹھی صاحب......؟ ہمارے لاہور والے ہوٹل کے جی ایم؟ کیوں، وہ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میرے آنے کے بعد تو انہیں کہیں بھیجنا ہی پڑے گا ناں......“ اس نے اب کے ریلیکسڈ انداز میں کہتے ہوئے میز پہ رکھا جار کھولا اور ایک کُکی نکالا۔

”کیوں...... تم تو فنانس ڈیپارٹمنٹ سے شروع کرو گے ناں؟ ان کا اس سے کیا تعلق......؟“

”شروع؟“ بسکٹ آدھا منہ میں تھا کہ وہ رک گیا۔ ”مجھے شروع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جی ایم کی سیٹ سنبھالنے کے لیے تیار ہوں، امریکا سے ڈگری لے آیا ہوں، اب مزید انتظار کیسا......؟“ اس نے جیسے اس بات کو احمق بچے کی بے وقوفی سمجھ کر اڑایا۔ رضوان نے عینک اتار کر میز پر رکھی...... فائل پرے کی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”فیضی...... تم ڈائریکٹ جی ایم کیسے بن سکتے ہو؟ پہلے دن کوئی بھی باس نہیں بن سکتا بیٹے...... نیچے سے شروع کرنا پڑتا ہے۔“

”آپ تو پہلے دن سے ہی اپنے ہوٹلز کے مالک تھے۔“ اس نے آدھا کترا بسکٹ واپس رکھا اور خفگی سے بولا۔

”میں پہلے ہی دن ایک سیون اسٹار ہوٹل کا مالک نہیں بن گیا تھا۔ پہلے دن میں ایک ڈھابے کا منیجر بنا تھا، اس جگہ آنے تک مجھے تیس سال لگے ہیں۔ ترقی آہستہ، آہستہ ہی ہوتی ہے۔“ رضوان نے گہری سانس بھری۔

”مجھے آپ کی success story نہیں سننی بھائی جی۔“ وہ جی بھر کر بیزار ہوا۔ ”مجھے بتائیں کہ میں کب جی ایم بن رہا ہوں۔“

”تم سے زیادہ قابل اور بہتر گریڈز والے لوگ ہمارے پاس سالوں سے کام کر رہے ہیں اور وہ ابھی تک اس عہدے پر بھی نہیں پہنچ سکے جس سے اوپر کا عہدہ تم مانگ رہے ہو......“

”ویل، سمپل! کیونکہ وہ رضوان حیات کے بھائی نہیں ہیں اور میں آپ کا بھائی ہوں۔“ کرسی سے ٹیک لگا کر اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے نوجوان کے انداز میں اب خودسری در آئی تھی۔

”یہ اپروچ درست نہیں ہے فیضی...... اس طرح تم ایک اچھے ہوٹلیئر نہیں بن سکتے اور تمہیں تو مجھ سے بھی آگے جانا ہے بیٹے۔“

”مطلب آپ مجھے جی ایم نہیں بنانا چاہتے؟“ اس کے ماتھے پر بل تھے، آنکھوں میں ناگواری......

رضوان نے تاسف و ملال سے اسے دیکھا۔

”بات میرے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں ہے، بات اصولوں کی ہے جنہیں لے کر میں ہمیشہ چلا ہوں اور اگر ان پر عمل نہ کرتا تو آج یہاں نہ پہنچ سکتا۔ میرٹ، میرٹ ہوتا ہے فیضی......“

”میں پڑھا لکھا ہوں، باہر کی ڈگری ہے، آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے یا تو میں جاہل، بے ایمان آدمی ہوتا تو آپ کہتے، مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ مجھے میری قابلیت کے باوجود آپ ہوٹل کیوں نہیں سنبھالنے دے رہے ہیں؟“

”ہوٹل تم نے ہی سنبھالنا ہے فیضی...... میرے کون سے بچے ہیں جن کے نام میں کچھ کر جاؤں گا۔“ اُن کی آنکھوں میں بے حد دکھ ابھرا...... فیضان نے ہونہہ کہہ کر رخ پھیر لیا۔

”اور اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم پہلے کام کا مشکل وقت گزارو، محنت کرو پھر اونچے لیول پر آؤ جو شخص ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کرنا چاہے وہ سب سے اونچے زینے پہ پہنچ تو جاتا ہے مگر آگے اسے خلا ملتا ہے۔ قدم قدم زینے چڑھو گے تو اوپر روشن راہداریاں ہی ملیں گی اور ان کو پانے کی خوشی بھی......“ وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”مطلب ابھی آپ مجھے اپنے شاندار ہوٹلز کے قابل ہی نہیں سمجھتے؟“ اس نے بدمزگی سے سر جھٹکا۔

”ارے، میں تو خوش ہوں کہ تم وہاں کام کرو گے، میں تو چاہتا ہوں تم کل سے کام سنبھال لو مگر......“

”مگر نچلے درجے کا کام......“ وہ طنزیہ بولا۔

”فیضی...... میں تمہیں چپڑاسی نہیں بھرتی کر رہا...... ایک اچھی پوسٹ دے رہا ہوں، تمہیں ترقیاں بھی جلد ملیں گی، تم شیئر ہولڈر بھی ہو گے، بہت جلد تم اس مقام پر......“

”جانے دیں...... مجھے تو لگتا ہے آپ مجھے اپنے بزنس میں شامل ہی نہیں کرنا چاہتے...... قبر میں ساتھ لے کر جانا ہے جیسے سب کچھ۔“ اٹھتے ہوئے آخری فقرہ وہ محض بڑبڑایا تھا مگر انہوں نے سن لیا تھا اور اُن کے چہرے پر زخمی تاثرات ابھرے...... آنکھوں میں گہرا ملال بھرا۔

”فیضی......“ انہوں نے اٹھتے ہوئے اسے پکارا مگر وہ سنے بغیر اسٹڈی سے نکل گیا۔ وہ آدھے کھڑے ہوتے ہوئے واپس بیٹھے۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر مسلتے انہوں نے سر سیٹ کی پشت سے لگایا آنکھوں میں چبھن سی تھی۔

دل کو مسلتا ہاتھ اب دھیرے دھیرے ٹھہر گیا تھا، بہت ضبط سے انہوں نے فائل واپس اٹھائی اور اسے دیکھنے لگے۔ عینک اٹھانا وہ بھول چکے تھے......

کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی، سڑکیں، گزرگاہیں، جھاگ، سب غائب ہو رہا تھا۔ وہ ذرا چونکا پھر تنویر صاحب کو دیکھا، وہ جواب کے انتظار میں تھے۔

”آف کورس، بھائی جی کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں ان کا بزنس سنبھالوں...... انہوں نے خود

مجھ سے یہ کہا تھا۔'' وہ بہت اعتماد سے بولا۔

''ظاہر ہے، تم ان کے بھائی تھے۔'' تنویر صاحب نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر آخری کڑوا گھونٹ بھرا...... تپش چیک کرکے وہ ہاتھ کھینچ چکے تھے۔

فائز بنا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا، باہر آکر وہ کاریڈور میں نہیں رکا اور اگر رکا تو پارس کے آفس کے سامنے......

شیشے کے دروازے سے وہ ایک کاغذ پہ کچھ لکھتی دکھائی دے رہی تھی۔ سر زرا تر چھا کیے، تیز تیز قلم چلاتی، وقفے وقفے کے بعد انگلی سے آگے پھسلنے والے بال پیچھے کرتی، وہ صبح کی اداس، کھوئی کھوئی لڑکی سے یکسر مختلف نظر آرہی تھی۔

فائز چند لمحے خاموش مگر سرد نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ پارس نے سر اٹھایا...... دونوں کی نگاہیں ملیں، فائز جبراً مسکرایا اور احتراماً سر کو جنبش دے کر واپس پلٹ گیا۔ پارس ایک نگاہِ غلط اس پر ڈال کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

فیروزہ مائی نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا...... کمرا خالی تھا البتہ بالکونی کا دروازہ نیم وا نظر آرہا تھا۔ وہ قدرے ہچکچائی، چہرے پر تذبذب و ہیجان کے آثار تھے پھر جی کڑا کرکے اندر چلی آئی۔

بالکونی میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر پارس بیٹھی دور پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نہ کچھ تلاش کر رہی تھیں نہ کہیں گم تھیں، وہ بس اداس تھیں۔

''پارو...... بات تو سن......'' فیروزہ مائی لہجے کو خوش اخلاق بناتی ساتھ والی کرسی پر آبیٹھی۔

''کیا بات ہے؟'' پارس نے نگاہوں کا رخ پھیرا اور اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

''دیکھ...... میں تیری ماں ہوں، کوئی حق ہے میرا تجھ پر، ہاں......'' وہ بہت مان، بہت استحقاق سے آگے کو ہو کر بیٹھی کہنے لگی۔

پارس اسی طرح ٹیک لگائے، سامنے دیکھتی رہی۔ شال کے اندر سینے پر لپٹے بازوؤں تک میں جنبش نہ کی۔

''اسی طرح میں شکیل کی بھی ماں ہوں، اس کی تکلیف بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

''تم صرف شکیل کی ماں ہو، امی۔''

''دیکھ، تو مجھ سے ناراض ہے، جانتی ہوں مگر میں نے ساری زندگی تیرا بہت خیال رکھا ہے، کیا تجھے یاد نہیں؟''

''مجھے کچھ بھولا ہی کب ہے؟ ہر چیز یاد ہے۔'' وہ تلخی سے مسکرائی۔

''تو پھر یہ بات بھی یاد ہوگی کہ آج اگر تو اس ہوٹل کی مالک ہے تو میری وجہ سے۔'' فیروزہ مائی کے لہجے سے خوش اخلاقی مفقود ہونے لگی اور اس کی جگہ دبے دبے غصے و بے بسی نے لے لی۔ ''یہ میں ہی تھی جس نے اس بڈھے سے تیرے لیے ہوٹل لکھوایا تھا مہر میں، یہ میں تھی جس نے تجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے، میرے احسان یاد رکھ پارو۔''

پارس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا...... اس کی نگاہیں دور پہاڑوں پہ جمی تھیں...... سرسبز پہاڑیاں، ان کے سروں کے گرد دائرے بنائے بادل، سرمئی آسمان...... خوب صورتی در خوب صورتی...... فسوں در فسوں...... راز در راز......

اس نے بیچ سے مانگ نکال کر گردن کے پیچھے جوڑا باندھ رکھا تھا۔ کانوں میں وہی بالیاں، سانولی پُرکشش رنگت پہ چھایا اضطراب، وہ سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ رضوان حیات نے نہ سمجھنے والی نظر اس پر ڈالی...... اور پھر اس کے ساتھ بہت استحقاق سے براجمان کرخت چہرے اور سونے کے ٹاپس والی عورت پہ جس نے سر پہ لیا دوپٹا کانوں

کے پیچھے اُڑس رکھا تھا۔

''مجھے یاد پڑتا ہے میں نے صرف آپ کو بلایا تھا مس......؟'' پارس نے ہراساں ہو کر یا اللہ پلکیں اٹھائیں، میز کے اس طرف اپنی پاور سیٹ پر بیٹھے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ آفس میں باہر کی ٹھنڈ کے برعکس، ہیٹر کی گرمائش اور آرام دہ ماحول تھا۔ بوجھ در بوجھ...... پارس کی پلکیں واپس گر گئیں۔

''بڑے صاحب...... میں خود ہی اس کے ساتھ چلی آئی، کام تھا جی مجھے آپ سے...... اب کوئی اور تو اس پورے ہوٹل میں میری بیٹی کی نہیں سنتا، سوچا آپ ہی سے بات کی جائے۔'' آخر میں فیروزہ مائی نے اداس سی آہ بھری۔

رضوان کی آنکھوں میں تشویش ابھری۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟ ہوٹل میں کچھ ہوا ہے؟'' انہوں نے پھر سے پارس کو دیکھتے ہوئے سوال کیا، اس کی ٹھوڑی مزید سینے سے جا لگی۔

''بہت بڑا مسئلہ آگیا ہے جی، اب آپ سے کیا چھپانا؟ بیٹی میری تو کچھ بتائے گی نہیں، میں ہی بتاتی ہوں۔'' فیروزہ مائی بہ عجلت بتانے لگی۔ ''میرا بیٹا شکیل، پارس کا اکلوتا بھائی...... (سر جھکائے بیٹھی پارس کی پیشانی پر بل پڑا) بہت مشکل میں آگیا ہے جی، عرصہ ہوا روزی کمانے دبئی گیا تھا، قرضے لے کر ٹکٹ کا آسرا ہوا تھا، اب اتنے برس میں قرضے کی ساری رقم جمع کی کہ اس آدمی کو واپس کرے کہ اس کے گھر کے راستے میں ڈاکوؤں نے پستول تان کر سب چھین لیا، ہم پر تو جی قیامت ٹوٹ پڑی۔ برسوں کی محنت پائی، پائی جوڑ کر جمع کی گئی رقم...... سب کچھ برباد ہوگیا۔'' فیروزہ مائی اب آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے بار بار اپنے نیلے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

''پولیس میں رپورٹ کروائی؟'' رضوان حیات سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ گاہے بگاہے ایک خاموش نگاہ پارس پر بھی ڈال لیتے۔

''کرائی ہے جی اس نے مگر زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا ناں، اسے بھی تو زخمی کر گئے تھے ڈاکو...... اب وہاں دیارِ غیر میں اکیلا بیمار پڑا ہے۔'' فیروزہ مائی کو جب لگا کہ وہ ہمدردی جگانے میں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئی تو کہانی میں ایک سب پلاٹ کا اضافہ کر دیا۔ پھر پُرامید نظروں سے رضوان صاحب کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہنوز سنجیدہ تھے۔

''کتنے پیسے تھے؟''

''پانچ لاکھ تھے جی۔'' انہیں کام کی بات پر آتا دیکھ کر وہ باقی ماندہ آنسو جلدی جلدی پونچھ کر کہنے لگی۔ ''آپ کی بڑی نوازش ہوگی صاحب، اگر آپ پارو کو اگلے پورے سال کی تنخواہ ایڈوانس اور کچھ اوپر قرض دے دیں، بس پانچ لاکھ چاہیے۔ ہم سارا قرض اتار دیں گے، ڈبل شفٹ کرے گی پارو۔''

''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں، اب آپ جا سکتی ہیں۔'' فیروزہ مائی کا چہرہ کھل اٹھا۔

''بہت بہت شکریہ...... بڑے صاحب۔'' وہ جانے کے لیے اٹھی، پارس بھی ساتھ ہی اٹھنے لگی۔

''آپ نہیں۔'' انہوں نے فقط اتنا کہا، پارس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہے تھے، اس کی پلکیں پھر گر گئیں وہ واپس بیٹھ گئی۔ فیروزہ مائی بنا پروا کیے باہر جا چکی تھی۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے پھر وہ سر جھکائے بہ مشکل ہمت مجتمع کرکے بولی۔

''سر، آئی ایم سوری، وہ زبردستی ساتھ آگئیں، میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی مگر......'' وہ مزید نہیں بول سکی۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔ احساسِ توہین، بے بسی کمزوری، بہت سی زنجیریں اسے جکڑے ہوئے تھیں۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ کی والدہ ساتھ آگئیں

ورنہ میں تو کبھی جان نہیں سکتا تھا کہ آپ اصل میں کون ہیں۔"

اس نے نگاہیں اٹھائیں، الفاظ سخت تھے مگر ان کا لہجہ اور چہرہ بہت پُرسکون اور نارمل تھا۔

"کیا وہ واقعی آپ تھیں جو کل لابی میں صفائی کے عملے کو ڈیفنڈ کرتے ہوئے کاکروچز کے بارے میں اظہارِ خیال کررہی تھیں؟ میں نے اپنے آفس میں آج جس لڑکی کو بلایا تھا، مجھے کہنے دیجیے کہ آپ وہ نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے متعلق میرے سارے اندازے غلط تھے۔" وہ حیران تھے، متعجب تھے، مگر غصے میں نہیں تھے۔ ان کا پُرسکون انداز پارس کے تنے ہوئے اعصاب کو مزید ٹینس کرگیا۔

"سر۔ جیسا کہ میں نے کل کہا تھا، مجھے ہوٹل جس کام کی تنخواہ دیتا ہے، میں کل وہی کررہی تھی۔ وہ میرا ڈیوٹی ٹائم تھا مگر اس وقت میرا ڈیوٹی ٹائم نہیں ہے، ابھی میں اپنی جاب نہیں کررہی۔"

"کیا انسان کی پوری شخصیت ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کے ساتھ ہی بدل جاتی ہے؟ اتنی زیادہ بدل جاتی ہے؟"

پارس نے گہری سانس باہر کو خارج کی، اس کی ندامت اور خجالت اب مدافعانہ انداز میں بدلنے لگی تھی۔ فیروزہ مائی جاچکی تھی اور اس کا اعتماد واپس آرہا تھا۔

"سر یہ منحصر ہے کہ انسان کن حالات سے گزر رہا ہے۔ آپ اس کو منافقت کا نام دینا چاہ رہے ہیں شاید، ٹھیک ہے...... مگر میں اسے مجبوری کا نام دوں گی۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا یہ کمزور اور ...... بے بس سا ایٹی ٹیوڈ صرف اپنی والدہ کی موجودگی میں تھا تو......؟" وہ محتاط انداز میں بولے۔

"تو میں کہوں گی کہ یہ ارادتاً نہیں، عادتاً تھا۔ کچھ لوگوں کے سامنے آپ کبھی آواز بلند نہیں کرسکتے۔"

"یہ ادب تھا یا محبت......؟"

"مجبوری تھی، سر......" اس نے نگاہ قدرے اعتماد سے سر اٹھا کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ "یہ منظر بہت دفعہ دُہرایا جاچکا ہے، سے اب تک، ہر تیسرے چوتھے مہینے اپنے employer کے سامنے بے عزت ہونا، قرضے کے لیے ہاتھ پھیلانا...... مگر بہت دفعہ کی دُہرائی کے باوجود بھی مجھے اس منظر کی عادت نہیں پڑی، ہر دفعہ اتنا ہی زیادہ باعثِ شرمندگی ہوتا ہے جتنا پہلی بار ہوا تھا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے قرضہ مت دیں، ہوسکے تو مجھے نوکری سے نکال دیں مگر یہ قرضہ مت دیجیے گا۔ سمجھیں کہ میری ماں آپ کے پاس آئی ہی نہیں تھی۔"

رضوان حیات نے خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

"میں جاؤں، سر؟" وہ اٹھتے ہوئے اجازت طلب کررہی تھی۔

"بی بی آج کھانے میں کیا پکانا ہے؟" افضل بابا کی آواز پر ماضی کا فسوں، خوب صورتی کا راز...... سب سرسبز پہاڑیوں میں بکھر گئے۔ اس نے دھیرے سے گردن موڑ کر چوکھٹ میں کھڑے افضل بابا کو دیکھا، جو جواب کے منتظر تھے، فیروزہ مائی کب کی جاچکی تھی۔

"کچھ بھی بنالیں یا فیروزہ بیگم سے پوچھ لیں۔"

"جی بہت بہتر......" وہ کہہ کر پلٹنے لگے مگر جیسے رکے، چہرے پر ہچکچاہٹ در آئی۔

"پارس بیٹی......" وہ رکے۔

"جی کہیے، کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کررہی ہے؟" پارس بغور اُن کا انداز دیکھ رہی تھی۔

"جی نہیں......" انہوں نے نفی میں سر ہلایا جیسے دُکھی بھی تھے مگر مجبور بھی تھے۔

"بس بڑے صاحب بہت یاد آتے ہیں۔" انہوں نے نم ہوتی آنکھیں رگڑیں۔ پارس ہلکا سا مسکرادی۔

"وہ بھولے ہی کب ہیں افضل بابا؟" بابا مزید کچھ کہے بغیر پلٹ گئے، پارس کی مسکراہٹ سمٹی، اس نے ذرا تشویش سے انہیں جاتے دیکھا۔ کچھ تھا جو افضل بابا کو پریشان کررہا تھا۔

☆☆☆

آفس میں معمول کا آرام دہ ماحول تھا۔ گلاس ڈورز کے اس پار پارس اپنی پاور سیٹ پہ بیٹھی، لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال دونوں کندھوں اور کمر کو ڈھانپے ہوئے تھے، آنکھوں میں وہی سپاٹ پن اور سنجیدگی تھی جو اس کا خاصہ تھا۔

دفعتاً انٹرکام کی گھنٹی بجی...... اس نے مصروف سے انداز میں اسکرین کو ہی دیکھتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔

"یس......؟"

"میم، میں ریسپشن سے فضہ بات کررہی ہوں۔"

"فضہ، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ماسوائے کسی بہت اہم کام کے آپ مجھے ڈسٹرب نہیں کریں گی؟" اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"آئی ایم سوری میم...... مگر ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، شجاع طاہر علی، کیا میں اُن کو آپ کے بلاک میں بھیج دوں؟"

پارس کی آنکھوں میں اضطراب در آیا۔ بھویں سکڑ گئیں۔ بے اختیار اس نے دانت سے نچلا ہونٹ کاٹا۔

"جی بھیج دیں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات تھے۔ چند لمحے وہ مضطرب سی بیٹھی رہی پھر فون اٹھایا۔

اس کے گلاس ڈورز کے باہر ڈیسک پہ بیٹھی سیکرٹری کا انٹرکام بجا، اس نے پھرتی سے ریسیور کان سے لگایا۔

"یس میم۔"

"ابھی شجاع طاہر نام کے ایک صاحب آئیں گے، انہیں اپنے پاس روکے رکھیے گا اور جب تک میں نہ کہوں، اندر مت بھیجے گا۔ کیا میری بات آپ کو سمجھ آگئی ہے؟" سیکرٹری نے دروازے کے پار پارس کو دیکھا۔ جو اسے ہی دیکھ رہی تھی پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"جی بالکل، میم......!"

پارس نے ریسیور واپس رکھا اور لیپ ٹاپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر رخ موڑ لیا، یوں کہ باہر سے اس کی کرسی

تمھیں کیا معلوم

بات بے بات ہنسنے والو
تمہیں کیا معلوم
اندر کی گھٹن کیا ہوتی ہے
سطحِ آب کی لہریں گننے والو
تم کیا سمجھو گہرائی کیا ہوتی ہے؟
اپنی آنکھوں کو ثروت کی تیز چمک سے چکا چوند کرنے والے
بھوکے لوگو......! تمہیں کیا معلوم بھوک کیا ہوتی ہے
زندگی کو ارزاں کہنے والے
ناشکرے لوگو! تمہیں کیا معلوم، زندگی کی قیمت
موت کی تلخی کیا ہوتی ہے، سانس کی ڈوری کیا ہوتی ہے
راتوں کو گہری نیند سونے والے
رت جگوں کی نفرت میں
کتنا کرب ہوتا ہے
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو

مرسلہ: سامعہ تبسم
کلام: سعد اللہ شاہ

اورسر کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ اسکرین کو دیکھتی اپنی ٹائپنگ کا سلسلہ وہیں سے جوڑنے لگی جہاں سے ٹوٹا تھا مگراب ارتکاز بھی ٹوٹ چکا تھا۔

وہ جس طرح بیٹھی تھی، یہاں سے اُسے دیوار سے لگا بک شیلف سامنے دکھائی دیتا تھا (اگر وہ سامنے رخ کر کے بیٹھتی تو یہ بک شیلف اس کی پشت پہ ہوتا) بک شیلف کے چمکتے شیشے میں باہر سیکرٹری بیٹھی نظر آرہی تھی۔ البتہ باہر سے دیکھنے پہ پارس کا عکس نظر نہیں آتا تھا۔

پارس نے دوبارہ ٹائپ کرنے کی کوشش کی مگر چہرے پر در آئی ہیجانی کیفیت، اضطراب، دبا دبا سا غصہ، ناگواری...... یہ سب جذبات مل کر جیسے اسے کام نہیں کرنے دے رہے تھے، وہ لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پر انگلی پھیرتی بے توجہی سے اِدھراُدھر کی چیزیں دیکھنے لگی۔

قریباً دس منٹ گزرے یا شاید پندرہ، جب اسے شیشے میں جھلکتے عکس میں وہ آتا دکھائی دیا۔ ایڈمن بلاک ہوٹل کے ریسپشن والے پہلے بلاک سے خاصا دور تھا۔ پارس نے نظریں اسکرین پہ ہی رکھیں البتہ کن انکھیوں سے اسے باہر کا سارا منظر نامہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہلکا کیمل کلر کا سوٹ بنا ٹائی کے، آنکھوں کو دھیما تاثر دیتے گلاسز وہ سیکرٹری کی میز کو نظر انداز کیے، نرم مسکراہٹ لبوں پر لیے سیدھا پارس کے آفس کی طرف بڑھا۔ بظاہر اسکرین کو دیکھتی پارس کے اعصاب تن گئے مگر وہ آدھے رستے میں تھا جب سیکریٹری کھڑی ہوئی۔

''سر، پلیز آپ اندر نہیں جاسکتے، میڈم مصروف ہیں۔'' شجاع رکا اور حیرت سے اسے دیکھا۔

''مگر ریسپشن پہ مجھے کہا گیا تھا کہ میں آسکتا ہوں۔''

''جی سر، آپ میڈم کا انتظار کرسکتے ہیں، وہ جب فارغ ہوں گی آپ کو بلالیں گی، بیٹھیے۔'' وہ سامنے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خود بھی واپس بیٹھی۔ شجاع نے تذبذب سے شیشے کے بند دروازوں کے پار دِکھتی اس کی کرسی کی پشت کو دیکھا، پھر سست روی سے کرسی کھینچی۔

''آپ پلیز انہیں مطلع کردیجیے کہ شجاع طاہر علی آئے ہیں۔''

''سر، اُن کو مطلع کیا جاچکا ہے مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، وہ بے حد مصروف ہیں اور ان کا آرڈر ہے کہ جو کوئی بھی ہو، انتظار کرے۔'' پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتی وہ واپس کی بورڈ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

شجاع نے اچنبھے سے دوبارہ پارس کی سمت دیکھا پھر کلائی پر بندھی گھڑی کو اور پھر گہری سانس لے کر جیسے انتظار کرنے لگا۔

پارس کے تنے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے تھے۔ وہ کن انکھیوں سے مسلسل باہر بیٹھے شجاع پہ نظر رکھے، بظاہر پھر سے کام میں مصروف ہوگئی۔ اب کہ اس کو زیادہ تگ ودو نہیں کرنی پڑی اور جلد ہی ذہن کام پہ دوبارہ فوکس کرنے لگا۔

fear of unknown جب تک سامنے نہ آئے، انسان یونہی منظر بدلتا ہے۔ ایک دفعہ سامنا کرلو تو پتا چلتا ہے کہ وہ تو صرف ہوا کا جھونکا تھا، جس کی دور سے آتی آواز ڈراتی ہے، غراتی ہے مگر نہ اس کا کوئی وزن ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی زور۔

اس کے کی بورڈ پہ چلتے ہاتھ تیز ہوگئے تھے، وہ اب پہلے سے بہتر توجہ کے ساتھ کام کررہی تھی۔ البتہ گاہے بہ گاہے بک شیلف کے شیشے میں جھلکتا عکس بھی دیکھ لیتی۔

کتابوں کے اوپر چھپا وہ منظر ویسا ہی تھا۔ وہ بہت بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کی تصویر ہے جو قطار در قطار کتابوں کے اوپر کسی وال موار ال کی طرح چسپاں ہے۔

پارس کا ذہن پھر بھٹکنے لگا۔ ایک کتاب سے دوسری...... دائیں سے بائیں بھوری، سیاہ، سبز، سرخ جلدیں...... سنہرے رنگوں سے لکھے ٹائٹل، ان دیکھی سیاہی سے لکھی اَن مٹ کہانیاں......

اس کی آنکھوں کے سامنے یادوں کا روڈ میپ، اپنے تمام تر سائن بورڈز کے ساتھ پھیلنے لگا......

''پارو...... پارو......'' وہ اس نیم روشن کمرے کے کونے میں میز ڈالے، کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی، بھوری، سیاہ، سرخ جلد والی کورس کی کتابیں ٹیبل پر جا بجا، زرد لیمپ لیے بالوں کی چوٹی بنائے، سر جھکائے وہ نہ جانے کب سے قلم چلا رہی تھی جب باہر سے رافعہ اسے پکارتی اندر آئی۔

پارس نے آنکھیں ملیں تکان اتارنے کی ناکافی سعی، جھولتی لٹ بالی والے کان کے پیچھے اُڑسی اور پلٹ کر دیکھا۔ شجاع کی تیسرے نمبر کی بہن رافعہ دروازے میں کھڑی تھی۔

''ہاں رافعہ کیسی ہو؟'' وہ زبردستی ذرا سی مسکرائی۔

''بالکل ٹھیک، پتا ہے، بھائی پہنچ گیا برطانیہ......'' اس نے دوسری سانس ہی نہیں لی اور ''نئی خبر'' اگل کر میز کے کنارے پر آٹکی۔

''اچھا...... اچھی بات ہے۔'' اس کی جبری مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ آنکھوں میں مبہم سا تاثر تھا جیسے معلوم نہ ہو کہ اسے خوش ہونا چاہیے یا ناخوش......

''آج صبح پہنچا ہے، بس ایک منٹ کی کال کی، جلدی جلدی خیریت بتائی اور ہم سب کی خیریت پوچھی اور فون بند کردیا۔ ہاں تمہارا بھی پوچھا تھا۔''

''ہوں......'' وہ سر ہلا کر اپنے کھلے رجسٹر کو دیکھنے لگی۔ رافعہ بے نیازی سے بولے جارہی تھی۔

''پتا ہے وہاں بہت اونچی، اونچی عمارتیں ہوتی ہیں، بھائی تو بڑا خوش ہے، کہہ رہا تھا کہ آرام سے سیٹل ہوجائے پھر خط لکھے گا اور فون بھی کرے گا۔ پیسے بھی وافر بھیجے گا۔ ہمارے تو دن پھر جائیں گے۔''

''آمین......!'' وہ رجسٹر کے صفحے کا کنارہ مروڑنے لگی جیسے رافعہ سے نگاہ نہ ملانا چاہتی ہو۔ جیسے اندیشہ ہو کہ اس کی نگاہوں کا تاثر تک وہ نوٹ کر کے بھائی کو بتائے گی۔

روشنی

حضرت ابراہیم تیمیؒ نے موسیٰ بن تیران کو اُن کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سلوک کے بارے میں سوال کیا۔

انہوں نے جواب دیا۔ ''جب سے مرا ہوں، اُمرا کی ضیافتوں کا جواب دے رہا ہوں اور ایک سوئی کے بدلے قید میں ہوں، جو میں نے مستعار لی تھی اور واپس نہیں کی تھی۔'' پھر میں نے دریافت کیا۔ ''کون سی قبروں میں روشنی ہے؟'' آپ نے فرمایا۔ ''دنیا میں مصیبت زدگان کی قبروں میں روشنی ہے۔''

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

''اماں کہہ رہی تھی، پہلے گھر کا پلستر کروائیں گے۔ پھر نیا سامان ڈلوائیں گے، اوپر کا پورشن بھی نیا بنوانا ہے، بھائی کی جب شادی کریں گے تب تک وہ پورشن لش پش تیار ہوگا۔ ہائے پتا نہیں اب بھائی کسی گوری کو بیاہ نہ لائے۔ ویسے لے بھی آئے تو کوئی حرج تو نہیں۔ ہماری تو پورے محلے میں ٹور بن جائے گی۔''

''آہو......! جیسے گوریاں تو انتظار میں تھیں ناں کہ کب تیرا غریب، سوکھا سڑا بھائی غیر قانونی طریقے سے اُدھر آئے اور وہ اس پر قبضہ کرلیں۔'' فیروزہ مائی نے گزرتے ہوئے سن لیا اور دروازے سے گردن نکال کر تبصرہ کرتی یہ جا وہ جا۔

پارس نے قدرے گڑ بڑا کر رافعہ کو دیکھا مگر اس نے تنفر سے ہونہہ کر کے سر جھٹکا۔

''لوگوں سے بھی ناں کسی کی خوشحالی ہضم نہیں ہوتی۔ جل ککڑے نہ ہوں تو۔'' وہ پارس پہ ایک گہری نظر ڈال کر بولی جیسے زیرِ عتاب صرف فیروزہ تائی نہ ہو بلکہ پارس بھی ہو۔

"فکر نہ کرو، انشاء اللہ سب اچھا ہو جائے گا۔" وہ نرمی سے بولی۔ رافعہ کے لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ امڈ آئی۔

"ابھی تم دیکھنا، ہمارے دن کیسے پھرتے ہیں، جب نیا ٹی وی لے کر آئیں گے تو سارے ایرے غیرے ہمارے دروازے پر کھڑے ہوں گے، ڈرامے کے وقت، پر اب تو میں اِدھر کسی کو منہ بھی نہیں لگاؤں گی، ہونہہ...... جلتے ہیں سب۔" وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔

بک شیلف پہ ابھرے عکس میں ہلچل مچی تھی۔ پارس نے چونک کر دیکھا۔ باہر فائز آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک فائل کھولے مصروف سے انداز میں چلتا ہوا اس سے پہلے کہ وہ اندر آتا، سیکریٹری نے اسے روک دیا اور وہی کچھ کہا جو وہ منتظر بیٹھے پہلے ملاقاتی کو کہہ چکی تھی۔ فائز ذرا حیران ہوا پھر اس نے کچھ کہا جس پر سیکریٹری نے انٹر کام اٹھایا۔

"جی......؟" پارس نے بزر بجنے پر ریسیور کان سے لگایا۔

"فائز صاحب کو کچھ ڈاکومنٹس پہ......"

"انہیں بھیج دیں۔" اس نے یہ کہہ ریسیور رکھ دیا۔ سیکریٹری نے سر ہلایا، فائز دروازہ کھول کر اندر آیا۔ شجاع کے چہرے پر الجھن تھی مگر وہ بیٹھا رہا۔

پارس اپنی گھومنے والی کرسی پر مڑی اور یوں چہرہ سامنے کو ہوا۔ باہر شجاع نے امید افزا نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ذرا سا آگے کو ہوا مگر وہ فائز کی طرف متوجہ تھی جو میز پر جھکا کھڑا، اس کے آگے فائل رکھ رہا تھا۔

"میم، میں نے اسے ریویو کر لیا ہے، آپ دستخط کر دیں۔" پارس نے ہولڈر سے سبز پین نکالا اور ایک کے بعد ایک دستخط کرنے لگی۔ فائز نے جھکے جھکے پارس کا چہرہ غور سے دیکھا پھر پیچھے مڑ کر شجاع کو پھر دوبارہ پارس کو۔

"میم، آپ مصروف تھیں، شاید مس سعید نے آپ کو آگاہ نہیں کیا، آپ کے کزن شجاع آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ریسیپشن پر بتایا تھا کہ وہ آپ کے کزن ہیں، کیا میں جاتے ہوئے انہیں اندر بھیج دوں؟"

دستخط کرتا ہوا پارس کا ہاتھ رکا، اس نے نگاہیں اٹھا کر فائز کو دیکھا، خاموش مگر گھورتی ہوئی نظر......

"سوری میم!" وہ گڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھوں...... سحر اور جلال...... فائز نے سر جھکا دیا۔ پارس دوبارہ دستخط کرنے لگی۔

"تھینکس......" کام ختم ہوا، فائز نے فائل اٹھائی اور نگاہ ملائے بغیر باہر نکل گیا۔ البتہ جاتے ہوئے اس نے ایک گہری نظر شجاع پر ضرور ڈالی تھی۔

پارس دوبارہ ٹائپنگ جاری کرتی مگر اس دوران فون آ گیا۔ اسے ہوٹل کے ایک رہائشی بلاک کا وزٹ کرنا تھا، وہاں تعمیراتی کام جاری تھا اور اسے کچھ تبدیلی کرنی تھی۔ وہ اپنا پرس، فون اور گلاسز اٹھائے اپنے آفس سے باہر نکلی۔ گلاسز گریبان میں اٹکاتے ہوئے اس نے باہر بیٹھے شجاع کو دیکھا جو فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جی شجاع، آپ اِدھر کیسے...... خیریت؟" سپاٹ سنجیدہ لہجے میں وہ بولی۔ جیسے لمحے بھر کو رکی ہو اور جانے کی جلدی ہو۔

"جی میں...... آپ سے ملنے......" پون گھنٹے کے انتظار نے اس کو کافی ڈل کر دیا تھا۔

"کوئی آفیشل کام تھا آپ کو؟"

"نہیں، میں آپ کے گھر آنا چاہتا تھا، تائی...... تائی سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"شیور، وہ اس وقت گھر پر ہیں، آپ وہاں جا سکتے ہیں، مجھے ابھی کام سے جانا ہے بائے۔" وہ بِنا جواب کا انتظار کیے آگے بڑھ گئی۔

شجاع نے بے بسی و مایوسی سے اسے جاتے دیکھا اور سر جھٹکا۔ ان کے درمیان خلیج نہیں تھی، خلا تھا۔

☆☆☆

مخروطی چھت اور ستونوں والا برآمدہ شام کی نیلی چھایا اور زرد بلب کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ دوپہر میں بارش ہوئی تھی اور مخروطی چھت کے کنارے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ ایسے میں فیروزہ مائی بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑی، موبائل پہ کوئی نمبر ملا رہی تھی۔ اس کے سامنے لہلہاتا سبز لان پھیلا تھا اور گیٹ کے باہر نشیب میں جاتی سڑک، اونچے پہاڑ اور کھائیاں سب نظر آ رہا تھا مگر وہ ہر شے سے بیزار فقط فون کی طرف متوجہ تھی۔

"ہاں، ہیلو شکیل ہاں بیٹا، کیسا ہے تو؟" وہ مجھے چہرے کے ساتھ رابطہ ملنے پر پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک ٹھاک...... مگر تیرے حالات اچھے نہیں لگ رہے امی؟"

"نہ پوچھ میری...... شکیل بیٹا میری تو قسمت پھوٹی تھی جو اس کے رحم و کرم پہ پڑی ہوں، مرن جوگی، مجھے نوکرانی سے زیادہ عزت نہیں دیتی۔" وہ برآمدے میں آگے پیچھے ٹہلتی دبے دبے غصے سے بول رہی تھی۔

"نہ کر امی، تجھے اور وہ پارو، عزت نہ دے؟ بات دل کو لگتی نہیں ہے...... تیرے سامنے تو وہ چوں تک نہیں کرتی تھی۔"

"آہو...... اور اب بک بک بھی کرتی ہے، تو نے پارو کی زبان نہیں دیکھی، ایسے گھورتی ہے لگتا ہے سالم نگل جائے گی، مجھے تو اب بچی بہت ڈر لگتا ہے اس سے۔" فیروزہ مائی نے جیسے جھرجھری لی۔

"باتیں نہ بنا امی...... مجھے پتا ہے تو ایسی کہانیاں صرف اس لیے سناتی ہے تاکہ میں پیسوں کے لیے اصرار نہ کروں۔ میں ان باتوں میں نہیں آنے والا۔"

"شکیل، تو کیا کہہ رہا ہے۔" فیروزہ مائی صدمے سے ساکت کھڑی رہ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول نہ سکی۔ پھر وہیں برآمدے کی ایک سیڑھی پر نڈھال سی بیٹھ گئی۔ "بیٹے، میں نے تیرے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہیں، کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں اور تو مجھ پہ الزام لگا رہا ہے؟"

"ہاں تو ہر وقت تو رٹ لگائے رکھتی ہے کہ دبئی بلاؤ، دبئی بلاؤ۔ وہاں عیش سے پڑی ہے، نوکر چاکر ہیں، اِدھر آ کر کیا کرے گی؟"

"تو آنکھوں کے سامنے تو ہو گا ناں، تیرے پاس ہوں گی، تیرا خیال رکھوں گی اور اِدھر کیا پڑا ہے۔ یہ پارو اب ویسی نہیں رہی۔ گن گن کر نوٹ دیتی ہے۔ کھانے پینے کی آزادی ہے بس مگر مرغی کھا کھا کر بھی انسان تنگ آ جاتا ہے۔ ساری دولت پہ سانپ بن کر بیٹھی ہے اور......"

"امی وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے، وہ پارس ہے، پارس۔ اس کے پاس رہنا ہی تیرے فائدے میں ہے۔ زور زبردستی اپنے لیے بھی نکلوایا کر اور میرے لیے بھی۔" وہ بے پروائی سے بول رہا تھا۔ فیروزہ مائی زچ ہو گئی۔

"کب سے بکے جا رہی ہوں، وہ نہیں دیتی۔ چند ہزار ہوتے تب بھی شاید دے دیتی مگر جتنے تو مانگ رہا ہے، وہ کبھی نہیں دے گی۔"

شکیل خاموش ہو گیا۔ چند ساعتیں شام کی نیلاہٹ میں ڈوبے برآمدے میں سناٹا رہا، پھر ائرپیس سے آواز ابھری۔

"پارو اتنی کیسے بدل گئی ہے؟"

"مجھے کیا پتا...... ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ اس کی زبان نہ کھل جائے کہیں۔ کالج ختم ہوا، تب بھی اعتماد آ گیا تھا مگر میرے سامنے مجال تھی جو چوں بھی کرے، میں آنکھیں دکھاتی تو وہ سہم جاتی، سر جھکا دیتی مگر کیڑے پڑیں اس بڈھے کی قبر میں، جب سے اس نے پارو سے شادی کی، اسے بدل کر رکھ دیا۔ اس کی زندگی میں ہی یہ مجھ سے زبان چلانے

اور رعب جمانے لگ گئی تھی، اس کے مرنے کے بعد تو اور شیر ہو گئی ہے۔'' فیروزہ مائی کو تو سامع درکار تھا۔ بولنے لگی تو بولتی چلی گئی۔

''ناں تو یہ پارو اکڑتی کس چیز پہ ہے؟ شوہر تو مر گیا اور بس ایک ہوٹل ہی نام کر گیا ہے۔'' فیروزہ مائی اس کی کم عقلی پہ بلبلا اٹھی۔

''تو نے وہ ہوٹل دیکھا نہیں ہے، وہ بادشاہوں کا ہوٹل .... اور ایک نہیں تین ہوٹل نام کر کے گیا ہے بڈھا۔''

''تین ہوٹل؟'' شکیل حق دق رہ گیا۔

''ہاں، اس کے مرنے کے بعد وکیل آیا تھا، اسی نے بتایا تھا۔ میں نے خود دروازے کے پیچھے سے سنا تھا۔''

''ہوں...... تین ہوٹل...... اب تو کچھ سوچنا پڑے گا۔'' وہ بات کرتے کرتے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ فیروزہ کو اچنبھا ہوا۔

''تو ہم کیا اچار ڈالیں گے اس کے ہوٹلوں کا؟''

''اچار ہی تو ڈالیں گے اور ہم ہی ڈالیں گے۔ تو بس آرام سے اُدھر رہ... اور مزید پارو سے پیسے مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جو کروں گا میں کروں گا۔''

''تو کیا کرلے گا؟''

''بس تو دیکھتی جا اماں۔'' فون بند ہو چکا تھا۔ فیروزہ مائی نے حیرت سے موبائل کو دیکھا۔

''یہ شکیل بھی ناں، الٹی کھوپڑی کا مالک ہے۔ پتا نہیں کیا، کیا سوچتا رہتا ہے...... پر جو بھی سوچے گا، اچھا ہی سوچے گا۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ البتہ جیسے بارش کے قطرے ابھی تک چھت کے کناروں سے ٹپک رہے تھے، ویسے ہی فیروزہ مائی کی پیشانی پہ تفکر کی لکیریں ابھری تھیں۔

☆☆☆

وہ سامنے لان کو دیکھتے ہوئے ذہن میں شکیل سے کی گئی باتیں دُہرانے لگی۔ رضوان حیات...... ہاں ان سے شادی کے بعد پارو بدلنے لگی تھی۔

گھاس پہ بارش کے قطرے ابھی تک ٹھہرے تھے جیسے سبز چادر پہ ننھے ننھے ہیرے بکھرے ہوں۔ ان ہیروں کی منعکس کردہ روشنی میں تصاویر بنتی چلی جا رہی تھیں۔ فیروزہ مائی کی نگاہیں ان پہ جمی تو جیسے ان کے اندر تک سفر کرتی گئیں۔ تہ در تہ...... دور اندر تک......

بارش اب جا کر تھمی تھی اور اس چھوٹے سے لونگ روم میں صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی فیروزہ مائی کھڑکی سے باہر گرتے آخری قطرے دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہ بل تھے اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہی تھی۔

''...... اچھے بھلے پنڈی میں رہتے تھے، اپنا مکان تو تھا، وہاں تو پارو بھی نوکریاں کر لیتی مگر مت ماری گئی تھی میری، جبھی زیادہ تنخواہ کا سن کر ادھر مری آ گئی اس کے ساتھ، ہا......'' اس نے آہ بھری۔

''میں نے بھی سوچا تھا، ہوٹل والے چھوٹا سا پورشن دے رہے ہیں اور پھر اتنی تنخواہ اور خوب صورت جگہ...... مجھے کیا پتا تھا یہاں یہ ہڈیاں جمانے والی سردی ہوگی اور یہ بارش بھی، نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، ہر وقت برسنے کو تیار، نرا عذاب ہے۔''

تولیے سے گیلے بال تھپتھپاتے ہوئے باہر آتی پارس نے اس کے الفاظ سن لیے تھے۔ اس نے سارے بالوں کو لپیٹ کر آخری دفعہ دبا کر پانی نکالا اور تولیا صوفے کی پشت پہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''خدا کی رحمت ہوتی ہے بارش، امی تم اسے عذاب تو مت کہو۔''

''زیادہ درس تدریس نہ شروع کر دیا کر۔ اپنا کام کر۔'' فیروزہ مائی نے اسے جھڑک دیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ پھر گیلے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتی، آتش دان کے سامنے آئی اور اندر لگے ہیٹر کو ذرا سا تیز کیا۔

''تیرے صاب نے بتایا نہیں، کب دے گا پیسے؟''

''وہ نہیں دیں گے۔'' وہ فیروزہ کی جانب پشت کیے آتش دان کے سامنے کشن رکھ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ ہیٹر کے قریب کر کے گرم کرنے لگی۔

''تو کل میرے جانے کے بعد وہ یہ کہہ رہا تھا؟''

''جی۔'' وہ ذرا سے گرم ہوئے ہاتھ آپس میں رگڑ کر جیسے اندر جمے خون کو پگھلانے لگی۔ اس کی بالیاں کانوں میں نہیں تھیں اور گیلے بال پشت پہ پھیلے تھے۔ ہیٹر کی گلابی دہکتی روشنی میں اس کی سانولی رنگت جیسے روشنی منعکس کر رہی تھی۔

''ہاں تو تو دوبارہ بات کر، کہہ کہ ضرورت ہے۔ منت کر۔''

''اچھا کہوں گی۔''

''دیکھ پارو، میرے سامنے ٹالنے کے لیے نہ کہہ، سچ مچ ان سے بات کرنی ہے تجھے۔'' وہ تیوریاں چڑھائے تیز لہجے میں بولی۔ ''اُدھر میرا بچہ ہلکان ہوا جا رہا ہے اور اِدھر تو ہے جسے پروا ہی نہیں۔ حد ہوتی ہے خود غرضی کی بھی۔''

دہکتی روشنی میں چمکتا سانولا چہرہ جھک گیا۔ چند لمحے پہلے کا فریش سا احساس ماند پڑ گیا۔ اسی لمحے ڈور بیل نے جیسے مردہ ماحول کو زندگی بخشی۔ دونوں چونکیں۔

''امی باہر دیکھ لو۔ شاید وہ تمہاری نئی سہیلی ہو۔''

''آہو، اس کو بھی ابھی آنا تھا۔'' فیروزہ مائی بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور باہر آئی۔ وہاں سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے چھتری بند کر کے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔

''ہاں جی، کس سے ملنا ہے؟''

''آپ مسز فیروزہ ہیں؟ مس پارس کی والدہ؟'' اس نے شائستگی سے استفسار کیا۔

''مسز...... ہاں، میں ہوں۔ کیا کام ہے؟''

''میں رضوان صاحب کا اسسٹنٹ ہوں، یہ انہوں نے بھجوایا ہے۔'' اس نے کوٹ کے اندر سے ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ......'' فیروزہ مائی ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

''پانچ لاکھ ہیں، آپ گن کر تسلی کر لیں۔'' اب کے فیروزہ نے جھپٹ کر لفافہ پکڑا اور جلدی سے اسے کھولا۔

''کون ہے امی؟'' پارس آوازیں سن کر اچنبھے سے پوچھتی آگے آئی تو سامنے کا منظر اپنی وضاحت خود کر رہا تھا۔ رہی سہی کسر فیروزہ مائی کے دبے دبے جوش سے کہے فقرے نے پوری کر دی۔

''بڑے صاب نے بھیجے ہیں، پورے پانچ لاکھ...... لے، جلدی سے گن کر اسے فارغ کر دے۔'' اس نے اندر سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر پارس کو تھمائیں۔ وہ جیسے سانس تک لینا بھول گئی تھی۔

''رضوان صاحب نے......'' اس نے نوجوان سے پوچھنا چاہا مگر الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔

''میں جاؤں، میم؟'' وہ اس عجیب سی سچویشن سے ہٹنا چاہ رہا تھا۔

''ایسے کیسے، پیسے تو گن لینے دو۔ کسی کا کیا بھروسا؟'' فیروزہ چمک کر بولی۔

''گن بھی سہی۔'' پھر پارس کو ٹہوکا دیا۔

وہ شاک سے نکل کر شرمندگی میں ڈوب چکی تھی۔

''آپ جائیے، بہت شکریہ!'' اس نے ندامت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے رخصت کر کے دروازہ بند کیا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا اور آنکھوں میں بے پناہ یاسیت تھی۔ ''کیا سوچتے ہوں گے رضوان صاحب میرے بارے میں۔''

''بس کر، تو، تو کہہ رہی تھی وہ نہیں دے گا۔ دیکھ اس نے تو فوراً بھجوا دیے۔ اب تو بس جلدی، جلدی قرضہ اتار دینا۔ پھر آگے بھی قرضہ ملتا رہے گا۔''

''بس کر دو امی۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''ہم یہ پیسے نہیں رکھیں گے۔ میں یہ کل انہیں واپس کروں گی، ہم ....''

''چل ہٹ۔'' فیروزہ مائی نے گڈیاں واپس کھینچیں۔ ''میں خود گن لوں گی۔ آئی بڑی، واپس کرنے والی، ہونہہ۔''

''امی خدا کے لیے...... اتنا بڑا قرضہ...... میں کیسے اتاروں گی...... کتنے مہینے لگ جائیں گے بغیر تنخواہ کے...... ہم شکیل کو یہ سب بھیج دیں تو خود کیا کھائیں گے؟''

''تو تو ڈبل شفٹ کر لینا، فارغ وقت میں کوئی اور نوکری کر لینا، اب زیادہ بحث نہ کر۔ ہٹ مجھے گننے دے۔'' وہ صوفے پہ بیٹھ کر پوری دلجمعی سے انگلی پہ تھوک لگا کر نوٹ گننے لگی۔ پارس بے بسی سے اس کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ یقیناً اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔

نوٹ گنتے ہوئے فیروزہ مائی نے ذرا کی ذرا نگاہ اوپر اٹھائی۔ پارس کی پشت پہ گرے بالوں کے سرے ٹپک رہے تھے۔ ننھے ننھے ہیروں جیسے قطرے...... ٹپ ٹپ...... گھاس پہ بکھرے ننھے موتی...... شام کا ڈوبتا ماحول......

کسی پرندے کی آواز بلند ہوئی تو فیروزہ مائی جیسے نیند سے ہڑبڑا کر جاگی۔

وہ ابھی تک برآمدے کی سیڑھی پر ہی بیٹھی تھی۔ شکیل سے کی گئی گفتگو اور رضوان حیات کے بھیجے گئے پیسے، دونوں یادیں باہم گڈمڈ ہو گئیں تو وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہا.........'' اس نے گہری سانس بھری۔

''جو بھی تھا، بڈھا تھا اچھا آدمی۔'' خود سے کہہ کر، ستونوں، دیواروں اور گھاس پہ لدے قطروں کو سنا کر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے مغرب میں ڈوبتا برآمدہ تنہا رہ گیا۔

☆☆☆

آج پھر صبح میں ان وادیوں پہ بارش برسی تھی، پہاڑیاں نہا دھو کر تازہ سبز نکل آئی تھیں۔ بل کھاتی سڑک ابھی تک گیلی تھی جس پہ پارس کی سیاہ چمچماتی کار دوڑ رہی تھی۔

وہ کہنی آرم ریسٹ پہ ٹکائے، انگلی سے اپنی بالوں کو چھیڑتی، کسی خیال میں کھوئی، باہر دیکھ رہی تھی۔ بند شیشے سے پہاڑ، بادل، گہری کھائی سب صاف دکھائی دیتا تھا...... مگر اس کی پُرکشش، اداس آنکھیں جیسے دور کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ان میں تھکان تھی، ٹھہراؤ تھا، راز تھے مگر خوشی نہیں تھی، خوشی کہیں بھی نہیں تھی۔

جانے کب یہ ہوا، کیسے ہوا کہ اس کی آنکھ کے کنارے سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا۔ نمی چہرے پہ پھسلتی گئی تو پارس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ڈرائیور سامنے دیکھتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا یا نہ ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ پارس نے پیچھے رکھے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالا اور اسے دو تہیں لگا کر آنکھ کا کونا پونچھا...... پھر ذرا سا بھیگا ٹشو ہتھیلی میں دبا لیا۔ لمحہ بھر کے جل تھل کے بعد وہ دوبارہ سے کمپوزڈ ہو گئی تھی۔

ٹھنڈی، پُرسکون...... پارس......

فون کی گھنٹی نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔ پارس نے بنا چونکے، آرام سے فون اٹھایا اور کان سے لگایا۔

''جی سنیعہ؟'' دوسری جانب اس کی سیکریٹری تھی۔

''میم، سوری میں آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ دراصل مسٹر شجاع طاہر کی کال آئی تھی۔''

پارس کے اعصاب تن گئے، وہ ذرا سی سیدھی ہوئی۔ آنکھ کے خشک کنارے کو چھوا۔ پھر مٹھی میں بند ٹشو کو دیکھا جیسے اس ایک قطرے کی بارش کی وجہ وہی ہو جس کا ذکر کیا جا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے تھے وہ؟''

''آپ سے ملاقات کے لیے اپائنٹمنٹ لینا چاہ رہے تھے۔ میں آپ کا شیڈول چیک کرنے

اور ان کو کوئی بھی slot دینے سے قبل آپ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کب ان سے ملنا چاہیں گی؟''

پارس نے گہری سانس اندر کو کھینچی، مٹھی ذرا سی کھول کر اندر مچڑے ٹشو کو دیکھا اور کچھ بھی کہنے سے قبل وہ اس ٹشو کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، دیکھتی رہی...... یہاں تک کہ تہ شدہ ٹشو ایک تہ شدہ کاغذ میں تبدیل ہوتا گیا...... اور آس پاس کی ساری تفصیل بھی مٹ کر ایک نئی شناخت...... پہنتی گئی۔

ان مٹ کہانیاں...... لازوال یادیں......

رافعہ تیز تیز قدم اٹھاتی صحن عبور کر کے برآمدے کے سرے پہ آئی، اپنی مٹھی میں تہ شدہ کاغذ کو دیکھا اور پھر زور سے آواز لگائی۔

''پارو...... تائی...... کوئی ہے؟''

دوسری پکار کی نوبت نہیں آئی اور اندر سے وہ سلور بالیوں والی لڑکی آتی دکھائی دی جس کے چہرے پر عجیب سی فکرمندی تھی۔

''کیا ہوا رافعہ؟ اس وقت؟'' ساتھ ہی بالیوں والی لڑکی نے صحن میں چلچلاتی دھوپ کو دیکھا۔

''یہ لو...... تمہارا پیام آیا ہے۔'' رافعہ اسے دیکھ کر نخوت سے مسکرائی اور تہ شدہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا؟'' الجھن سے پارس نے کاغذ تھاما مگر کھولا نہیں، بس سوالیہ نگاہوں سے رافعہ کا چہرہ تکنے لگی جس پہ اب ایک طنزیہ مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔

''اب ایسے تو مت کہو جیسے تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔ بھائی کو پابند تو کیا ہی تھا ناں تم نے، جبھی تو اس نے تمہیں خط لکھا۔ اب خود دیکھو، کیا اچھا لگتا ہے کہ ایک ہی لفافے میں ایک خط ہم سب کے لیے ہو اور ایک صرف تمہارے لیے۔''

پارس نے الجھی نگاہوں سے کاغذ کو دیکھا۔ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ...... مجھے نہیں پتا اس نے کیوں لکھا...... شاید کوئی ضروری بات ہو۔'' مگر اس نے اب بھی اسے نہیں کھولا۔ جیسے سمجھنے سے قاصر ہو کہ اسے وہ کھولنا چاہیے یا نہیں۔

''آہو، بڑی ضروری بات ہے ناں۔'' اندر سے آتی فیروزہ کو دیکھ کر وہ مزید بلند آواز میں بولنے لگی۔ ''بھائی نے ہمیں تو خط نہیں لکھا، بس دو سطور میں خیریت پوچھ لی اور لے کر تیری بیٹی کو پورا معاشرتی علوم کا پرچہ لکھ دیا۔ تو بھی تو سن تائی کہ کیا لکھا ہے۔'' پارس نے ''تائی'' اور ''تیری بیٹی'' کے الفاظ پہ چونک کر پیچھے دیکھا۔ کڑے تیوروں سے گھورتی فیروزہ کو دیکھ کر اس کا رنگ سفید پڑتا گیا۔

''وہ کہتا ہے، تجھے یاد کر رہا ہے اور تیرے لیے ضرور واپس آئے گا۔ اور ہاں یہ بھی کہ تیرے لیے کیا بھیجے۔ میں کہتی ہوں بھائی کو گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور تو نے فرمائشیں شروع کر دیں؟'' رافعہ کمر پہ ہاتھ رکھے غصے سے بول رہی تھی۔ پارس نفی میں سر ہلاتی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ حلق سے اوپر نہیں آ پائے۔

''تو یہ بتا پارو! خط کتابت کا سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟'' فیروزہ مائی غرائی تھی۔

''نہیں...... امی...... میں نے اسے کوئی خط نہیں لکھا، مجھے تو اس کا ایڈریس بھی نہیں پتا۔''

''مطلب تجھے اس کا ایڈریس جاننا ہے تاکہ تو یہ بے حیائی کے کام جاری رکھ سکے؟'' اس کی ہم عمر رافعہ یوں چلا رہی تھی جیسے وہ شجاع کی ماں ہو۔

''نہیں، میرا یہ مطلب......''

''اِدھر دے۔'' فیروزہ مائی نے خط کھینچا۔ بہت دفعہ کھولا اور پڑھا گیا خط اس نے واپس رافعہ کی طرف اچھالا۔

''اپنے شریف بھائی سے کہہ، آئندہ اس نے خط لکھا تو اس کی شرافت کا جنازہ نکال دوں گی۔ اب دفعہ ہو اِدھر سے۔''

''اپنی بیٹی کو کیوں نہیں روکتی جو بھائی کو اکسا کر......''

''تیری تو......'' فیروزہ مائی نے پیر سے جوتی

اتاری، رافعہ جھپاک سے باہر بھاگی۔

''اور تو...... کان کھول کر سن لے پارو......''

ہاتھ میں پکڑی جوتی اس نے پارو کی کمر پہ جڑ دی۔ وہ جو پہلے ہی شل کھڑی تھی، لڑکھڑا کر آگے کو گری اور منہ کے بل کچے پکے فرش پہ جا لگی۔ ہونٹ میں تکلیف کا سوا ہوتا احساس اور گیلا پن، اسے سب کچھ محسوس ہوا تھا۔

''آئندہ میرے گھر سے خط کتابت کی ناں تو اچھا نہیں ہوگا۔ پہلے تو اس مرن جوگے سے چھت پہ ملتی تھی، اب وہ دفعان ہوگیا ہے تو خط شروع ہو گئے۔ آئندہ میں نے اس کا کوئی خط پکڑا تو جان نکال دوں گی تیری۔'' وہ بکتی جھکتی اندر چلی گئی۔ پارس نے .... اپنا چہرہ اٹھایا تو گالوں پہ مٹی لگی تھی اور ہونٹ سے خون نکل رہا تھا۔ زیادہ نہیں، بس ایک قطرہ لڑھک کر ٹھوڑی سے ٹپکا تھا۔

ایک قطرے کی بارش......

''میں ان کو فرائیڈے کی دوپہر کا وقت دے دوں میم؟''

پارس بے اختیار چونکی...... پھر جیسے اس کی بات پر غور کیا، لب بھنچ گئے، پیشانی پر ناگوار بل ابھرا۔

''سعدیہ میں اگلا پورا ہفتہ مصروف ہوں، اس لیے انہیں دو ہفتے بعد کا وقت دے دیں۔''

''اوہ...... اوکے میم......!'' حیران اسسٹنٹ نے حیرت چھپا کر تابعداری سے فون بند کر دیا۔ پارس سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔ ٹشو اس کی مٹھی میں یوں دبا تھا کہ دکھائی نہ دیتا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں اب سپاٹ سی سرد مہری تھی۔ ٹھنڈا، بے تاثر سا احساس......

جیسے اسے ایک قطرے کی وہ بارش اور اس تمام توہین کا سبب بننے والا شخص ابھی تک یاد تھا۔ کس جذبے سے یاد تھا، یہ اس کی آنکھوں سے پتا نہیں چلتا تھا۔

☆☆☆

فیضان نے گردن اٹھا کر پتھریلی سیڑھیوں کو دیکھا۔ وہ کافی اوپر تک جاتی تھیں۔ اس نے ایک نظر بائیں طرف اونچی ہوتی سڑک پر ڈالی، جس کے اختتام پر پارس کا بنگلا تھا اور دوسری مخالف سمت ڈالی جہاں چند منٹ قبل پارس کی گاڑی گئی تھی۔

فیضان کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ بھی جیسے وہ مطمئن تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گی اب وہ اپنا کام کر سکتا ہے۔ صبح سرسبز اور لہلہاتی سی اتر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ سب ہوا، پہاڑ، درخت گواہ تھے بھائی جی کی موت کے...... مگر کاش اُن سب کو انسان کی بولی سمجھ آتی یا انسان کو ان کی اور یہ ہمیں اپنے ساتھ بیتنے والے تمام واقعات، دھوکے، سب بتا دیا کرتے۔ ہر شے صاف، صاف معلوم ہو جاتی، نہ لوگ جھگڑتے، نہ جھوٹ بولتے، نہ عدالت میں مقدمے جیتنے کے لیے وکیل ہائر کرتے، کتنا امن، سکون ہوتا، جب کوئی راز، راز نہ رہتا...... مگر شاید اللہ کو ان پتھر اور پتوں پہ انسان سے زیادہ بھروسا ہے، تبھی ان کی گواہی کو اس دنیا میں انسان کے سامنے بیان کرنے اور انسان کا اس کو توڑ موڑ کر اپنے فائدے کے لیے استعمال کر کے اس کی توہین کرنے سے بچانے کے لیے اس نے انہیں قیامت کے بڑے دن تک مؤخر کر دیا ہے کہ جس روز دنیا سے ''راز'' ختم ہو گئے وہ قیامت کا پہلا دن ہوگا۔

وہ قدم قدم سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اونچائی جیسے جیسے بڑھتی ہے، آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے، دماغ ذرا دھیرے دھیرے کام کرتا ہے، شاید اسی لیے کسی بلند مقام پر پہنچ کر بہت سے لوگوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں مگر اس کا دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

سیڑھیوں کے آخر میں لکڑی کا چھوٹا سا جنگلے نما گیٹ تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کنڈا اندر سے کھولا پھر اسے دھکیل کر پارک میں داخل ہوا۔

وہ کافی وسیع و عریض سا پارک تھا۔ درخت، پھول، بوٹے، بینچ ہر کونہ سجا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو پارس کا گھر بالخصوص ٹیرس اور ٹیرس کا فرش تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اب اس کے گھر سے اونچے لیول پر آچکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پارک کے کیئر ٹیکر کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔

''آپ کتنے عرصے سے یہاں کام کر رہے ہیں؟''

''پانچ سال سے، سر......!'' وہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا کہ اس سوال کی وجہ جان سکے۔

''مجھے کچھ معلومات چاہئیں...... کیا آپ دے سکیں گے؟''

''کس بارے میں؟''

''پچھلے دسمبر میں ہونے والے ایک حادثے کے بارے میں۔'' وہ سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، جیسے کیئر ٹیکر کا ایک ایک تاثر اسکین کر رہا ہو۔

کیئر ٹیکر کے چہرے پر الجھن ابھری، بہر حال اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

''بتایئے، کون سا واقعہ؟''

''دسمبر میں یہاں سیڑھیوں سے ایک چالیس پچاس برس کا آدمی گر کر فوت ہوا تھا، شاید آپ کو یاد ہو اس نے ہڈ والی جیکٹ پہن رکھی تھی، اس کے بال......''

''آپ رضوان حیات کی بات کر رہے ہیں؟''

فیضان رک گیا پھر ایک گہری سانس بھری۔

''آپ رضوان حیات کو جانتے ہیں؟''

''انہیں کون نہیں جانتا، وہ رائل ہوٹل کے مالک تھے اور اپنی وفات سے دو ماہ پہلے سے اس سامنے والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔'' ساتھ ہی بنگلے کی طرف اشارہ کیا...... فائز نے سر ہلا دیا۔

''انہوں نے کسی جوان لڑکی سے شادی کی تھی جو ان کے ہوٹل میں کام کرتی تھی، اکثر وہ دونوں اس پارک میں آیا کرتے تھے۔''

''کیا آپ کی اُن سے سلام دعا تھی؟''

''بالکل، وہ بہت مہربان آدمی تھے، میں ذرا سا اُن کے آگے پیچھے پھرتا اور وہ مجھے بھاری ٹپ دے کر جایا کرتے تھے، ہمیشہ مسکرا کر ملتے، مجھ سے پوچھتے کہ یہاں مجھے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے کبھی ہو تو میں اُن کو بتاؤں۔'' کیئر ٹیکر دور افق کو دیکھتے ہوئے دکھ سے کہہ رہا تھا۔ ''اور اگر مجھے کوئی مسئلہ ہوتا تو میں واقعی اُن کو بتا بھی دیتا، کچھ لوگ اتنے مہربان ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے مسائل بتاتے ہوئے انسان کو نہ شرم آتی ہے اور نہ ہی غیرت......''

فیضان نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں افق پہ دیکھا، جہاں اونچی پہاڑیوں نے خود کو بادلوں کی شال میں لپیٹ رکھا تھا۔ نیلا آسمان، سفید بادل، سبز پہاڑیاں، بھوری زمین، قدرت کا بہترین کلر کمبی نیشن...... اس کی نگاہیں اس نظارے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ بادل رازوں کی طرح لگتے تھے، ہوا سے ہلکے مگر سارا منظر چھپائے ہوئے...... اس نے ان کے پیچھے دیکھنا چاہا اور یکایک جیسے نرم گالوں میں سوراخ ہونے لگے، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے پیچھے ایک اور منظر جھانکنے لگا۔ فیضی نے اس منظر کو پکڑنے کی سعی کی، ہاتھ نہیں بڑھایا، نگاہ بڑھائی، دور، بہت دور......

وہ لمبا، ٹین ایج لڑکا کبھی دائیں، کبھی بائیں بھاگتا، ریکٹ سے شٹل کاک دوسری جانب بھیج رہا تھا۔ دوسرا کھلاڑی اسی مستعدی سے اسے واپس کرتا...... ٹک ٹک...... شٹل کاک کے ریکٹ کی جالی سے ٹکرا کر ہوا میں غوطہ کھانے کی آواز اور ٹین ایج لڑکے کے تیز تنفس کی آہٹ...... بیسیوں لوگوں کے مجمع کے باوجود بیڈ منٹن کورٹ میں چھائے پن ڈراپ سائیلنس کو توڑ رہی تھی۔ میچ آخری اور سنگین مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر پوائنٹ پہ تالیاں

بجتیں...... شور اٹھتا، پھر خاموشی چھا جاتی۔

ریکٹ اُچھلا کر چڑی کو مار کر ٹین ایج لڑکے نے فخریہ انداز میں فرنٹ رو کی طرف دیکھا، جہاں رضوان حیات بیٹھے تھے اور... اسے دیکھتا پا کر وہ دھیرے سے مسکرائے اور ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر تالی بجائی، ساتھ بیٹھے تنویر صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے اس عمل کی تقلید کی، فیضی مسرت آمیز سا کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مقابلہ کرنے کی ہمت اور جیت کا جذبہ انسان کو skill سے نہیں، لوگوں کی مورل سپورٹ سے ملا کرتا ہے، یقین اور مکمل یقین انسان کو ہارنے نہیں دیتا۔ دے ہی نہیں سکتا، فیضی بھی نہیں ہارا...... وہ جیت کر ہی پہلی قطار کی کرسیوں کی جانب آیا۔

پسینے میں تر بتر، ماتھے سے بینڈ اتارتا، ریکٹ رکھ کر وہ مسکراتا ہوا بھائی جی سے گلے ملا جو اُس کے لیے کھڑے ہو گئے تھے، علیحدہ ہو کر انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''بہت شاندار...... مجھے تم پر فخر ہے۔''

فیضی نے بنا آستین کی اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی، اسے اپنے پسینے میں بھیگے شانے کو تھپکتا بھائی جی کا ہاتھ بہت گرم لگا تھا۔ خیر...... یہ اس وقت اہم نہیں تھا۔

''مجھے لگا تھا آپ نہیں آئیں گے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ تمہارے میچ میں نہ آتا تو خود کو معاف نہ کر پاتا۔'' وہ مہربان انداز میں مسکرائے، لڑکے نے مصنوعی خفگی سے بھویں اچکائیں۔

''صرف میچ......؟''

''نہیں، صرف میچ نہیں، ہیپی برتھ ڈے۔'' وہ پھر سے مسکرائے، انہیں یاد تھا مگر اُن کی مسکراہٹ میں نقاہت تھی، خیر یہ بھی اس وقت اہم نہیں تھا۔

''تھینک یو...... پھر کیا دے رہے ہیں آپ مجھے برتھ ڈے پر؟'' اس کے بے پروا، عجلت بھرے انداز پہ تنویر صاحب نے لب کاٹا اور نفی میں افسوس سے سر ہلایا مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ رضوان نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

''جو تم چاہو......''

''تو پھر مجھے میری اپنی برانڈ نیو کار چاہیے، اٹھارویں سالگرہ پہ یہ میرا حق بنتا ہے۔''

''شیور ابھی چلو۔'' وہ تیار تھے۔

''رضوان بھائی، آپ ذرا آرام کر لیتے، کراچی میٹنگ اٹینڈ کر کے سیدھا ائر پورٹ سے اِدھر آ گئے ہیں اگر تھوڑا سا......'' تنویر صاحب نے متفکر لہجے میں کہنا چاہا مگر لڑکے نے بگڑے تیوروں کے ساتھ انہیں دیکھا۔

''تنویر بھائی، میرا برتھ ڈے خراب مت کریں، مجھے کار لینی ہے تو ابھی لینی ہے۔''

''ہاں کیوں نہیں، ابھی چلتے ہیں، میرے بیٹے کی اٹھارویں سالگرہ ہے اور اٹھارویں سالگرہ ہر روز نہیں آتی۔'' انہوں نے فخر سے کہتے ہوئے اس کا شانہ پھر سے تھپکا، ہاتھ گرم تھا مگر یہ اہم نہیں تھا۔

تنویر صاحب متفکر سے اُن کو دیکھتے خاموش ہو گئے مگر جیسے غیر مطمئن ہوں۔

زیادہ دیر نہیں گزری، جب وہ کارز کے شوروم میں کھڑے تھے۔ وہ لڑکا ہر ایک کار کو آگے پیچھے سے دیکھتا، اس میں بیٹھتا، کوئی پسند آتی، کسی پہ تحقیر سے منہ بنا دیتا، تنویر صاحب ہاتھ باندھے ہوئے رضوان کے پیچھے کھڑے تھے۔ رضوان نقاہت سے مسکراتے ہوئے لڑکے کو تنقیدی انداز سے ہر شے کا جائزہ لیتے دیکھ رہے تھے۔

''مجھے یہ سرخ اسپورٹس کار پسند ہے۔'' بالآخر ایک کار کے پاس رک کر وہ ایک دم سے بولا۔ ڈیلر نے معذرت خواہانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''سوری سر، یہ بک ہو چکی ہے، اس کو آدھے گھنٹے تک شپ کرنا ہے۔''

’’مگر مجھے یہی چاہیے۔‘‘لڑکے کے ماتھے پر برہمی سے بل پڑے۔

’’جی ،سر ہم آپ کو جمعے تک یہ کار منگوادیں گے،سیم کلر،سیم ماڈل۔‘‘

’’سیم نہیں، مجھے یہی چاہیے، آپ انہیں منگوادینا۔‘‘وہ بیزاری سے بولا۔ رضوان کی مسکراہٹ پھیکی پڑی،وہ جیسے فکر مند ہوگئے۔

’’کہیں اور سے پتا کرلیتے ہیں فیضی...... یا پھر جمعے تک انتظار......‘‘

’’مجھے نہیں کرنا انتظار...... میرا برتھ ڈے آج ہے، جمعے کو نہیں۔‘‘ لڑکا مشتعل ہورہا تھا۔ رضوان کے چہرے پر افسوس ابھرا۔

’’اچھا ٹھیک ہے،کہیں اور سے۔‘‘

’’آپ کو سمجھ نہیں آتا؟ کہیں اور سے نہیں دیکھنا میں نے، مجھے آج بس یہی کار چاہیے،ہم آپ کو ڈبل پے منٹ کردیں گے۔‘‘(ڈبل پے منٹ کے الفاظ پہ تنویر صاحب نے بے اختیار تھوک نگلا)

’’سر، بات پے منٹ کی نہیں، کمٹمنٹ کی ہے، ورک ethics کی ہے۔ سہگل صاحب کے لڑکے کی کار ہے۔ پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔‘‘ ڈیلر بے چارہ پریشان ہوگیا تھا۔

’’وہ ٹھیک کہہ رہا ہے فیضی، بات اخلاقیات کی ہے،اُن کی مجبوری کی ہے،آؤ ہم کہیں اور سے دیکھ لیتے ہیں۔‘‘

’’مائی فٹ......!‘‘لڑکے کا چہرہ غصے سے سرخ پڑچکا تھا۔’’آپ مجھے کار لے کر دینا ہی نہیں چاہتے، آپ کو میرا احساس ہی نہیں ہے...... اتنا بھی نہیں سوچا کہ آج میرا برتھ ڈے ہے،آج تو مجھے کچھ لے دیں مگر پتا نہیں آپ کس کے لیے اپنی دولت سنبھال رہے ہیں، یو نو واٹ بھائی جی، مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ نہ کار، نہ آپ کی میری برتھ ڈے پارٹی میں شمولیت......‘‘وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

رضوان بس کھڑے رہ گئے، اس دروازے کو دیکھتے رہ گئے جس سے وہ باہر نکلا تھا۔ اپنی سانسوں کی آوازیں گنتے رہ گئے، اُن کے چہرے پہ تکلیف تھی، درد تھا، ایک نہ ختم ہونے والا کرب مسلسل تھا مگر یہ اہم نہ تھا...... تنویر صاحب نے بس لمحے بھر کو دیکھا اور فیضی کے پیچھے لپکے۔ وہ کار کے قریب تھا جب تنویر صاحب نے اس کو جالیا۔

’’فیضی، تمہارے بھائی جی بیمار ہیں۔‘‘ کار کا دروازہ کھولتا لڑکا رکا اور مڑ کر اُن کو دیکھا۔

’’کیا ہوا ہے انہیں؟‘‘

’’اُن کو کل سے بخار ہے اور......‘‘

’’بخار تو ٹھیک ہوجاتا ہے، مجھے بھی پرسوں تھا۔‘‘لڑکے نے شانے اچکائے۔

’’تم اٹھارہ سال کے ہو، وہ چالیس کے ہیں، وہ دو دن سے مسلسل کام کررہے ہیں، صرف تمہاری سالگرہ کے لیے انہوں نے دو اہم ترین میٹنگز کینسل کیں۔ انہوں نے آرام بھی نہیں کیا اور سیدھے یہاں آگئے، اور......‘‘

’’آپ ان کے ایمپلائی ہیں، ایمپلائی ہی رہیں، مجھے پتا ہے اچھی طرح کہ مجھے ان سے کیسے ڈیل کرنا ہے۔‘‘

بادلوں کی کھڑکیاں بند ہونے لگیں، منظر چھپنے لگا، رازوں پہ پہرے لگنے لگے۔

’’اس رات میں یہیں تھا جب یہ حادثہ ہوا۔‘‘ کیئرٹیکر کہہ رہا تھا۔ فیضی چونکا...... اور پھر توجہ سے سننے لگا۔

’’اس رات برفباری ہوئی تھی، پچھلی رات بھی برف پڑی تھی جس سے ہر جگہ سفید تھی، سیڑھیاں بھی برف سے اٹی تھیں، میں اندر تھا جب وہ لوگ آئے تھے ، رضوان صاحب اور ان کی بیوی...... وہ ادھر سردی میں کافی دیر تک ٹہلتے رہے...... پارک سنسان تھا، اتنی سردی تھی کہ قلفی جم جائے، میں صرف اُن کا

چہرے باہر آکر بیٹھ گیا۔‘‘

فیضان اب ماضی کی یادوں سے نکل کر پوری یکسوئی سے سن رہا تھا۔ کیئرٹیکر یوں بتا رہا تھا جیسے اس کے سامنے فلم سی چل رہی ہو۔

’’وہ دونوں...یہاں اس جگہ ٹہلتے رہے۔‘‘ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔’’ کافی دیر رضوان صاحب خاموش تھے، ان کی بیوی بول رہی تھی، میں دور تھا، مجھے سمجھ نہیں آئی مگر وہ بہت تیز تیز بولے جارہی تھی، جیسے انسان غصے میں بھڑاس نکالتا ہے، وہ کافی سوبری لڑکی ہے، ایسے عموماً بولتی نہیں ہے مگر تب بہت مختلف لگ رہی تھی پھر رضوان صاحب تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھے، وہ ان کے پیچھے لپکی...... اب کہ وہ اونچا بولی تو مجھے سنائی دیا کہ وہ ان کو جانے سے روک رہی تھی مگر وہ بغیر سیڑھیاں اترنے لگے اور تبھی اُن کی ہلکی سی کراہ سنائی دی اور وہ پھسلے۔‘‘

’’تب پارس کہاں تھی؟‘‘ فیضان نے تیزی سے پوچھا۔

’’وہ یہاں کھڑی تھی۔‘‘ کیئرٹیکر نے سیڑھیوں کے آغاز سے ذرا فاصلے پہ ایک جگہ اشارہ کیا۔

’’کیا یہ ہوسکتا ہے کہ رضوان صاحب کو کسی نے دھکا دیا ہو؟‘‘

’’نہیں، وہ میرے سامنے گرے تھے، دوسری یا تیسری سیڑھی سے گرے تھے، وہ حادثہ تھا، ایک برا حادثہ...... ان کے جنازے پر بھی میں گیا تھا۔... بیگم صاحبہ سے بھی ملا، اب آپ بتائیں آپ اتنے سوال کیوں کررہے ہیں؟‘‘ فیضی اس کے سوال پر تکان سے مسکرایا۔

’’میں ان کا ایک زمانے میں دوست رہ چکا ہوں، صرف متجسس تھا اُن کی موت کے بارے میں، آئی ہوپ آپ میری فیلنگز سمجھ سکیں گے۔‘‘ ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کیئرٹیکر نے اس سے ہاتھ ملایا، فیضان مڑ گیا، کیئرٹیکر اسے دیکھتا رہا، وہ سیڑھیوں کی طرف گیا اور دھیرے دھیرے زینے اترنے لگا۔ تیسرے زینے پر رک کر اس نے پلٹ کر کیئرٹیکر کو دیکھا، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

فیضی سمجھ کر پلٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ کیئرٹیکر اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے غائب ہوگیا پھر وہ اندر چلا آیا۔ اپنے چھوٹے سے کیبن نما آفس کا دروازہ بند کرکے اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

دوسری جانب گھنٹی جارہی تھی وہ مضطرب سا انتظار کرنے لگا۔ پانچویں گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا۔

’’بولو......؟‘‘ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

’’جیسا کہ آپ نے کہا تھا سر...... ایک نوجوان ابھی آیا تھا اور مجھ سے رضوان حیات کی موت کے بارے میں سوال کررہا تھا۔‘‘

’’تم نے کیا کہا؟‘‘

’’وہی جو آپ نے کہا تھا کہ مجھے کہنا ہے۔‘‘

’’گڈ......اور جو میں نے کہا تھا کہ نہیں کہنا؟‘‘

’’وہ میں نے نہیں کہا۔‘‘کیئرٹیکر کی آواز میں فخر در آیا۔

’’ویری گڈ...... میں دوپہر سے پہلے تک تمہاری رقم ٹرانسفر کردوں گا، اب مجھے مزید اس نمبر پر فون مت کرنا۔‘‘

’’جی سر......!‘‘ اس نے بخوشی کہہ کر فون بند کردیا۔ کیئرٹیکر واقعی بہت خوش اور مطمئن تھا۔

☆☆☆

’’کیا آپ نے سب سمجھ لیا؟‘‘ پارس کرسی سے اٹھ کر پرس اٹھاتے ہوئے بولی تھی۔ فائز نے سر ہلاتے ہوئے میز سے اپنے کاغذات سمیٹے۔

’’میں تمام ای میلز کردوں گا، اس مہینے کی رپورٹ جس کا ذکر میں کررہا تھا، وہ صبح آپ کی میز پر رکھ دوں گا۔ آپ پڑھ کر مجھے بتادیجیے گا۔‘‘ اس نے اپنے بکھرے کاغذ باری باری فائل میں لگانے

شروع کیے، پارس جلدی جلدی اپنی چیزیں اٹھا رہی تھی، موبائل بیگ، کارڈز، فائز کے ہاتھ اتنی ہی سست روی سے چل رہے تھے۔

''اوکے! صبح ملاقات ہوتی ہے پھر۔'' پارس نے پرس کہنی سے لٹکایا، کندھوں سے سیاہ شال ٹھیک کی اور فولڈر اٹھائے آفس کے گلاس ڈور کی طرف بڑھی۔

فائز نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی اور سست روی سے اپنی فائل بیگ میں ڈالنے لگا۔ پارس نے دروازہ کھولا، باہر نکلنے سے قبل ایک دفعہ مڑ کر دیکھا، فائز بیگ کی زپ بند کر رہا تھا، زپ پھنس گئی تھی جسے وہ ذرا احتیاط سے دوبارہ پیچھے کر کے چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پارس باہر چلی گئی۔ اس کے نکلتے ہی فائز نے زپ تیزی سے بند کی مگر تب تک نہیں ہلا جب تک پارس کاریڈور میں دور غائب ہوتی نہ دکھائی دی...... جیسے ہی وہ آگے مڑی فائز تیزی سے میز کے پیچھے آیا۔ اس کا ہاتھ بلا ارادہ سائڈ ٹیبل سے ٹکرایا، رضوان حیات کی تصویر کا فریم سر کے بل گرا مگر وہ بنا رکے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا اور میز کی درازیں باری باری کھولنا چاہیں، تینوں درازیں لاکڈ تھیں، اس نے گردن اونچی کر کے میز کے پار دیکھا، شیشے کے دروازے کے آگے کاریڈور خالی تھا۔

وہ دوبارہ دراز کھولنے کی کوشش کرنے لگا، وہ مکمل طور پر بند تھیں، اس نے جیب سے ایک پن نکالی اور دو انگلیوں میں مخصوص مہارت سے پکڑ کر... اوپر والی دراز کے کی ہول میں ڈالی۔ اب وہ کبھی کلاک وائز، کبھی اینٹی کلاک وائز پن کو ہلاتا وہ جیسے مکمل تکنیک کے مطابق اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پارس نے لفٹ میں قدم رکھا تو آپریٹر سیدھا کھڑا ہو گیا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

''گراؤنڈ فلور......'' کہہ کر وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ دیوار سے لگی کھڑی ہو گئی، آپریٹر نے جی کا بٹن دبایا، لفٹ نیچے اترنے لگی۔

فائز نے لاک کا آخری چکر مکمل کیا اور دراز کھینچی وہ باہر نکل آئی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی، اس نے اندر موجود تمام فائلز باہر نکالیں اور میز پر رکھیں...... پھر گردن اونچی کر کے دیکھا کاریڈور خالی تھا۔

لفٹ گراؤنڈ فلور کی طرف گامزن تھی۔ پارس لفٹ کی چمکتی سلور لوہے کی دیواروں میں اپنا عکس دیکھتی خاموشی سے کھڑی تھی، لفٹ نے زمین کو چھوا اور دروازے ''ہس'' کی آواز کے ساتھ کھلے، آپریٹر مؤدب سا سر جھکائے ایک طرف کو ہوا، پارس باہر نکلی۔

فائز نے دراز پوری باہر نکال لی، یوں کہ پیچھے دراز کے اندر موجود کاغذ بھی نظر آنے لگے، اس نے ہاتھ اس خلا میں ڈال کر وہ سب کاغذ بھی نکالے اور میز پر رکھے، اب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جیب سے ڈیجیٹل کیمرا نکالا، اس کا میکرو شوٹنگ موڈ آن کیا اور فائل کے صفحے پلٹتا تصویریں بنانے لگا۔

پارس تیز قدموں سے چلتی ہوٹل سے باہر نکلی روش عبور کر کے وہ گیٹ کے اندر کھڑی سیاہ کار تک آئی، ڈرائیور نے تیزی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا...... اندر بیٹھتے ہوئے پارس نے گریبان پہ ہاتھ لگایا کہ عینک اتار کر آنکھوں پہ...... وہ رک گئی۔

اس کے گلاسز گریبان پہ نہیں اٹکے تھے۔ پارس نے ہاتھ سے گردن کو چھوا، الجھ کر سوچا۔ پھر پلٹ کر اوپر دیکھا۔

''ایک منٹ خان، میں کچھ بھول گئی ہوں۔''

''میں لے آؤں میڈم......؟''

''نہیں، میں خود جاتی ہوں۔'' وہ تیزی سے واپس پلٹی......

کِلک...... کِلک...... کِلک کی آواز کے ساتھ وہ دھڑا دھڑ تصاویر بنا رہا تھا۔ دو فائلز ہو چکی تھیں، تیسری ابھی باقی تھیں، وہ اب کاریڈور کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا، بس تصاویر بنانے میں مصروف تھا۔

پارس کاریڈور میں چلتی لفٹ تک آئی، اسی پل اس نے چار افراد کو لفٹ میں کھڑا دیکھا اور اسی پل لفٹ کے دروازے بند ہوئے، باہر سرخ حروف میں لفٹ کے اوپر جانے کا اشارہ نظر آ رہا تھا۔

''اوہ......'' اس نے بے بسی سے بند لفٹ کو دیکھا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

فائز نے چوتھی فائل اب شروع کی تھی، اس کے چہرے پر پسینہ تھا، دل دھڑک رہا تھا مگر وہ تیز رفتاری سے سارا کام انجام دے رہا تھا۔

پارس سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، ایک فلور، دوسرا، تیسرا......

فائز نے آخری فائل کے اختتامی صفحے ختم کیے ساری فائلز کو ترتیب دی اور دراز میں ڈالا، نچلی والی فائلز کو پہلے ڈالا پھر اوپر والی دراز واپس اس کی جگہ میں گھسائی اور یہ کرتے ہوئے وہ جھکا ہی تھا کہ کن انکھیوں سے اسے دروازوں کے پار کاریڈور میں سیاہ رنگ کی جھلک دکھائی دی تھی وہ دراز بند کر کے اٹھا نہیں، جھکے جھکے میز کی دوسری جانب گیا اور رضوان حیات کی تصویر اٹھاتے ہوئے سیدھا ہوا۔

اسے نظر آ رہا تھا کہ پارس دروازہ کھول کر اندر آ رہی ہے مگر اس کی طرف دیکھنے کے بجائے بظاہر بے خبر سے فائز نے تصویر سیدھی کی، ٹشو باکس سے ٹشو نکالا، اس کی سطح صاف کی اور اسے اس کی جگہ پر سیٹ کر کے رکھا۔

''آپ گئے نہیں؟'' پارس کی حیران سی آواز پہ وہ چونک کر پلٹا پھر مسکرایا۔

''جی میڈم، میں جا رہا تھا مگر کاریڈور سے دیکھا کہ یہ تصویر جگہ پر نہیں رکھی تھی قریب آیا تو دیکھا، یہ زمین پر گری پڑی ہے، مجھے اچھا نہیں لگا، آپ کے بغیر آپ کے آفس میں داخل ہونا اچھی حرکت نہیں ہے مگر مجھے آپ کی ڈانٹ منظور ہے، اس تصویر کی بے حرمتی نہیں...... ایک عرصہ اس شخص کی دی ہوئی تنخواہ سے میرے گھر کا چولھا جلا ہے، میں احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔''

اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے پارس کو دیکھا وہ جیسے اسے دیکھ کر چونکی تھی مگر وضاحت سن کر اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے، اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ فائز اپنا بیگ سنبھالتا باہر نکل گیا۔

پارس قدم قدم چلتی اس تصویر تک آئی، اس کے گلاسز ساتھ رکھے تھے مگر اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ بس تصویر اٹھائی، دونوں ہاتھوں میں فریم پکڑے وہ اسے چہرے کے قریب کیے دیکھنے لگی۔

فریم کے چمکتے شیشے میں اس کا عکس نظر آ رہا تھا، مسکراتے ہوئے رضوان حیات کے چہرے پر مدھم سا اس کا چہرہ......اور ان دونوں چہروں کے درمیان ایک تیسرا عکس ابھرنے لگا، سنہری جھلملاہٹ...... نیلے پانی پر چمکتی جھلملاہٹ...... عکس در عکس......

سوئمنگ پول کا نیلا پانی سنہری دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دور سے پتا نہیں چلتا تھا کہ پانی جما ہوا ہے یا پگھلا ہوا...... شاید برف کے ٹکڑے اندر تیر رہے تھے۔ ہوٹل کے بلاکس کی چھتیں، گزرگاہوں کے اطراف، لان کی گھاس غرض ہر جگہ برف کی تہ تھی، دھوپ چار دن بعد نکلی تھی، کچھ مہمان پول کے گرد آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے، کچھ سردی میں گرمی کا مزہ چکھتے ٹہل رہے تھے۔

ایسے میں ایک سادہ شلوار قمیص پہنے اور ڈھیلا جوڑا بنائے، سلور بالیوں والی لڑکی اپنا بیگ اٹھائے اندر سے باہر آتی دکھائی دی۔ اس کی چال دھیمی اور چہرے پر تکان تھی جیسے ساری رات کی جاگی ہوئی اپنی شفٹ ختم کر کے گھر جا رہی ہو، وہ عمارت کے ساتھ ساتھ چلتی جا رہی تھی، جب ایک دم رکی۔

سوئمنگ پول کے ایک طرف کرسی پر جیکٹ اور ٹراؤزرز جیسے آرام دہ حلیے میں ملبوس رضوان حیات

اخبار پڑھ رہے تھے، ان کے دائیں طرف چھوٹی میز پہ جوس کا گلاس رکھا تھا، کافی فاصلے پہ ایک ویٹر بظاہر گملے ٹھیک کرتا، اُن کی طرف متوجہ تھا کہ کب وہ اشارہ کریں اور وہ حاضر ہو۔

پارس چند لمحے رک کر دیکھتی رہی پھر جھکے سر کے ساتھ چلتی اُن تک آئی۔

"سر......!" اس کی آواز دھیمی تھی، رضوان نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا پھر ہاتھ سے قریبی کرسی کی جانب اشارہ کیا، وہ بیٹھی مگر ایسے کہ آگے ہو کر کنارے پہ ٹکی تھی۔

"آپ نے...... پیسے بھجوائے تھے سر......!" وہ اب انہیں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی مگر ان اٹھی نگاہوں میں بھی جھکی نظروں جتنی ندامت تھی۔

"مل گئے تھے؟" وہ اخبار پڑھتے رہے، قلموں کے سفید بال، آنکھوں کا دھیما تاثر، وہ معمولی نقوش کے حامل تھے مگر پھر بھی گریس فل تھے...... بہت گریس فل......

"جی......" پارس نے ہمت مجتمع کی۔ "آپ نے وہ کیوں بھجوائے سر؟"

"کیونکہ آپ کو ضرورت تھی۔" ساتھ ہی انہوں نے صفحہ پلٹا۔

"سر مجھے...... مجھے کہنے دیجیے کہ میری والدہ نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، شکیل قرض کی رقم عرصہ ہوا ادا کر چکا ہے، نہ غنڈے تھے نہ ہی انہوں نے اسے زخمی کیا، یہ رقم وہ بس کاروبار میں لگا دے گا یا اُڑا دے گا اور میں پتا نہیں کتنے سال یہ قرض اپنے خون سے اتارتی رہوں گی۔"

"مجھ سے چھوٹے میرے دو بہن بھائی ہیں، سویرا اور فیضان۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں اعتراف اور انکشاف کر رہی تھی کہ رضوان حیات کسی خبر کو بہت انہماک سے پڑھتے ہوئے بولے، پارس رک گئی، لمحے بھر کو اسے لگا کہ انہوں نے یہ فقرہ اخبار سے پڑھ کر سنایا ہے۔

"اگر آپ ان دونوں سے رضوان حیات کے بارے میں پوچھیں تو وہ کہیں گے، ہمارے بھائی تو ایک مہربان، نرم دل، سچے، جلد اعتبار کرنے والے ایک احمق آدمی ہیں، وہ درست ہیں، میں مہربان بھی ہوں، نرم دل، سچا، جلد اعتبار کر لینے والا بھی ہوں مگر......"

انہوں نے اخبار لپیٹ کر پارس کو دیکھا اور ذرا سا مسکرائے...... "مگر میں احمق نہیں ہوں، نہ ہی کبھی تھا۔"

پارس بس انہیں دیکھتی رہی...... چپ سی، الجھی ہوئی سی۔

"میں کسی کو پانچ ہزار دینے سے پہلے بھی تحقیق کراتا ہوں پھر چاہے پانچ لاکھ ہوں یا پانچ کروڑ، میں کسی کی زبان پہ اعتبار کر کے نہیں تھما دیتا...... کیا لگتا ہے آپ کو، آپ کے میرے آفس سے نکلتے ہی میں نے آپ کے سارے خاندان کو، سوتیلی ماں، سوتیلے بھائی، بلکہ سوتیلی ماں کے بیٹے کو، اس کا جیل ریکارڈ، غیر قانونی دبئی جانا سب نہیں کھنگالا ہوگا، میں سب جانتا ہوں مس......" وہ مسکرا رہے تھے، فاتحانہ نہیں، نرمی سے، سادگی سے۔

"تو پھر...... آپ نے کیوں دی ہمیں وہ رقم......؟"

"آپ کو ضرورت تھی۔"

"وہ...... ضرورت نہیں، لگژری تھی اور اس قرض کو میں لمبے عرصے بعد اتار سکوں گی، ہر ماہ تنخواہ سے ایک بھاری کٹوتی پھر لامحدود مدت کے لیے یہاں کام کرنا باؤنڈ ہو کر، میں تو سیونگ بھی نہیں کر پاؤں گی سر۔"

"اور یہی سب کچھ آپ کی والدہ کو بھی معلوم ہونا چاہیے۔" انہوں نے جوس کا گلاس اٹھایا اور سپ لے کر واپس رکھا، ٹھنڈا جوس، ٹھنڈا موسم، پول کا ٹھنڈا پانی......

"کیا مطلب سر......؟"

"میں نے وہ قرض آپ کو ذاتی طور پہ دیا ہے، کمپنی کی طرف سے نہیں، آپ کی تنخواہ سے وہ ادا نہیں ہوگا، دس سال بعد آپ مجھے یکمشت ادائیگی کریں گی تب تک آپ اپنی والدہ کو یہ تاثر دے سکتی ہیں کہ ادائیگی آپ کی تنخواہ سے ہو رہی ہے، یوں آپ اپنی ذاتی سیونگ بھی کر سکیں گی اور وہ آپ کو مزید کسی جگہ سے قرض لینے پر مجبور نہیں کر سکیں گی۔ پارس اگر میں آپ کو قرض نہ دیتا تو وہ آپ کو کہیں اور لے جاتیں، تب آپ کیا کرتیں؟" وہ خاموش ہو گئی۔ سب سمجھ آگیا تھا، سوائے ایک بات کے......

"مگر آپ میرے اوپر یہ احسان کیوں کر رہے ہیں؟"

رضوان حیات نے ابرو اچکائے اور گلاسز اتار کر سائڈ ٹیبل پر اخبار کے ساتھ رکھے۔ پھر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"اس روز لابی میں آپ نے کہا تھا کہ لوگ ہمیں استعمال کرتے ہیں اور ہم اپنا دل بھی تو دھو لیتے ہیں...... مجھے آپ کی وہ بات اچھی لگی، میں خود کو اس سے ریلیٹ کر سکتا ہوں۔"

"نیور!" اس نے بے یقینی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "آپ کو کوئی استعمال نہیں کر سکتا، کبھی نہیں۔"

وہ حیرانی سے ہنسے، بلاشبہ وہ ہنستے ہوئے اچھے لگتے تھے۔

"میں تو ہر روز ایکسپلائٹ ہوتا ہوں، اس میں اتنی بے یقینی والی کون سی بات ہے؟"

"مگر...... پھر آپ مجھے ایکسپلائٹ ہونے سے کیوں بچانا چاہتے ہیں؟" اسے دکھ ہوا یا غصہ آیا تھا...... وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔

"میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں، آپ کو ابھی گزارنی ہے۔"

"میرا خیال ہے سر، انسان تب تک اپنی زندگی نہیں گزار چکا ہوتا، جب تک کہ اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائی جا رہی ہو، میری زندگی بھی اتنی ہی پڑی ہے جتنی کہ آپ کی۔" پارس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ مسکرا کر سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے رہے، بولے کچھ نہیں۔

"مگر میں نہیں مان سکتی کہ آپ جیسے ذہین اور مضبوط آدمی کو کوئی ایکسپلائٹ کر سکتا ہے۔"

"ہم جتنے مضبوط ہو جائیں پارس، رشتے ہماری سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں، ہم نہ ان سے بھاگ سکتے ہیں، نہ بھاگنا چاہتے ہیں، میں خود کو انہیں ایکسپلائٹ کرنے دیتا ہوں، یہ دیکھنے کے لیے کہ میری آخری حد کیا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے بھی کہ اُن کی آخری حد کیا ہے......"

وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی...... سارے الفاظ جیسے کھو گئے تھے، اس آدمی میں ایک عجب وقار و تمکنت تھی، سحر تھا۔

"اور دس سال بعد ادائیگی، سر......؟ مجھے تو اس بات کا کوئی چانس نہیں لگتا کہ دس سال بعد ہم ایک دوسرے کو ڈھونڈ بھی پائیں گے۔"

"and thats the whole idea"

وہ مسکرا کر کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، پارس نے بری طرح چونک کر انہیں دیکھا۔ یعنی وہ قرض واپس لینا چاہتے ہی نہیں تھے؟

وہ ان کو پکارنا چاہتی تھی مگر نہیں پکار سکی۔ رضوان حیات جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پُول کے ساتھ ساتھ چلتے دور جا رہے تھے، وہ بس انہیں دیکھتی رہی۔ پول کا پانی سنہری روشنی میں چمکتا رہا جیسے نیلے پتھر پہ سونے کے پانی کی تہ چڑھا دی گئی ہو...... جیسے آسمان کا عکس نیلے آئینے میں سنہری دِکھ رہا ہو......

پارس نے سر جھٹک کر فریم واپس رکھا پھر آگے آ کر اپنے گلاسز اٹھائے اور چند قدم دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ رک گئی۔ یوں جیسے آنکھ کے کنارے سے اس نے کچھ دیکھا، کچھ ایسا جو اسے کھٹکا ہو۔

وہ الٹے قدم واپس آئی اور میز کی درازوں کے پاس رکی، اوپر تلے کی تین درازیں بند پڑی

تھیں البتہ...... پہلی دراز کی درز سے کاغذ کا ٹکڑا جھانک رہا تھا جیسے فائل اندر ڈالتے ہوئے اس کا کنارہ پھنس گیا ہو۔

پارس نے دراز باہر کو کھینچی وہ کھل گئی اوپر والی فائل اس نے ٹھیک سے اندر کی اور دراز واپس بند کی پھر نچلی درازیں دیکھیں وہ لاکڈ تھیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں تشویش اتر آئی۔

''میں نے خود یہ دراز لاک کی تھی، یہ کس نے کھولی؟'' وہ خود سے بڑبڑائی پھر بے اختیار سر اٹھا کر کاریڈور کو دیکھا، وہ اب خالی تھا، فائز کب کا جا چکا تھا۔

پارس نے تیزی سے ریسیور اٹھایا، ایک نمبر ملایا پھر آپریٹر سے کسی خواجہ طارق صاحب سے بات کرنے کی درخواست کی، قریباً پانچ منٹ بعد وہ اُن سے ہمکلام تھی۔

''خواجہ صاحب، میں مسز پارس رضوان حیات بات کر رہی ہوں۔''

''جی مسز پارس، کیسی ہیں آپ؟ کہیے، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''مجھے ذرا فائز حسن کے بارے میں معلومات لینی تھیں، وہ پہلے آپ کی یعنی لاہور والی برانچ میں کام کرتے تھے، اب میرے فنانشل ایڈوائزر ہیں۔'' وہ بات کرتے ہوئے مضطرب سی بالی پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

''جی، پوچھیں۔''

''کیا آپ ان سے واقف ہیں؟ کس قسم کے انسان ہیں فائز صاحب؟''

''جی، میں انہیں جانتا ہوں، میرے انڈر کام کرتے تھے، بہت شریف اور دیانتدار ہیں، محنتی بھی بہت ہیں، اُن کے گھر میں ان کے علاوہ کمانے والا کوئی نہیں ہے، ان کی بہنیں......'' وہ چند منٹ تک سنتی رہی، اس کے چہرے پر اطمینان اترنے لگا پھر بھی پیشانی کا ایک بل وہیں تھا کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ فائز صاحب اپنے پہلے باس کے لیے اپنے نئے باس کی جاسوسی کرنے کے اہل ہیں؟'' اس نے ''فیضان'' اور ''پارس'' کو بولڈ ورڈز میں کہا۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔''

''اور میں یقین کر لوں خواجہ صاحب کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ اپنے مکمل ایمان کے ساتھ کہہ رہے ہیں اور یہ سب آپ کو فیضان صاحب نے کہنے کو نہیں کہا؟''

خواجہ صاحب بری طرح چونکے اور گڑبڑائے مگر اپنی آواز کو انہوں نے ہموار رکھا۔

''رضوان صاحب مجھ پر اعتبار کرتے تھے آپ بھی کر سکتی ہیں۔''

اس بات پر پارس کی پیشانی کا آخری بل بھی غائب ہو گیا۔ وہ ایک دم شانت سی ہو گئی۔ اس نے سمجھ کر سر ہلایا فون بند کر کے اس نے دراز کو دیکھا اور پھر اپنی چابی نکال کر اسے لاک کیا۔

''میں بھی paranoid ہوتی جا رہی ہوں۔ خود لاک کرنا بھول کر دوسروں پر شک کرنے لگی ہوں۔'' خود کو خفا انداز میں مخاطب کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

کمرے میں مدھم روشنی تھی، لیپ ٹاپ کی اسکرین کی روشنی جو فیضان کے چہرے کو چمکا رہی تھی، وہ توجہ اور دھیان سے اسکرین پر کچھ پڑھ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے سر ہلاتا جیسے سمجھ آ رہی ہو پھر اس نے چند بٹن دبائے اور پرنٹر سے آوازیں آئی زوں زوں کی آواز کے ساتھ چند کاغذ پرنٹ ہو کر نکلے۔ اس نے یکے بعد دیگرے اُن کو پھر سے پڑھا اور ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

''سویرا آپا، آپ ٹھیک تھیں، تنویر بھائی کہیں نہ کہیں

ملوث ہیں۔'' وہ ان کاغذات کو پڑھتا کہہ رہا تھا۔

''کیا مطلب...... ؟ اور تمہیں کیسے پتا؟'' وہ جیسے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''رضوان بھائی کی موت سے اگلی دوپہر پارس نے اپنے اور بھائی جی کے مشترکہ اکاؤنٹ سے ایک بھاری رقم نکلوائی اور اسی دن وہ رقم تنویر بھائی کے اکاؤنٹ میں منتقل کی گئی۔ میں نے اس اکاؤنٹ نمبر کو چیک کیا ہے، جس کے نام کی ڈپازٹ سلپ مجھے ملی ہیں، یہ تنویر بھائی کا اکاؤنٹ نمبر ہے۔''

''اوہ...... مگر تمہیں ڈپازٹ سلپ کہاں سے ملیں؟''

''پارس کے ساتھ کام کرتا ہوں اور اس کی چیزوں تک رسائی اتنی مشکل بھی نہیں ہے۔'' وہ اب پھر سے لیپ ٹاپ پہ کچھ بٹن دبا رہا تھا، پرنٹر آواز دینے لگا۔

''مگر اس نے تنویر کو پیسے کیوں دیے؟''

''یا تو وہ شروع سے اس کھیل کا حصہ ہوں گے یا بعد میں انہیں کچھ خبر ہو گئی ہوگی اور زبان بندی کی رقم ان کو دی گئی ہوگی۔''

''مگر فیضی...... پھر کیا پارس تمہاری اصلیت جانتی ہے؟''

اور یہیں آ کر فیضی الجھ گیا۔

''اگر تنویر بھائی اور پارس ملے ہوئے ہیں تو وہ جانتی ہوگی اور وہ ملے ہوئے ہیں مگر...... وہ نہیں جانتی...... اس کے انداز سے نہیں لگتا۔'' وہ کنفیوزڈ تھا۔

''تنویر صاحب نے پارس کو پھر کیوں نہیں بتایا؟''

''یہاں آ کر آپا میں الجھ جاتا ہوں کیونکہ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ تنویر بھائی کی وفاداری کس کے ساتھ ہے، میرے یا پارس۔ یا وہ ہم دونوں سے ہی مخلص نہیں۔''

چند لمحے خاموشی رہی...... پھر سویرا آپا نے جیسے سر پہ ہاتھ مارا۔

''یاد کرو فیضی، تنویر صاحب نے تمہیں بھائی جی کے مرنے کے فوراً بعد بتایا تھا کہ ان کے سر کی پشت پہ ایک نوکیلی چیز سے کیے گئے زخم کا نشان تھا۔''

''جی اور جب میں اِدھر آیا تو انہوں نے اس بات کو ٹالنا چاہا مگر میرے اصرار پہ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اب بھی اسی بات پر قائم ہیں۔'' وہ جیسے کچھ سمجھ رہا تھا۔

''وہ زخم تنویر صاحب کے علاوہ افضل بابا نے بھی دیکھا تھا، فیضی، اگر پارس نے تنویر صاحب کو tip کیا ہے تو افضل بابا کو بھی کیا ہوگا۔''

''ایک تو یہاں کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ پارس کی پارٹی کون ہے اور ہماری پارٹی کون ہے؟'' وہ جھنجلایا۔ ''خیر جب تک میں افضل بابا سے دوبارہ بات کرتا ہوں۔ آپ وہ کریں جو میں نے کرنے کو کہا تھا۔''

''یعنی تمہارے منصوبے کا دوسرا اسٹیپ۔''

''جی...... اب وقت آ گیا ہے کہ رضوان حیات کی بہن مری آئے اور اپنے بھائی جی کے قتل کی ایف آئی آر درج کروائے۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا، وہ ابھی تک کامیاب جا رہا تھا۔

''بے فکر رہو، میں ویک اینڈ تک پہنچ جاؤں گی۔''

فیضی نے فون رکھا اور مسکرا کر ان پرنٹ آؤٹس کو دیکھا اسے لگا اس کے دشمن اپنی قبر خود کھود رہے ہیں۔

☆☆☆

افضل بابا نے دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا اور ذرا سا کھولا، پارس سنگار میز کے سامنے بیٹھی، جھک کر دراز میں کچھ رکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں دیکھا جس کا عکس چوکھٹ میں کھڑے افضل بابا کو دکھا رہا تھا۔

''جی بابا؟'' مڑے بغیر عکس کو دیکھتی وہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے دائیں بالی کا ہک کھولنے لگی۔

''کوئی شجاع طاہر صاحب آئے ہیں، میں نے انہیں لان میں بٹھایا ہے، آپ کو پوچھ رہے ہیں۔''

بالی کا کنڈا کھولتے اس کے ہاتھ رکے بلکہ

نیچے آگرے، وہ اسٹول پہ بیٹھے، بیٹھے پوری پلٹی۔

''کیا...... کیا فیروزہ بیگم گھر پر نہیں ہیں؟''

''وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہیں۔''

''اچھا، میں آرہی ہوں۔'' وہ دھیرے سے واپس آئینے کی طرف مڑی، عکس میں افضل بابا پلٹ کر جاتے دکھائی دیے۔ پارس نے پھر سے بالی کے کُنڈے کو چھوا۔ وہ اسے اتارنا چاہ رہی تھی یا وہ اسے نہیں اتارنا چاہ رہی تھی۔

آئینے سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں ایک دم اضطراب اور بے چینی در آئی۔ غصہ بھی، بے بسی بھی، انتظار بھی مگر بے پروائی بھی...... وہ زندگی کے ان لمحوں میں سے ایک لمحہ تھا جب انسان بیک وقت متضاد کیفیات کا شکار ہوتا ہے۔ وہ خوش بھی ہوتا ہے' ناخوش بھی۔ پریشان بھی اور ایکسائٹڈ بھی۔ وہ اپنی فیلنگز کو سمجھ نہیں پارہا ہوتا...... مگر اندر کہیں اور وہ اپنی فیلنگز کو بالکل ٹھیک، ٹھیک سمجھ پارہا ہوتا ہے۔

اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے شعوری طور پر اَن مٹ کہانیوں کی تلاش کی...... جیسے جادوگر بچوں کے انگوٹھوں پر زعفران کی روشنائی لگا کر انہیں جن کو بلانے کا حکم دیتے ہیں، اس نے بھی بِنا آواز کے آئینے کو حکم دیا ہے کہ وہ کوئی یاد اس کے سامنے لے آئے جو شجاع سے ملنے سے قبل اس کو ڈھارس دے اور اس کے رویے کو ری شیپ کرنے میں مدد دے۔ اور دائیں، بائیں اور بائیں کو دائیں دکھانے والے آئینے نے فوراً تعمیل کی۔

اس کی شفاف سطح پر بلبلے سے بنتے گئے جیسے کسی نے پانی میں پتھر پھینکا ہو اور ان سے بنتے دائروں میں ان مٹ کہانیاں پھر سے ابھرنے لگیں۔

وہ فون کا ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی، سولہ سترہ برس کی لڑکی جس کے چہرے پہ ہیجان وخوف تھا، اس کی بالیاں کانوں میں نہیں تھیں، نگاہیں بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتیں کہ کہیں کوئی آنہ جائے۔

''تم میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟'' وہ دوسری جانب شکوہ کررہا تھا۔ لڑکی کا ضبط جواب دینے لگا۔

''جواب؟ تمہارے خط کا......؟ شجاع پہلے میری بات کلیئر کرلو، میں نے تمہیں فون تمہارے خطوں کا جواب دینے کے لیے نہیں کیا بلکہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''مگر تم نے میرا حال تک نہیں پوچھا۔''

پارس نے بے چینی سے کھڑکی سے باہر دیکھا، بیرونی برآمدہ سنسان تھا اور دروازہ اندر سے بند۔ نہ جانے کب وہ دھڑ دھڑانے لگے۔

''شجاع...... تم...... تم کیوں مجھے خط لکھتے ہو؟''

''کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے......'' باہر جا کر وہ نڈر ہوگیا تھا یا شاید بے باک...... لڑکی کو ماتھے پہ پسینہ آنے لگا۔

''شجاع...... پلیز...... میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے خط مت لکھنا اور تم پھر مجھے خط لکھنے لگ گئے ہو۔''

''میرا دل چاہتا ہے تم سے بات کرنے کو۔''

''تمہیں صرف اپنے دل کی پروا ہے، میری عزت کا کوئی خیال نہیں؟ تمہارا خط ملنے کے بعد تمہی اور تمہاری بہنیں مجھے کیسی باتیں سناتی ہیں، امی اور شکیل میرا کیا حال کرتے ہیں، تمہیں کوئی احساس ہے؟''

''تم لوگوں کی باتوں کی پروا کیوں کرتی ہو...... تم بس......؟''

''میں لمبی بات نہیں کرسکتی۔ بس میری آخری بات سن لو، آئندہ مجھے خط مت لکھنا، کسی صورت نہیں، سنا تم نے؟'' اور اس نے فون رکھ دیا۔ دل دھڑ دھڑ کررہا تھا۔ پلٹ کر اس نے گھڑی کو دیکھا۔ دو ڈھائی منٹ کی کال کی تھی۔ بل میں کیا پتا چلے گا اور کون سا امی بل چیک کرتی تھیں۔ اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

پانی کی سطح پر بنتے دائرے غائب ہونے لگے۔

پارس نے بالی کا کُنڈا بند کردیا اور اٹھ کھڑی ہوئی، بالیاں اتارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بالوں میں ذرا سا ہاتھ پھیر کر ان کو سنوارتی باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

لان میں مغرب کا اندھیرا پھیلا تھا گہری ملاہٹ...... دن کا سب سے زیادہ depressing وقت، جب خوش سے خوش انسان پر بھی قنوطیت اور اداسی چھا جاتی ہے، ایسی اداسی جس کا توڑ مکمل روشنی یا مکمل اندھیرا ہونے سے قبل ہو ہی نہیں سکتا۔

لان چیئر پر فیروزہ مائی ٹانگ پر ٹانگ جمائے بڑی نخوت سے کرید کرید کر شجاع سے سوال کررہی تھی جو جینز اور سوٹ شرٹ میں ملبوس مہذب انداز میں بیٹھا شائستگی سے جواب دے رہا تھا۔ پارس کو آتے دیکھ کر احتراماً اٹھا، فیروزہ مائی نے بھی اس کی سمت دیکھا۔

''دیکھو پارو، شجاع آیا ہے، اتنے سال بعد اسے ہمارا خیال آہی گیا۔'' پارس سلام کہتی کرسی پر آبیٹھی، تمکنت اور وقار سے، کمر سیدھی رکھے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے۔

''شجاع کہہ رہا ہے تجھ سے ہوٹل میں ملا تھا، تُونے تو نہیں بتایا؟'' فیروزہ مائی کے انداز پر وہ جیسے شرمندہ ہوگیا۔ پارس نے ایک نظر ماں پر ڈالی۔

''میں کب تمہیں ہر بات بتاتی ہوں؟ پہلے کبھی بتائی ہے؟'' اب شرمندہ ہونے کی باری فیروزہ مائی کی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' وہ کہنے لگا۔ آنکھوں کا وہی دھیما نرم تاثر جو دل پگھلا دے۔

''فائن تھینکس۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے، سر کو جنبش دی۔

''کیا کرتے ہو برطانیہ میں؟'' فیروزہ مائی پھر سے پوچھنے لگی۔

''چھوٹا سا کاروبار ہے، اپنے اسٹورز کی ایک

روح کی غذا

یہ شادیوں میں میوزک کیسا عجیب وغریب بجتا ہے...... ڈھش...... ڈھش ٹک......ڈھش ڈھش ٹک...... جس کے ردھم کی چوٹ دماغ پر لگتی ہے۔ سر میں درد کھانا کھانے سے پہلے اتنا شدید ہوجاتا ہے کہ دو پلیٹ بریانی کھانے والا مشکل سے آدھی پلیٹ ہی کھا پاتا ہے۔ یوں کم کھانے میں زیادہ مہمان علیحدہ نمٹ جاتے ہیں اور یہ میوزک سن کر بس یہی دل چاہتا ہے کہ میزبان کو اپنا گفٹ دے کر باہر کی طرف دوڑ لگادی جائے...... جبکہ بعض تقریبات میں سارنگی کی ایسی میٹھی دُھن بجتی ہے...... چیوں...... چیوں...... چوں...... کہ سکون سا ملتا ہے۔ طبیعت میں طمانیت، شگفتگی ایسی چھاتی ہے کہ اگر شادی کے کھانے میں قلفی ہو تو ایک کی جگہ چار کھالی جاتی ہیں۔

(انجم انصار کے ناول محبت ہم سفر میری سے اقتباس)

مرسلہ: بختاور بلوچ' لوہی بلوچستان

چین جو چند ایک شہروں میں ہے۔''

''بڑی ترقی کرلی تم نے مگر تعلیم مکمل کی یا نہیں؟''

''جی، ساتھ میں پڑھائی بھی مکمل کرلی تھی۔'' وہ متانت سے جواب دے رہا تھا۔

''اور تمہاری ماں اور بہنیں...... اب کہاں ہوتے ہیں سب؟''

''دو بہنوں کی شادی ہوگئی تھی، دو ابھی امی کے ساتھ رہتی ہیں، وہیں لاہور میں۔''

''ہاں ہم سے کبھی ملنے آتے تو ہمیں پتا ہوتا، پیسے کی چکا چوند دیکھ کر تمہارے گھر والے تو سب بھول گئے تھے۔ محلہ کیا بدلا، سارے رشتے ناتے توڑ دیے مگر خیر......'' فیروزہ مائی نے ایک فاتحانہ نگاہ بنگلے پر ڈالی۔ ''ہمیں بھی سوہنے رب نے بہت دولت دے دی ہے۔ پارس کے شوہر رضوان صاحب اور اس کے

ہوٹلز کا تو علم ہوگا تمہیں۔"

"جی، انہیں بخوبی علم ہے۔" پارس جو خاموشی سے سن رہی تھی، شجاع کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پہلی دفعہ مسکرا کر بولی۔ شجاع نے نفی میں سر جھٹکا۔

"علم ہے مجھے...... میں پچھلے سال آنا چاہتا تھا آپ کے پاس مگر تب معلوم ہوا پارس نے شادی کرلی ہے، سو میں رک گیا...... پھر رضوان صاحب کی وفات کا پتا چلا......" پارس کے چہرے پر تکلیف اور اذیت ابھری...... وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے سوچا وہ عدت ختم کرلے تو میں مل لوں گا...... اور اب عدت ختم ہونے کے بعد اس مہینے سے جیسے ہی پارس نے سب سے ملنا شروع کیا، ہوٹل جانے لگی میں بھی چلا آیا۔"

"ہاں اسی وقت کا انتظار تھا مجھے...... رضوان کی ڈیتھ کے چھٹے مہینے میں نے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا تھا، جانتی تھی بہت سے لوگ اب ملنے چلے آئیں گے۔" وہ پھر سے مسکرا کر بولی جیسے مسلسل شجاع کو جانچ رہی ہو۔

"اس کے بہن بھائی تو آئے ہی نہیں۔" فیروزہ مائی کو بے موقع محل یاد آیا۔

"آئیں گے، ضرور آئیں گے، چھ ماہ سے انتظار کر رہی ہوں، وہ سر کے بل آئیں گے امی۔" وہ دھیرے سے بولی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، عجیب سی مسکراہٹ جو پارس کا خاصہ نہیں تھی۔

فیروزہ مائی کا فون آگیا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ پارس اور شجاع تنہا تھے یا پھر مغرب کا نیلا اندھیرا۔

"کیسے آدمی تھے رضوان صاحب؟" وہ ازراہِ تذکرہ پوچھنے لگا۔

"بہت اچھے......" پارس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

"ڈیتھ کیسے ہوئی اُن کی؟"

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ آنکھوں میں چبھن اتری۔

"وہ...... سیڑھیوں سے گر گئے تھے۔" اس نے اب کی بار دو حصوں میں فقرہ مکمل کیا۔ یہ فقرہ وہ ایک حصے میں مکمل کر ہی نہیں سکتی تھی۔

"آگے کا کیا سوچا ہے تم نے؟"

"ہوٹل سنبھالوں گی اور رضوان کو یاد کروں گی ساری عمر...... بس۔" پارس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے بظاہر بے پروائی سے شانے اچکائے۔

"کیا اب بھی تمہارے اندر تبدیلی کی خواہش نہیں ہے؟" وہ بہت اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پرانی باتیں مت یاد کراؤ شجاع...... میں نے اگر انہیں یاد کیا تو تمہاری طرف لمبا کھاتا کھلے گا۔"

"تم نے کہا تھا خط نہ لکھو، میں نے نہیں لکھا پھر کہا فون نہ کرو، میں تمہاری آواز سننے سے بھی محروم رہا...... میں نے ہمیشہ تمہاری خوشی مقدم رکھی۔"

"میں نے کہا ناں پرانی باتیں مت یاد کراؤ...... لمبا کھاتا کھلے گا ورنہ تمہاری طرف۔" قدرے سختی سے آگے ہو کر اس نے تنبیہہ کی۔ وہ خاموش ہوگیا مگر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا۔

"میں تمہیں بہت مس کرتا ہوں پارس۔"

"تمہیں میرا خیال تب کیوں آیا جب میں ایک امیر بیوہ بن گئی ہوں؟ آٹھ سالوں میں پہلے بھی میری یاد کیوں نہیں آئی؟ اسی وقت کیوں مجھ سے ملنے آئے ہو جب میں نے ہوٹل سنبھالنا شروع کیا؟" وہ آگے ہو کر، سختی سے بولی اس کی آنکھوں میں طیش تھا، غصہ تھا اور ہر وہ جذبہ تھا جس سے آگ کی لپٹیں نکلتی تھیں۔

"میں تمہارے پاس کچھ بن کر آنا چاہتا تھا، میرے پاس اتنا کچھ ہونا چاہیے تھا کہ تائی مجھے انکار نہ کر پائے مگر مجھے بہت دیر ہوگئی۔ جب تک میں آیا تمہاری رضوان حیات سے شادی ہو چکی تھی۔"

"اچھی کور اسٹوری ہے مگر نہیں، مجھے یقین نہیں آیا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی، گردن سیدھی رکھے۔ اس نے سرد شعلوں میں ڈوبی نگاہوں سے کرسی پر بیٹھے شجاع کو دیکھا۔ "ہمارے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے، تم جب آنا چاہو، آجاؤ، ملنا چاہو، مل لو مگر مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا...... میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔"

شجاع ساتھ ہی کھڑا ہوا۔ پارس جانے کے لیے پلٹی۔

"تم اب بھی وہی بالیاں پہنتی ہو جو میں لایا تھا۔ تب یہ اس لیے تھا کہ یہ تمہاری خود پہ خرچ کرنے والی پہلی کمائی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ اب کس لیے ہے جبکہ تمہارے پاس خود پہ خرچ کرنے کو کروڑوں روپیہ ہے؟"

پارس کے قدم زنجیر ہوگئے مگر وہ مڑی نہیں، نہ ہی کچھ بولی۔

شجاع چلتا ہوا عین اس کے پیچھے آرکا۔

"میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا، سو روپے کی بالی کو پچاس کی کہہ کر لایا تھا یہ وہ پہلا اور آخری جھوٹ تھا جو میں نے تم سے بولا مگر یہ ایسا جھوٹ تھا جو اعتبار گھٹانے نہیں، بڑھانے کے لیے ہوتا ہے لیکن تم پھر بھی مجھ پہ اعتبار نہیں کرتیں۔" وہ یہ کہہ کر ایک نظر اس کے بالوں سے ڈھکی پشت پر ڈال کر واپس پلٹ گیا۔ پارس سن کھڑی رہ گئی۔ سانس روکے، بالکل منجمد...... پھر اس کی آنکھوں کے کٹورے بھرنے لگے...... سیاہ سفید پیالے میں سرخی اور پانی ابھرا...... دو آنسو ٹوٹ کر گالوں پر لڑھکے۔

اس نے چہرہ موڑا...... شجاع گیٹ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

"پرانی یادیں مت دُہراؤ ورنہ تمہاری طرف لمبا کھاتا کھلے گا شجاع......!" وہ بھیگی آواز میں خود سے بڑبڑائی۔

☆☆☆

تنویر صاحب کمپیوٹر پہ کچھ ٹائپ کر رہے تھے۔ ان کے آفس کا شیشے کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ فیضان نے انگلی سے دروازہ بجایا۔ تنویر صاحب نے چونک کر سر اٹھایا پھر مسکرائے۔

"آؤ......" ساتھ ہی عینک اتار کر ایک طرف رکھی اور سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گہری نظروں سے انہیں دیکھتا کرسی پر آبیٹھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اس کا انداز یوں تھا جیسے تنویر صاحب کو پہلی دفعہ دیکھا ہو۔

"کہو، کام کیسا جا رہا ہے؟"

"حیران کن حد تک کامیاب......"

"گڈ......" وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "رضوان کی موت یا قتل کا معما حل ہوا یا نہیں؟"

"بس قریب ہوں۔" وہ ضبط سے مسکرایا۔

"تمہارے نزدیک culprit کون ہے؟" وہ گرم لوہے کو چھو کر ہاتھ ہٹا دینے کا کام شروع کر چکے تھے۔

"پارس اور اس کا ساتھی۔"

"ساتھی......؟" تنویر صاحب نے ابرو اٹھائی، وہ جیسے بالکل ٹھہر گئے تھے۔

"جی، اس کا ساتھی جو اس کے ہمراہ قتل اور قتل کے بعد کے تمام معاملات سنبھالتا رہا ہے، ہر غلط چیز کو ٹھیک کرنے کی ذمے داری اس کی ہے اور اس کے بدلے پارس نے اسے ایک بھاری رقم بھی دی ہوگی۔"

"ہوں، کون ہوسکتا ہے اس کا ساتھی؟" وہ جواب کا انتظار کرنے کے بجائے اس کے چہرے پر جواب کھوج رہے تھے۔

"کوئی تو ہے، کوئی قریب کا آدمی......"

"پارس کا کزن شجاع طاہر تو نہیں ہے؟ آج کل بہت چکر لگ رہے ہیں اس کے۔" فیضان ہنس دیا۔ وہ اس کے شک کا رخ پھیر رہے تھے۔

"ہاں، وہ بھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال، مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔"

"کہو......" وہ متوجہ تھے۔ ذرا پُرسوچ بھی لگ رہے تھے۔

"سویرا آپا یہاں آگئی ہیں، آج وہ پارس سے ملنے جا رہی ہیں۔"

"او... وہ شیخ ہوگئے... کب آئی سویرا؟"

"تین دن پہلے۔"

"اور تم اب بتا رہے ہو؟"

"وہ تو ابھی تک قانونی کارروائی نمٹا رہی تھیں، اب سب ٹھیک ہے تو پارس سے ملنے جائیں گی۔" وہ پہلی دفعہ تم مسکرایا۔

"کیسی قانونی کارروائی؟"

"کچھ سر پر مت چڑھے رہیں تنویر بھائی۔" وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہوا۔ "مجھے دس کام ہیں، چلتا ہوں۔" انہوں نے اسے کچھ نہیں روکا۔ وہ ذرا پریشان لگ رہے تھے، وہ مجھے دروازے سے باہر تک اور اس کا سنتوں کی آواز میں رک گیا۔ اندر بیٹھے تنویر صاحب کو وہ نظر نہیں آ رہا تھا، وہ متوجہ تھے بھی نہیں۔ انہوں نے جلدی سے موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

کیسی بھی وہاں کھڑا بظاہر اپنے موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔

"تنویر بات کر رہا ہوں، ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔" اندر سے مدھم سی آواز آئی۔ فیضان کا سارا وجود کان بن گیا۔

"سویرا آرہی ہے، نہیں یہ مسئلہ نہیں، یہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی قانونی کارروائی کی بات کر رہی ہے... مجھے اپنے داماد سے علم ہوا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ..." وہ آگے کچھ کہہ رہے تھے، فیضان نے اپنا انداز آتے دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ بقیہ اس نے سنا تک نہیں تھا۔

☆☆☆

پارس موبائل کان سے لگائے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک انوکھی معصومیت اور اداسی تھی۔ وہ اپنی سنگار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔

"سویرا آرہی ہے... چلیں پارٹی اچھی رہے گی۔"

"مگر مسئلہ وہی ہے... وہ کیوں کارروائی کی بات کر رہا ہے، میں نہیں سمجھ پا رہی، کرنے جا رہی ہے تو..." انہوں نے تیوری چڑھا لیا۔

"آپ کے خیال میں وہ کیا کر سکتی ہیں؟ جیسے پہلے نہیں تھی، ابھی بھی منتظر رہی تھی۔"

"میں بھی تو سوچتی ہوں کہ..."

"مگر آپ کو کس نے بتایا کہ وہ آرہی ہیں؟" اس نے شاید تیسری بار پوچھا۔

"میرے اپنے سورسز ہیں۔" پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ لیے پارس مسکرائی۔

"میں سوچوں گی، بے فکر رہیں، میں اکیلی بات کروں گی۔"

"جی!" انہیں یاد آنے پر وہ اٹھے، مسکرا کر دیکھا۔

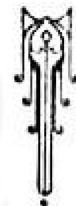
"آپ کے مہمان آئے ہیں۔"

"آرہی ہوں۔" ساتھ ہی وہ فون بند کرتے دھیرے سے بولی۔ "وہ آگئی ہیں، میں تھک گئی ہوں۔" کیلنے میں فون بند کر کے وہ باہر آگئی۔ سیڑھیاں اتر کر لاؤنج کراس کر کے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر رکی۔ اندر صوفے پر سویرا بیٹھی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر آگے آئی، جال ٹیرا چہرہ بتایا اور قدم رکے، اس وقت اس کے چہرے پر بہت سطحی سی محبت بھری مگر بہت بے مہر مسکراہٹ تھی اور اس مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فیروزہ کو سامنے بیٹھے اپنے صوفے پر بیٹھا دیکھا... اور پارس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی، اسے دھچکا لگا۔

فیضان کی کوشش نے اثر دکھایا یا ایک اور رخ... مگر کیا سویرا اور پارس کی ملاقات کا انجام کیا رہا یہ سب ضرور پڑھیے اگلے ماہ



مکمل ناول



پارس

نمرہ احمد

تیسرا حصہ

"شکیل!" اس کی آواز بہ مشکل نکل پائی۔ سیاہ پینٹ کوٹ اور پیلی شرٹ میں ملبوس، گھنی مونچھوں اور شاطر آنکھوں والا شکیل اسے اندر آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، میں...... کیا اچھا نہیں لگا میرا آنا؟" پارس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر فیروزہ مائی کو جو بیٹے کی اچانک آمد پر خوش بھی تھی اور حیران بھی۔

''نہیں...... کیسے ہو؟'' وہ دھیمی آواز میں کہتی کھڑے کھڑے ہی پوچھنے لگی۔ ابھی تک وہ سنبھل نہیں پائی تھی۔

''کیسا ہونا ہے؟ پیسے نہیں تھے، سارا کاروبار ٹھپ ہوگیا، سب چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔'' الفاظ کے برعکس وہ خوشدلی سے کہہ رہا تھا۔ ''سوچا بہن کے گھر کچھ دن رہ لوں، عیش کرلوں، پھر پنڈی میں کوئی نوکری ڈھونڈتا ہوں، ماں کو بھی ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ ساری زندگی تم نے پالا ہے، اب مزید تم پہ کہاں بوجھ بنیں۔'' فیروزہ مائی ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی۔ شکیل کیا کہہ رہا تھا، اس کی سمجھ سے باہر تھا، پارس نے... بہ مشکل اثبات میں سر ہلایا۔

''جیسے تم چاہو، مجھے ذرا کام ہے پھر ملاقات ہوتی ہے۔'' وہ جانے کے لیے مڑی۔ اسی پل افضل بابا چائے کی ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا۔

''سنو بابا، میرے لیے کوئی اچھا سا کمرا سیٹ کرادو اور میرے بیگ سے سارا سامان نکال کر الماریوں میں لگادو، ابھی تو کچھ دن ہوں میں اِدھر۔'' واپس صوفے پر آرام سے ٹیک لگائے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتے ہوئے شکیل بولا تھا۔

پارس بہ مشکل ضبط کرتی باہر آئی پھر پلٹ کر ستون کی اوٹ سے جالی دار پردے کے پار دیکھا۔ وہ ایسے بیٹھا تھا جیسے اس کے باپ کا گھر ہو۔ پردے کی جالی سفید تھی اور اس میں پھولدار سیلف پرنٹ بنا تھا۔ پھول بوٹوں کے درمیان بہت سے خالی سوراخ تھے۔ لمحے بھر کا عمل تھا کہ ان سوراخوں میں رنگ بھرنے لگے۔ بس سیاہ، سفید اور سرمئی رنگ، بلیک اینڈ وائٹ فلم......

''میں اچھی طرح پہچانتا ہوں یہ کوڈ...... یہ انگلینڈ کا نمبر ہے۔ کس نے فون کیا ہے انگلینڈ؟'' وہ کانوں سے نیچے تک آتے بالوں والا لڑکا ایک کاغذ پڑھتے ہوئے غصے سے بول رہا تھا۔

سامنے کھڑی بالیوں والی لڑکی کا رنگ سفید پڑ چکا تھا جیسے وہ کوئی مردہ لاش ہو۔ اگر اس وقت کوئی اسے چھوکر دیکھتا تو شاید وہ برف سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی۔

''امی نے نہیں کیا، میں نے نہیں کیا...... پھر تو نے ہی کیا ہوگا۔ بول۔ کس کو کیا ہے فون؟'' وہ سرخ بھبھوکا چہرہ لیے غرّایا تھا۔ ساتھ ہی بل پرے پھینکا۔ ہوا نے کاغذ کے ٹکڑے کو چند غوطے دیے اور وہ پارس کے قدموں میں آن گرا۔ پارس اسی طرح ہولے ہولے کانپتی شکیل کو دیکھ رہی تھی۔ الفاظ لبوں سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔

''اسی شجاع کو کیا ہوگا اور کسے کرے گی۔ ہونہہ۔'' فیروزہ مائی قہر آلود آنکھوں سے اسے دیکھتی بولی۔ ''دیدہ دلیری تو دیکھو۔ گھر کے فون پہ اپنے اس...... سے باتیں کرتی ہے اور سمجھتی ہے کسی کو پتا نہیں چلے گا۔'' فیروزہ مائی نے گھٹیا انداز میں کہا۔

''بتا، کیوں کیا تھا فون؟ کیوں بات کرتی ہے اس سے؟'' شکیل آگے بڑھا اور اس کی پونی سے پکڑ کر بالوں کو جھٹکا دیا۔ سفید برف کے مجسمے کی چیخ نکلی۔

''بس ایک بار کیا تھا، امی مجھے معاف کردو۔ صرف ایک بار......'' وہ کراہنے لگی مگر شکیل تابڑتوڑ اس کے سر، چہرے اور گردن پر تھپڑ مارنے لگا۔ اس کی چیخیں، سسکیاں اور کراہیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ وہیں صحن میں گرگئی شکیل کے قدموں میں اور وہ اسے ٹھڈوں اور تھپڑوں سے مار رہا تھا۔ فیروزہ مائی چارپائی پہ بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی۔

''طبیعت صاف کردے آج اس کی۔ بہت برداشت کرلیا ہم نے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس نٹ پونجیے کو باہر جانے کے لیے پیسے بھی اسی نے دیے ہوں گے۔'' وہ بولی تو صرف اتنا۔

''نہیں...... امی...... میری بات سنو...... بھائی پلیز......'' شکیل غصے میں چیختا اور زور سے اسے مار رہا تھا، وہ آہوں اور سسکیوں کے درمیان کچھ بولنے کی سعی کرتی رہ گئی مگر وہ نہیں رکا۔ دھندلے ہوتے منظر میں اسے اتنا ضرور نظر آیا تھا کہ صحن کی دیوار کے اوپر سے شجاع کی بہنیں جھانک رہی تھیں...... پھر دھندی ہر سو چھاتی گئی...... گیلی دھند...... جالی دار دھند......

جالی دار پردے کے پار شکیل جھک کر ٹرالی سے پیسٹری اٹھا رہا تھا۔ پارس نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بہ مشکل خود کو calm down کرتے ہوئے تلخی سے مسکرائی۔

''رہو کچھ دن ہمارے ساتھ شکیل کیونکہ خدا کی قسم، میں کچھ نہیں بھولی۔'' زیرلب بڑبڑا کر وہ پلٹ گئی۔

☆☆☆

پتھروں کا بنا بڑا سا بنگلا عرصے بعد آباد نظر آرہا تھا۔ مخروطی چھت، اونچے ستونوں کا طویل برآمدہ اور سامنے کھلا سا لان جو ڈھلان کے اوپر بنا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوکر دیکھو تو دور، دور تک پھیلی پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ گھر بلاشبہ پارس کے گھر سے کہیں بڑا اور خوب صورت تھا۔

سویرا سینے پہ بازو لپیٹے برآمدے میں کھڑی تھیں۔ ان کی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں دور کچھ دیکھ رہی تھیں۔ فربہ مائل سراپا، کیچر میں نفاست سے جکڑے بال اور چبھتی ہوئی نگاہیں ان کی پوری شخصیت کو بیان کررہی تھیں۔

خاموشی میں ارتعاش پیدا کرنے والی آواز ان کے موبائل کی تھی۔ وہ چونکیں اور پیچھے دیکھا جہاں تخت پہ رکھا موبائل بج رہا تھا۔ وہ آگے آئیں، موبائل اٹھایا اور کان سے لگایا۔

''بولو فیضی۔''

''میں راستے میں ہوں، بس دس منٹ تک پہنچ جاؤں گا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ ہماری بھابی نے تمہارے پیچھے جاسوس نہیں چھوڑ رکھے؟''

''خواجہ صاحب کو لاہور فون کرکے تصدیق تو کرنے کی کوشش کی ہے محترمہ نے مگر خواجہ صاحب پکے رہے۔ فی الحال میں احتیاط کررہا ہوں، سو ڈونٹ وری۔''

سویرا نے فون بند کردیا اور وہیں کرسی پہ بیٹھ گئیں۔ ذرا دیر بعد ملازمہ چائے کا پوچھنے آئی تو انہوں نے انکار کردیا۔ بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے وہ فیضی کا انتظار کررہی تھیں۔ انہیں پارس سے ملنے جانا تھا۔

آگے کا لائحہ عمل ذہن میں بار بار دُہراتی، وہ بے توجہی سے لکڑی کی میز کے گلاس ٹاپ کو دیکھ رہی تھیں جس میں چھت کا عکس جھلک رہا تھا۔ بیل، بوٹے، اسپاٹ لائٹس سب میز کے شیشے کے اوپر چھپ گیا تھا۔ نگاہیں ان پہ مرکوز کیے، وہ ان نقش و نگار کا تعاقب کرنے لگیں۔ بیل کہاں شروع ہوئی، پھول کہاں ختم ہوا، سب بھول بھلیاں بنتا گیا اور وہ خود کو اس میں کھونے لگیں......

رضوان حیات نے خاموشی سے انہیں دیکھا جیسے اُن کے بولنے کے منتظر ہوں، وہ جو اتنی دیر اِدھر اُدھر کی تمہید باندھ رہی تھیں۔ اب بالآخر بات کو منزل تک پہنچتے دیکھ کر ذرا آگے کو ہوئیں۔

''بھائی جی امجد تو منع کررہے تھے کہ رضوان بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اچھے تھوڑی لگیں گے مگر میں نے کہا کہ بھائی جی کو نہیں بتائیں گے تو اور کس کو بتائیں گے۔ آخر برے وقت میں بھائی کام نہیں آئے گا تو کون آئے گا۔''

''سویرا، کیا ہوا ہے؟'' حسبِ توقع بھائی جی کے چہرے پہ تشویش در آئی۔

''بس کیا بتاؤں، اسجد کے تو ستارے ہی گردش میں رہتے ہیں۔ ہماری کوٹھی، بینک سے قرضے کے عوض گروی رکھی گئی تھی مگر آپ تو جانتے ہیں کہ اسجد کو کاروبار میں نقصان ہوا ہے، سارا قرضہ بھی غارت گیا اور قرضہ ادا کرنے کا امکان بھی۔''

''اوہو...... کیا بینک سے نوٹس آگیا ہے؟'' وہ پریشانی سے آگے کو ہوئے۔

''جی بھائی جی...... اور وہ کوٹھی ضبط کر رہے ہیں۔ نہیں، نہیں، آپ قرضے کی فکر نہ کریں، وہ تو اسجد کو ہی ادا کرنا ہے، پہلے بھی آپ سے اتنا پیسہ لیا، اب دوبارہ میں ان کو آپ سے کچھ مانگنے تھوڑی دوں گی۔''

''سویرا...... دیکھو...... بات پیسے کی نہیں ہے، میں نے اسجد کو کہا تھا کہ وہ کسی ملٹی نیشنل میں جاب کرلے، شروع میں تنخواہ شاید بہت زیادہ نہ ہو مگر اس کی ڈگری اچھی ہے، کام کرے گا تو تجربہ آئے گا، نائن ٹو فائیو جاب انسان کو disciplined کر دیتی ہے۔ مگر وہ اڑا رہا کہ اپنی مرضی کا کاروبار کرے گا، کاروبار بے شک کرتا مگر کچھ عرصہ نوکری کرکے تجربہ حاصل کرتا، دیکھو دنیا کا کوئی کاروبار آپ کو بٹھا کر نہیں کھلا سکتا۔ صبح آٹھ بجے آپ کو اٹھنا ہی پڑے گا۔ اپنے کاروبار کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ بارہ بجے دفتر جا رہے ہیں اور......''

''سب باتیں ٹھیک ہیں آپ کی بھائی جی۔'' سویرا آپا بور سی ہوکر ان کی بات کاٹ کر بولیں۔ ''مگر اب سارا مسئلہ کوٹھی کا ہے۔ وہ ضبط ہو رہی ہے۔ ہم تو سڑک پہ آجائیں گے۔''

''اللہ نہ کرے، میں تمہیں کسی اچھی جگہ کرایے کا گھر دلا دوں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر کرایہ کون دے گا، آپ سے تو نہیں لیں گے۔ دو بچے میرے، ساس کا ساتھ، گھر بھی بڑا چاہیے ہوگا اور اس کا کرایہ بھی زیادہ ہوگا۔'' وہ فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔

''کوئی حل نکل آئے گا، میں بینک والوں سے بات کرتا ہوں۔''

''اوہو...... وہ رہنے دیں...... میری بات سنیں۔'' وہ جلدی سے بولیں، مبادا وہ فون ہی کر ڈالیں۔ ''آپ کی ڈیفنس والی کوٹھی جو نئی بنی ہے......''

رضوان حیات کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔ آنکھوں میں تکلیف ابھری۔

''ہاں، ندا سے شادی کے بعد وہیں رہنا تھا۔ خیر......'' انہوں نے گہری سانس لی۔

''وہ گھر مکمل فرنشڈ اور ڈیکوریٹڈ ہے، میں نے تو اسجد سے کہہ دیا ہے کہ بھئی ہم وہیں رہ لیں گے اور مجھے پورا یقین ہے کہ بھائی جی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

رضوان حیات لمحے بھر کو چپ ہو گئے۔

''وہ تو ٹھیک ہے سویرا مگر...... ندا سے رشتہ ختم ہوا تو...... میں سوچ رہا تھا کہ جب بھی شادی کروں گا، اس گھر میں......''

''ارے بھائی جی آپ نے کون سا ابھی شادی کرنی ہے اور پھر آپ کر بھی لیں تو آپ کے لیے یہ گھر بھی ٹھیک ہے۔'' سویرا آپا نے کہتے ہوئے اطراف میں نگاہ ڈالی۔ ''میں تو کہتی ہوں، آپ اُس کوٹھی میں نہ ہی رہیں۔ دیکھیں وہاں ہر چیز آپ نے ندا کے لیے سجائی تھی۔ جب وہ ہی دغا باز نکلی تو کیا آپ ان چیزوں اور دیواروں کے ساتھ رہ سکیں گے؟ میں نے تو اسجد سے کہہ دیا کہ میرے بھائی جی اتنے غیرت مند ہیں کہ کبھی اس کوٹھی کو مڑ کر بھی نہ دیکھیں، کجا یہ کہ اس میں رہیں۔''

رضوان حیات نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ سویرا آپا کی آنکھوں میں امید کی روشنی چمکی۔

''اور اب تو میں جانتی ہوں وہ کوٹھی اور اس کی چیزیں آپ پہ حرام ہیں، جب بھی جائیں گے، تکلیف ہی ہوگی، مجھے تو لگتا ہے وہ گھر ہی آپ کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے، تبھی تو رشتہ ٹوٹ گیا۔ چلیں اب ہم اُدھر شفٹ ہو ہی رہے ہیں تو آپ اس کے کاغذات بھی مجھے دے دیجیے گا۔ میرا بھی سب پہ رعب پڑے گا اور میرے سسرال والے مزید آپ سے دب جائیں گے کہ بھائی بہن کا اتنا خیال کرتا ہے کہ مشکل وقت میں پوری کوٹھی اسے تحفے میں دے دی۔'' وہ خوشی، خوشی بول رہی تھیں۔

''جیسے تم چاہو سویرا۔'' رضوان بہن کی خوشی دیکھتے ہوئے اپنا کرب جیسے پسِ پشت ڈال کر دھیرے سے مسکرائے۔

اسپاٹ لائٹس تیز روشنی سے جل اٹھیں۔ سویرا کی آنکھیں چندھیائیں انہوں نے بے اختیار چہرہ پھیر لیا اور سوئچ بورڈ کی طرف دیکھا۔

وہاں مسکراتا ہوا فیضان کھڑا تھا۔ سویرا بدقت مسکرائیں۔ چند لمحے قبل سوچی گئی یاد نے اس مسکراہٹ کو مشکل بنا دیا تھا۔ حالانکہ اس میں کچھ خاص اعتراض نہ تھا پھر بھی دل کے کسی کونے میں ہوک سی اٹھی تھی۔ ایسی ہوک نہیں جو کسی کو دکھ دینے کے بعد برسوں اٹھتی رہتی ہے بلکہ بس یہ پریشانی کہ ہمارے اپنے دل کو سکون کیوں نہیں آتا۔ اگر آجائے تو یاد سے متعلقہ شخص یاد بھی نہ رہے۔ آخر اس کے ساتھ کیا غلط کیا تھا ہم نے؟

''کیسی ہیں آپا؟'' وہ جھک کر اُن سے ملا۔ پھر کرسی کھینچ کر ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''اچھی ہوں۔ تم بتاؤ، آگے کا کیا پلان ہے؟'' ان کو کوئی تیسری بات کرنے کی خواہش ہی نہ تھی۔

''آپ پارس کے پاس جائیں گی اور فی الحال صرف اس سے تعزیت کریں گی، ہمارا سرپرائز تب تک سرپرائز رہے گا جب تک ہمارے ہاتھ میں کورٹ کا آرڈر نہ ہو۔''

''ہوں... سمجھ گئی۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''تنویر کی کوئی اپ ڈیٹ؟''

''انہوں نے بہت مایوس کیا ہے مجھے۔ میں نے سب سے زیادہ بھروسا ان پہ کیا بلکہ بھائی جی نے بھی سب سے زیادہ بھروسا ان ہی پہ کیا تھا۔ انہوں نے ہم سب کو دھوکا دیا ہے۔'' فیضان کے چہرے پہ تاسف پھیلا اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی اور دیکھو، ہمیں اس کی اور پارس کی ڈیل کا ثبوت بھی مل گیا۔''

''مزید یہ کہ جب میں نے انہیں آپ کی آمد کا بتایا تو وہ اتنے حواس باختہ ہوئے کہ میرے نکلتے ہی پارس کو ساری بات فون پہ بتائی۔ یوں میرے لیے مزید بے اعتبار ہوگئے۔'' اس نے افسوس سے سر جھٹکتے ہوئے سامنے پھیلے نیلگوں اندھیرے کو دیکھا۔ شام اتر رہی تھی۔

''یعنی وہ میری آمد کے لیے تیار ہوگی...... تو پھر چلیں؟'' انہوں نے فیضی کو دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں ابرو اٹھائی۔

''جی، چلیں۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''مگر تم اُدھر...... مطلب تم تو اس کے ملازم ہو؟''

''ڈونٹ وری، مجھے اہم مواقع کے لیے انٹری ٹکٹ خریدنا آتا ہے اور آج کی شام کا شو میں مس نہیں کرنا چاہوں گا۔''

اس کی آنکھوں میں چھایا پختہ عزم، لہجے میں پارس کے لیے سرد سی نفرت اور مسکراہٹ میں فتح کا یقین سویرا کو شانت کر گیا۔ سکون ملا تو یادیں بھول گئیں۔ وہ بھی مسکرا دیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

افضل بابا نے احتیاط سے الماری بند کی پھر خالی بیگز بیڈ کے نیچے رکھے اور ہاتھ جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شکیل ستائشی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا، فیروزہ مائی ساتھ ہی ذرا خوش، ذرا حیران، ذرا پریشان کھڑی تھی۔

''سب سیٹ کردیا ہے صاب، کوئی کام ہو تو مجھے آواز دے دیجیے گا یا یہ گھنٹی بجا دیجیے گا۔'' انہوں نے سائڈ ٹیبل کے قریب لگے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ شکیل نے ''اچھا، اچھا، جان چھوڑو'' والے انداز میں سر ہلا کر منہ پھیرلیا۔ افضل بابا سر جھکائے باہر نکل گئے۔

''مجھے صاف صاف بتا شکیل، بات کیا ہے؟'' ان کے نکلتے ہی فیروزہ مائی نے تیزی سے دروازہ بند کیا اور گھوم کر بیٹے کے سامنے آئی۔

''گھر تو زبردست ہے امی، ہوٹل اس سے بھی عالیشان ہوگا۔'' وہ ابھی تک گھوم پھر کر ایک، ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ فیروزہ مائی کے ماتھے پہ بل پڑے۔

''جہنم میں گیا گھر۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ......''

''ناں...... ناں......'' اس نے انگلی اٹھا کر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''گھر کو جہنم میں نہیں بھیجنا ہمیں۔''

''شکیل مجھے سیدھی طرح بتا، تو اچانک بغیر اطلاع کے کیوں آیا ہے اِدھر؟''

''یہی تو بتا رہا ہوں تجھے امی۔ گھر زبردست ہے، ہوٹل اس سے بھی عالیشان ہوگا۔ اور اس گھر کو جہنم میں بھیجنے کی غلطی ہم نے نہیں کرنی۔'' وہ مسکرایا تو اس کی آنکھیں پُراسراریت سے چمکیں۔ فیروزہ مائی بالکل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔

''تو...... تو گھر اور ہوٹل کے لیے آیا ہے؟ میرے لیے نہیں؟'' اسے صدمہ ہوا تھا۔

''لے...... سب تیرے لیے ہی تو کر رہا ہوں، اِدھر تو میرے ساتھ عیش کرے گی، میں اکیلا تھوڑی رہوں گا یہاں۔'' وہ بیڈ کے ایک طرف بیٹھا، فیروزہ مائی تیزی سے اس کے ساتھ آبیٹھی۔

''مگر...... شکیل...... یہ سب پارس کا ہے، وہ ہمیں اب زیادہ دن برداشت نہیں کرے گی۔ ہم اِدھر بھی عیش نہیں کرسکتے۔'' کمرے میں اندھیرا تھا اور ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی نے ماحول کو عجیب شکل دے رکھی تھی۔ ایسے میں ان دونوں کی دھیمی سرگوشیوں میں کی جانے والی باتیں...... جیسے آدھی رات میں آسمانوں سے ارواحِ خبیثہ بڑبڑاتی ہوئی، اپنے پر پھیلائے زمین پہ اتر رہی ہوں......

''یہ سب بہت جلد ہمارا ہوجائے گا، امی۔ اگر تو میرا ساتھ دے تو......!'' وہ بھی دھیمی آواز میں بولا۔ سامنے دیوار پہ زرد روشنی میں دونوں کے سائے نمایاں تھے۔ ماحول کی ہیبت ناکی میں مزید اضافہ ہوا۔

''تجھے لگتا ہے وہ ناگن یہ سب ہمارے نام کرے گی؟ تو پاگل ہے۔ اگر تجھے لگتا ہے کہ اسے ذرا دھمکا کر، کنپٹی پہ پستول تان کر بھی تو اس سے کاغذات پہ دستخط کروالے گا تو، تو غلط ہے۔ وہ کبھی ہمیں کچھ نہیں دے گی شکیل۔'' فیروزہ کو اس کی احمقانہ سوچ پہ تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔

''تیری نزدیک کی نظر واقعی کمزور ہے امی۔ تجھے سامنے کی بات کیوں نہیں نظر آتی؟ ہمیں پارو سے کچھ سائن نہیں کرانا۔ ہمیں بس ایک بات یاد رکھنی ہے کہ پارو کے واحد رشتے دار ہم ہیں۔ تو اس کی ماں، میں اس کا بھائی۔'' شکیل ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

''پر ہم سوتیلے ہیں۔''

''ذرا سے پیسے خرچ کرو تو سوتیلا، سگا بن جاتا ہے۔ سوچ امی، پارو کے پاس کچھ نہیں تھا پھر اچانک سے ایک دن بڈھا حادثے کا شکار ہوکر مرگیا اور پارو کو سب مل گیا۔ ایسے ہی اچانک اگر ایک دن پارو حادثے میں مرجائے تو......؟'' وہ مسکرایا۔

''تو امی اس کا سب کچھ ڈائریکٹ اس کے رشتے داروں کو مل جائے گا۔''

''اور اب میں سو سال اس ناگن کے مرنے کا انتظار کروں۔ یہ اتنی جلدی نہیں مرنے والی۔'' فیروزہ مائی کے چہرے پہ جھنجلاہٹ ابھری۔

''اوہ میری عقلمند ماں، تجھے لگتا ہے وہ بڈھا ایسے ہی مرا ہوگا؟ تو خود کہتی تھی اسے پارو نے مارا ہوگا۔ بظاہر وہ حادثہ تھا اور حادثہ ہی رہا۔ نہ کیس کھلا، نہ تفتیش ہوئی۔ ایسے ہی اگر ہم پارو کو اپنے راستے سے ہٹادیں تو ہم اس سب کے مالک ہوں گے۔''

فیروزہ مائی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور پھر ان میں خوف اترا۔ رنگت سفید پڑی۔ وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

''شکیل...... تیرا مطلب...... تو پارو کو قتل......''

اس سے جملہ ادا نہیں ہوا، بے اختیار وہ قدرے پیچھے ہوئی۔

''میں نہیں، ہم...... ہم دونوں اسے راستے سے ہٹائیں گے۔''

''تو تُو اس لیے اِدھر آیا ہے...... شکیل اللہ کا خوف کر...... مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی، دل کرتا ہے مار مار کر منہ لال کردوں مگر قتل......؟ نہیں شکیل۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ وہ ابھی تک خوفزدہ لگ رہی تھی۔

''دیکھ امی، چند دن میں ہم سڑک پہ آجائیں گے بھیک مانگ کر گزارہ کرنا پڑے گا، تو لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھے گی اور ان جھوٹے برتنوں کی ہڈیاں دیکھ کر مرغی کھانے کو ترسے گی۔'' وہ دبے دبے غصے سے بولا۔

''مگر تیرے پاس کچھ تو ہوگا، اتنے سال تو نے دبئی میں......''

''نہیں ہے، پھوٹی کوڑی نہیں بچی۔ سارا سرمایہ ڈوب گیا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پارو سے اپنا حق چھین لوں۔ دیکھ امی، ساری غلطی اس کی اپنی ہے، اگر اس نے سیدھے طریقے سے ہمیں ہمارا حق دیا ہوتا تو ہم یہ نہ کرتے۔ ساری غلطی اُس کی ہے، تو خود کو الزام نہ دے۔'' شکیل کے پاس خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سے دلائل تھے۔ ہر شخص کے پاس ہوتے ہیں۔

فیروزہ مائی چپ ہوگئی۔ اس کے چہرے پہ فکر کی لکیریں، خوف کے نقطوں میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ البتہ دیوار پہ گرتے دونوں کے سائے سلیٹ کی طرح صاف اور چپٹے تھے..... اور سیاہ بھی۔

☆☆☆

پارس کے کمرے میں تاریکی تھی۔ بالکونی کی طرف کھلتی فرنچ ونڈو کے آگے پردے لٹکے ہوئے تھے سو چاند کی روشنی چھن کر اندر آرہی تھی۔ وہ وہیں کرسی ڈالے، فون کان سے لگائے، سر ہلاتی کہہ رہی تھی۔

''میں نے آپ کی پوری بات سنے بغیر فون رکھ دیا تھا، میں سمجھی وہ سویرا ہوں گی مگر وہ شکیل تھا۔''

''شکیل! وہ دبئی سے کیوں آیا، خیریت؟'' انہیں تشویش گزری۔ پارس نے گہری سانس خارج کی۔

''خیریت ہوتی تو نہ آتا۔ اسے پیسے

آس

میرے ہر اداس پل میں ساتھ دینا تم
گر ہاتھ چھوٹ جائے تو
اسے پھر تھام لینا تم
ماند پڑتے جذبوں کو
اِک نئی آس دینا تم
تم اِک دن لوٹ آؤ گے
زندہ رہنے کا نیا احساس دینا تم

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

ہیں۔ مگر یہ واحد وجہ نہیں ہوگی۔ وہ بغیر کسی بڑے مقصد کے سب چھوڑ چھاڑ کر اِدھر نہیں آسکتا۔ خیر، میں جلد معلوم کرلوں گی کہ وہ کیوں آیا ہے۔''

''اور سویرا......؟ ان سے ملاقات کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''مجھے معلوم ہے مجھے ان سے کیا کہنا ہے، آپ فکر مت کریں، میں نے سویرا اور فیضان کا بہت عرصے انتظار کیا ہے، میں پوری طرح تیار ہوں۔''

دروازے پر دستک ہوئی اور افضل بابا نمودار ہوئے۔ پارس نے مڑ کر انہیں دیکھا اور اندر آنے کا اشارہ کرکے فون میں بولی۔

''اوکے تنویر صاحب، جلد ملاقات ہوتی ہے۔''

فون رکھ کر وہ بابا کی جانب متوجہ ہوئی۔

''ہوٹل سے فائز صاحب آئے ہیں، کچھ کاغذات آپ کو دکھانا ہیں۔''

''اس وقت؟'' وہ حیران ہوئی اور باہر پھیلتی رات کو دیکھا۔ پھر اسے بٹھانے کا کہہ کر تھوڑی دیر بعد لان میں آئی تو کرسی پہ کچھ فائلز دیکھتا فائز احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

''سوری میم، کافی دیر ہوچکی ہے مگر یہ کچھ اہم فیکس تھے، ابھی موصول ہوئے، مجھے آپ سے ڈسکس کرنا تھا تاکہ صبح ہوتے ہی پہلا کام ان پہ عمل درآمد کا کروں۔'' اس کے بیٹھتے ہی فائز نے کھڑے کھڑے جھک کر سب کاغذ میز پہ پھیلائے۔ لان میں لگے پولز کی روشنی مطالعے کے لیے کافی تھی، وہ دونوں اس کو ڈسکس کرنے لگے۔ پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ گیٹ پہ ایک کار رکی۔ دروازے کھلنے بند ہونے کی آواز پہ پارس سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اٹھی نہیں۔

اس کے عقب میں کھڑے فائز کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔

پہلے تنویر صاحب آتے دکھائی دیے۔ پارس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ہولے سے سر کو جنبش دی، پارس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا پھر ان کے پیچھے سویرا نظر آئیں۔

وہی مغرور، نخوت بھرا انداز، گہری چبھتی نگاہیں جن کے متعلق اس نے سن رکھا تھا۔ وہ لمحے بھر میں انہیں پہچان گئی۔ اگر اسے معلوم نہ ہوتا کہ وہ سویرا ہیں تو شاید تب بھی پہچان جاتی، یہ اس کا ذاتی خیال تھا۔ اس نے سویرا کے عقب میں دیکھا۔ فیضان نہیں تھا۔ یقیناً وہ بھی ایسا ہی دِکھتا ہوگا۔ اس کو بھی وہ پہچان لے گی۔

تنویر صاحب قریب آئے تو وہ اٹھی۔ ہلکی سی استقبالیہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں چھپایا سرد پن لیے، وہ ہمیشہ کی طرح پُرکشش لگ رہی تھی۔ سویرا نے اس کے سامنے آکر اوپر سے نیچے اسے دیکھا۔ سیدھے بال، خوب صورت آنکھیں، شال کندھوں پہ لپیٹ کر آگے بازوؤں پہ ایک شانِ تمکنت سے ڈالے، کانوں میں بڑی بڑی سلور بالیاں پہنے، وہ ویسی ہی تھی جیسی فیضی نے بتایا تھا۔

مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ خوب صورت تھی۔ سویرا کوئی شاطر صورت اور تیز طرار کچے چہرے والی لڑکی کی توقع کررہی تھیں۔ گوکہ یہ بھی بیوقوف نہیں لگتی تھی۔ سمجھدار بلکہ عقلمند لگتی تھی مگر اس کی خوب صورتی نے اس کے چہرے کو منفی تاثر نہیں دینے دیا تھا۔ وہ سحر انگیز تھی۔ وہ بلاشبہ اتنی خوب صورت نہیں تھی جتنی سحر انگیز تھی۔

''مسز پارس رضوان حیات...... مسز سویرا امجد۔'' تنویر صاحب نے آمنے سامنے کھڑی دونوں خواتین کا تعارف کروایا۔ دونوں ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔ سویرا کی نگاہوں میں چبھن تھی جبکہ پارس کی آنکھیں سرد مسکراہٹ سے لبریز تھیں۔

''ویلکم مسز امجد، مجھے خوشی ہے کہ ساڑھے چھ ماہ میں آپ کو یہ گھر مل ہی گیا۔'' پارس کے لبوں سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ تنویر صاحب نے حیرت اور

گڑبڑاہٹ سے اسے دیکھا۔ جیسے انہیں اس کے پہلے ہی فقرے میں سویرا کے اب تک یہاں نہ آنے پہ چوٹ کرنے کی توقع نہیں تھی۔

''جی، آپ نے تو اس گھر کو بہت چھپا کر رکھا تھا مگر ہم نے ڈھونڈ ہی لیا۔'' وہ بھی مسکرائیں۔ ''ویسے گھر اچھا ہے آپ کا، البتہ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ مری میں ہمارا گھر ہونے کے باوجود بھائی جی نے آپ کو علیحدہ گھر کیوں لے کر دیا۔''

پارس دھیرے سے ہنسی۔ فائز نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ بہت کم ہنستی تھی یا شاید چند ایک بار ہی ہنسی تھی۔

''اصل میں رضوان جب بھی اپنے لیے گھر بناتے، اس پہ لوگ قبضہ کرلیتے تھے، سو انہوں نے ''چھپا'' کر گھر لیا تاکہ نہ کسی کو پتا چلے، نہ کوئی اسے ہتھیانے کی کوشش کرے۔ اور یہ گھر......'' ساتھ ہی پارس نے پلٹ کر گھر کو دیکھا۔ فائز کی طرف اس کا چہرہ ہوا تو اس نے احتراماً سر جھکا دیا مگر پارس بنگلے کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''یہ گھر مجھے بہت پسند تھا، انہوں نے شادی کے گفٹ کے طور پر مجھے یہ دیا تھا۔'' وہ گردن موڑے بنگلے کو دیکھ رہی تھی۔ بنگلا تاریکی میں مصنوعی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

ایک دم سے اس کی مڑی گردن سیدھی ہوگئی، وہ کھڑی سے بیٹھی نظر آنے لگی، کھلے بال بندھ گئے، تاریکی، روشنی میں بدل گئی۔ بنگلے کے فرنٹ کے بجائے اس کے سامنے بنگلے کی بیک سائڈ آگئی۔

وہ جنگل کے سرے پہ، درختوں کے بیچ، پتھر پہ بیٹھی تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے، وہ اس بنگلے کو دیکھ رہی تھی جو سامنے، ذرا دور نظر آرہا تھا۔ یوں جیسے آبادی سے دور، کسی جنت میں ایک خوب صورت سا مسکن ہو۔

''آپ نے بتایا نہیں، آپ کی والدہ نے کیا کہا؟''

عقب میں آتی آواز پہ وہ ڈر کر ایک دم اٹھی۔ پیچھے رضوان کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح باوقار، پُراعتماد اور مہربان۔ انہیں دیکھ کر اس کی رکی سانس بحال ہوئی مگر پھر فوراً ہی ان کا رعب چھانے لگا۔

''سوری سر، مجھے پتا نہیں چلا، آپ کب آئے؟''

''جب آپ واک سے تھک کر اُدھر بیٹھ گئی تھیں۔'' انہوں نے ٹریک سوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے کھڑے ابرو سے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی وہ اتنی دیر سے اسے دیکھ رہے تھے؟

''مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' اس نے پھر کہا۔

''وجہ وہ گھر ہے، آپ اس کو بہت توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔'' انہوں نے گھر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پارس نے مڑ کر دیکھا پھر سر جھکا دیا۔

''میں روز اس جنگل میں واک کرتی ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اختتام پہ کسی کا گھر بھی ہوگا۔''

''یہ اس گھر کی بیک ہے، اس کا فرنٹ مین روڈ پہ ہے۔''

''اوہ۔'' اس کے لب سکڑے۔

''آپ کو اچھا لگا؟'' پارس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''مجھے گھر بنانے کی خواہش نہیں۔''

''کیوں؟ یہ مایوس کُن رویہ ہماری ریپشنسٹ پہ سوٹ نہیں کرتا۔'' انہوں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا پھر پتھر پہ بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی دوسرے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ پارس نے دیکھا، وہ اس پتھر پہ نہیں بیٹھے تھے جس پہ پہلے وہ بیٹھی تھی، انہوں نے اس کی جگہ اس کے لیے سنبھال کر رکھی تھی۔

''ابھی ڈیوٹی ٹائم نہیں ہے سر، ابھی میں آپ کی ریپشنسٹ نہیں ہوں۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بیٹھی۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

"سر مجھے پتا ہے میری امی میری شادی کبھی نہیں کریں گی۔ میں ان کا کمانے والا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے کبھی کھونا نہیں چاہیں گی۔"

"کم از کم ایک ڈیڑھ سال تو آپ اپنی تنخواہ محفوظ کر سکتی ہیں۔ کیا آپ نے ان سے کہا جو میں نے کہنے کو کہا تھا؟" انہیں وہ سوال یاد آیا جو انہوں نے آتے ساتھ کیا تھا۔

"جی...... اور وہ دھوکا کھا بھی گئیں مگر سر، تنخواہ واحد چیز نہیں جو میری مدد کر سکے دراصل میری مدد کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ میں ایک ناکام انسان ہوں...... بزدل اور ناکام۔ اس لیے میں نے خود کو وقت کے دھارے پہ چھوڑ دیا ہے۔" وہ سامنے درختوں کے سائے میں کھڑے خوب صورت گھر کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سرمئی پتھروں کا گھر، سرسبز درخت، نیلا آسمان۔ قدرت کا بہترین کلر کمبینیشن۔

"ہر exploit ہونے والا شخص یہی کہتا ہے۔ پارس آپ کو لوگ استعمال تب کرتے ہیں جب آپ ان کو اجازت دیں۔ آپ خود ذرا سے مضبوط بن جائیں تو آپ کو کوئی استعمال نہیں کر سکتا۔"

پارس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ ان کی طرف موڑا۔ وہ دھیمی اپنائیت بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ وہ شخص کہہ رہا ہے جو خود روز ایکسپلائٹ ہوتا ہے۔"

"میری عمر گزر چکی ہے، میں آج یا کل مر جاؤں گا مگر آپ کے پاس پوری زندگی پڑی ہے۔"

"سر، آپ مجھے مضبوط بننے کا درس دیتے ہیں مگر جس دن آپ خود مضبوط بنیں گے، اس دن میں بھی بن جاؤں گی۔" وہ اب قدرے آرام دہ انداز میں بول رہی تھی۔ "ویسے مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ کوئی آپ کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔"

وہ ہلکا سا ہنسے۔ وہ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔ دل میں احترام پیدا ہوتا۔ اپنائیت سی ہونے لگتی۔

"میں نے شادی نہیں کی۔ جانتی ہیں کیوں؟"

پارس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"اوہ...... میں سمجھی آپ کے بچے مجھ سے بھی بڑے ہوں گے۔"

"ابھی آپ میری ریسپشنسٹ نہیں ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ مجھے بوڑھا کہیں۔" وہ پُرلطف انداز میں بولے۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"میری بہن نے میری شادی کبھی نہیں ہونے دی۔ نوعمری میں ایک منگنی ہوئی تھی کزن سے پھر اچانک ختم ہوگئی۔ جانتا ہوں کہ سویرا نے خاندان میں کچھ باتیں کر کے رشتہ تڑوایا تھا مگر اس وقت میں نوجوان تھا، اسٹرگل کر رہا تھا، مجھے پروا نہیں تھی۔ تیس سے اوپر کا ہوا تو شادی کا سوچا، بہت جگہ رشتے کی کوشش کی مگر ہر دفعہ بات ختم ہو جاتی۔ پھر ایک دوست کی بہن تھی، ندا، بہت اچھی لڑکی تھی، وہ رشتہ ہو گیا، اس لیے کہ دوست سے خود بات کر لی، سویرا پہ چھوڑتا تو کبھی نہ ہو پاتا مگر چند مہینے بعد میرے بہن بھائی نے اس بے چاری پہ الزام لگا کر رشتہ توڑنے کا کہا۔ میں نے رشتہ ختم کر دیا۔"

وہ حق دق سن رہی تھی۔ یہ اس کی امید و توقع سے بڑھ کر تھا۔

"کیوں؟"

"اس لیے نہیں کہ مجھے اس پہ شک تھا، نہیں۔" انہوں نے دور نظر آتے گھر کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ چہرے پہ سوگواریت تھی۔ "بلکہ اس لیے کہ جب میں اتنا مضبوط تھا ہی نہیں کہ ندا کو برملا صحیح اور سویرا کو غلط کہہ سکوں تو مجھے اس لڑکی سے شادی کر کے اسے سزا دینے کا حق نہیں تھا۔"

"نہیں سر، آپ نے غلط کیا، آپ کو ڈٹ جانا چاہیے تھا۔"

"پارس میں یہ بات آپ کو کیوں بتا رہا ہوں؟ اس لیے نہیں کہ مجھے کتھارسس کرنا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ آپ کو یہ سمجھا سکوں کہ ندا کے بعد میں کبھی شادی نہیں کر سکا۔ دس بارہ سال ہو گئے اس بات کو میں نے غلطی کی مجھے اس کے لیے فائٹ کرنا چاہیے تھی۔ مجھے رشتوں میں توازن برقرار رکھنا چاہیے تھا۔ آپ بھی وہی غلطی کر رہی ہیں جو لوگ اپنے بہن بھائیوں کے لیے قربانی دیتے ہوئے شادی نہیں کرتے، وہ غلط کرتے ہیں۔"

"مگر سر......" اس نے اختلاف کرنا چاہا مگر سارے دلائل بھول گئے۔ دلائل تو شاید کبھی تھے ہی نہیں۔

"وعدہ کریں، مجھ سے نہیں، خود سے کہ آپ مناسب وقت پہ شادی ضرور کریں گی اور اگر آپ نے یہ وعدہ پورا کیا تو یہ گھر......" انہوں نے سامنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میں آپ کو شادی کے گفٹ کے طور پر دے دوں گا۔"

"یہ آپ کا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"نہیں...... مگر اس کے فرنٹ پہ برائے فروخت کا اشتہار ضرور لگا ہے۔ بولیں، آپ کو شادی کا گفٹ چاہیے یا نہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

پارس اداسی سے مسکراتی، ان کو دیکھے گئی۔ اس کی آنکھوں میں سوگواریت تھی۔ ہلکے سے اثبات میں سر ہلا کر اس نے گھر کی سمت دیکھا...... جو لمحے بھر بعد یادگی سے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بیک کی جگہ رات سامنے آگئی۔ اس کے اردگرد سے درخت، تنویر، رضوان غائب ہوگئے، وہ بیٹھے سے سیدھی، نشست سے کھڑی حالت میں آگئی۔

پارس نے گردن واپس موڑی۔ اندھیرے لان میں سویرا اور تنویر صاحب اس کے سامنے کھڑے تھے۔ فائز پیچھے تھا۔

"لگتا ہے بہت مہنگے تحفے وصول کرنے کی عادت ہے آپ کو۔" اس کی پچھلی بات سویرا کو جھلسا گئی جبھی مسکرا کر طنزیہ بولیں۔

"مہنگے نہیں، قیمتی!" وہ بھی میٹھا سا مسکرائی۔

"ویسے آپ نے ابھی تک مجھ سے میرے شوہر کے انتقال کی تعزیت نہیں کی۔" سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پارس خود بھی بیٹھی۔

"انتقال یا قتل، میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے افسوس کس کا کرنا ہے۔" سویرا نشست سنبھالتے ہوئے بولیں اور پارس ویسے ہی مسکراتی رہی۔ تنویر صاحب، سویرا کے عقب میں کھڑے رہے، فائز، پارس کے دائیں ہاتھ کھڑا تھا۔ دونوں خاموش سامع تھے۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟"

"مجھے تو یہ حادثاتی موت نہیں لگتی۔"

"کیا اسی لیے آپ ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوئی تھیں؟" پارس چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ سویرا کی مسکراہٹ مدھم ہوئی، پیشانی پہ بل پڑا۔

"تنویر بھائی نے بتایا تو ہوگا کہ میرے پیپرز میں مسئلہ ہوگیا تھا، مجھے حال ہی میں آسٹریلین شہریت ملی ہے، اس وقت آنا ناممکن تھا۔"

"ترجیحات کی بات ہے مسز اسجد ورنہ بھائی کا جنازہ آسٹریلین شہریت سے زیادہ اہم نہیں ہوتا۔" پارس اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ فائز نے نگاہوں ہی نگاہوں میں سویرا کو ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے بہ مشکل ضبط کیا۔

"بھائی جی سے میرا خون کا رشتہ ہے پارس صاحبہ، یہ کبھی نہیں ختم ہو سکتا۔ آپ کا تین لفظوں کا رشتہ تھا جو تین لفظوں سے ختم ہو سکتا ہے۔"

''آپ امجد صاحب کو نہیں لے کر آئیں؟'' ان کی بات ختم ہوئی تو وہ بولی۔

''نہیں، وہ بچوں کے پاس آسٹریلیا میں ہیں۔''

''خیریت ہے، آپ نے انہیں خود سے الگ رہنے دیا، وہ بھی اتنے دنوں کے لیے...... اور اگر انہوں نے تین لفظوں کا رشتہ ختم کر دیا تو؟''

''ہمارا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہے۔'' فائز کے بار بار تنبیہہ کرنے کے باوجود سویرا ضبط کھو بیٹھیں اور غصے سے بولیں۔ پارس نے ہلکے سے شانے اچکا دیے۔

''اچھا!'' اور انداز یوں تھا گویا یقین نہ آیا ہو۔ سویرا نے پھر خود پہ قابو پایا اور گفتگو کا رخ موڑا۔

''آپ نے بھائی جی کی موت کی تفتیش کیوں نہیں کرائی؟''

''وہ میرے سامنے...... سیڑھیوں سے گرے تھے۔'' بہت اعتماد سے پارس نے فقرہ ادا کیا۔ مگر دو حصوں میں۔ ''میں ہر چیز کی گواہ ہوں، مجھے تفتیش کی کیا ضرورت؟''

''مگر ہمیں ہے اور وہ ہم ضرور کریں گے کیونکہ ہمیں آپ کی اس کہانی کا یقین نہیں ہے۔''

''جی! میں پوچھنے ہی لگی تھی آپ کے اس (ہم) کے متعلق۔'' پارس کا چہرہ کھل اٹھا جیسے اس کو کچھ یاد آیا ہو۔ ''فیضان نہیں آیا؟''

عقب میں کھڑا فیضان بنا تاثر کے مؤدب سا کھڑا میز کو دیکھتا رہا۔ تنویر صاحب کا چہرہ بھی بے تاثر رہا۔ سویرا نے بھی حتی المقدور کوشش کی کہ فیضی کو دیکھے بغیر جواب دیں۔

''نہیں، وہ نہیں آیا۔''

''اس کے بھی پیپرز کا مسئلہ ہوگا؟'' پارس نے جیسے مسکراہٹ چھپائی۔

اندر لاؤنج کی کھڑکی سے وہ دو خواتین آمنے سامنے بیٹھی اور دو مرد ان کے عقب میں کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ دور تھے، ان کی گفتگو کی آواز یہاں تک نہیں آئی تھی۔ شکیل گہری نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

''تو واقعی نہیں جانتی امی کہ یہ عورت کون ہے؟''

''بولا تو ہے، نہیں جانتی۔ یہ لڑکا تو ہوٹل میں کام کرتا ہے اور یہ موٹا والا بڈھا رضوان حیات کا خاص آدمی تھا مگر عورت کا نہیں پتا۔'' صوفے پہ بیٹھی فیروزہ مائی جھنجلا اٹھی۔

شکیل جواب دینے کے لیے مڑا تو ٹرالی گھسیٹ کر باہر لے جاتے افضل بابا کو دیکھا۔

''اے...... باباجی......'' اس نے نخوت سے پکارا۔

''جی صاحب!'' افضل بابا نے رک کر اسے دیکھا۔

''یہ باہر کون آیا ہے؟''

''رضوان صاحب کی بہن ہیں سویرا بی بی، آسٹریلیا سے آئی ہیں۔'' کہہ کر وہ ٹرالی آگے لے گئے۔

شکیل اور فیروزہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

''بس، تو بیٹھ کر انسانیت کے سبق یاد کرتی رہ اور اس بڈھے کے رشتے دار آکر ہوٹل لے اُڑیں گے۔'' وہ دبے لفظوں میں غصے سے بدبداتا اس کے ساتھ آکر بیٹھا۔ فیروزہ مائی بالکل گم صم ہوگئی تھی۔

''سوچ لے امی۔ پارو کے ہاتھ کچھ نہیں رہنا۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مقدمہ وغیرہ کریں، ہمیں پارو کو راستے سے ہٹا کر، سب بیچ باچ کر، سارا پیسہ لے کر ملک سے نکل جانا ہے۔ سمجھ آئی یا نہیں۔'' وہ زچ ہو کر بولا تو فیروزہ مائی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا، البتہ اس کے انداز میں واضح تامل تھا۔

افضل بابا ٹرالی لے کر مہمان اور میزبان کے قریب آرہے تھے جب انہوں نے پارس کو

کہتے سنا۔

''اس کے بھی پیپرز کا مسئلہ ہوگا؟''

''نہیں، وہ کچھ بیمار تھا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔ افضل بابا چائے نکالنے لگے۔

''اچھا؟ کیا ہوا اسے؟'' وہ مصنوعی، مذاق اُڑاتی فکرمندی سے بولی۔ ''اور کیا وہ چھ ماہ سے بیمار ہے جو بھائی کے جنازے میں بھی نہیں آیا؟''

سویرا نے بہ مشکل پہلو بدلا۔ وہ ضبط نہیں کر پارہی تھیں اور فیضان مسلسل ان کو نگاہوں میں چپ رہنے کا اشارہ کر رہا تھا اس حالت میں وہ افضل بابا کا سلام اور چائے نظر انداز کر کے پارس کو جواب دینے لگیں۔

''اس وقت وہ کسی لیگل مسئلے میں پھنسا ہوا تھا، امریکا سے باہر نہیں جاسکتا تھا بلکہ بھائی جی کے انتقال والے دنوں میں تو وہ ویسے بھی نیو جرسی گیا ہوا تھا، اس کو اطلاع دیر سے ملی۔'' کہہ کر انہوں نے تنویر صاحب کو دیکھا، جنہوں نے اثبات میں سر ہلا کر گویا تائید کی۔ پارس مسکرائی۔ افضل بابا اب خاموشی سے چیزیں آگے رکھ رہے تھے۔

''اچھا...... تو یہ کہا تھا اس نے آپ سے؟''

''کیا مطلب؟'' سویرا کے ابرو حیرت سے اٹھے۔

''مطلب یہ مسز سویرا کہ شاید آپ اپنے دونوں بھائیوں کو اچھے سے نہیں جانتیں۔ جس رات رضوان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ اس رات فیضان یہیں تھا، اسی شہر میں، انہی گلیوں میں۔''

فائز نے بری طرح چونک کر پارس کو دیکھا مگر وہ سویرا کو دیکھ رہی تھی جو کچھ حیران تھیں، متعجب تھیں، بے یقین تھیں، افضل بابا تک ششدر رہ گئے۔ تنویر صاحب بے تاثر رہے۔

''نہیں، فیضان امریکا میں تھا۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا۔'' ساتھ ہی سویرا نے پہلے تنویر صاحب کو دیکھا پھر فیضی کو، وہ خود بھی شاکڈ لگ رہا تھا۔ افضل بابا جاچکے تھے۔

''اگر اس کی یادداشت کھوگئی ہو تو اسے بتا دیجیے گا کہ پارس کو اچھی طرح یاد ہے وہ اس رات کہاں تھا۔ یہ بھی کہیے گا کہ پارس اس کا چھ مہینے سے انتظار کر رہی ہے۔ اگر وہ اپنے بھائی جی کے لیے نہیں آیا تو اپنی امانت لینے ضرور آئے جو وہ میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔''

فائز اب یک ٹک پارس کے سر کی پشت کو دیکھ رہا تھا جیسے سمجھ نہ آرہا ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ سویرا کی ساری اکڑ، سارا کروفر، غصہ سب جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا اور وہ فیضان کا دفاع کرنے کے مزید قابل نہیں رہی تھیں۔

''کیسی امانت؟'' بس دو لفظ بول پائیں۔

پارس جواب دیے بنا اٹھی اور اندر چلی گئی۔ لاؤنج میں قدم رکھا تو سر جوڑ کر بیٹھے کھسر پھسر کرتے ماں بیٹا بے اختیار سیدھے ہوئے۔ وہ انہیں دیکھے بنا اوپر چلی گئی۔

اس کے اندر غائب ہوتے ہی، سویرا نے فیضی کو دیکھا۔

''تم اس وقت پاکستان میں تھے؟'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''ہاں مگر...... اس کو کیسے پتا؟'' اس نے بے اختیار تنویر صاحب کو دیکھا جنہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''میں خود نہیں جانتا۔'' گویا اپنی بے گناہی ثابت کی۔

''اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔ تم...... فیضی...... تم نے مجھ سے کیوں چھپایا؟'' سویرا آپا کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ دکھ تھا۔

''نہیں، آپ ابھی تو آئی ہیں، میں سامنے بیٹھ کر بتانے والا تھا، سوچا رات کو بتاؤں گا مگر......''

''اور تم نے اس کو کیا دیا تھا جو وہ لینے گئی ہے؟''

’’کچھ نہیں، میں تو اس سے ملا بھی نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا، میں سچ کہہ رہا ہوں۔‘‘ اس نے بے بسی سے ان کو دیکھا۔ وہ مزید احتجاج نہیں کر سکتا تھا ورنہ دور سے دیکھنے والے کو شک پڑ جاتا کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تبھی پارس باہر آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ فائز نے خود کو کمپوز کیا اور پارس کی طرف دیکھا۔

’’میم، میں مزید مداخلت نہیں کرنا چاہوں گا، کیا ہم صبح میں......؟‘‘

’’آپ ٹھہریں، مسز اسجد بس جانے والی ہیں۔‘‘ ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کراتی، وہ آپا کے سامنے آئی اور بیٹھنے کے بجائے کھڑے کھڑے میز پہ کچھ رکھا۔

لان میں موجود تینوں افراد نے اس چیز کو دیکھا۔

وہ ایک دھندلے شیشے کا ٹکڑا تھا۔

فائز نے نہ سمجھنے والے انداز میں پارس کو دیکھا پھر سویرا کو۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’اپنے بھائی کو دے دیجیے گا، وہ اسے پہچان لے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی جلد ہی تعزیت کرنے آئے گا۔ یہ دیکھنے کے بعد تو شاید مزید تاخیر نہ کرے۔‘‘ وہ مسکرا کر یوں کہہ رہی تھی جیسے یہ آخری بات ہو۔ اب مزید وہ ان کو برداشت نہیں کر سکتی۔

سویرا نے متذبذب انداز میں شیشے کا ٹکڑا اٹھایا اور کھڑی ہو گئیں۔ پارس کو بے بسی، غصے، اچنبھے سے بھری نگاہوں سے دیکھ کر وہ مڑ گئیں۔

’’جی تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟‘‘ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سامنے اشارہ کیا۔ فائز غائب دماغی کے عالم میں اس کے مقابل بیٹھا اور اپنے کاغذات پھیلائے۔ اس کے انداز میں واضح سست روی در آئی تھی۔ وہ یقیناً کچھ اور سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

’’یعنی تم بھائی جی سے ملے بغیر آگئے اور تمہیں نہیں معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے؟‘‘ سویرا کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی، کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ وہ دونوں آمنے سامنے اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑے تھے، باہر رات پھیل چکی تھی اور سویرا ساری بات کلیئر کرنے کے لیے صبح تک کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔ پارس کے سامنے وہ شاکڈ اور الجھی ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

’’مسئلہ یہ نہیں ہے آپا۔ میں یہ بات تنویر بھائی کو بھی بتا چکا ہوں، چھپانا ہوتا تو انہیں بھی نہ بتاتا۔‘‘ وہ جو گھنٹے سے سامنے کھڑا صفائی دے رہا تھا، اب زچ ہو گیا۔ ’’مسئلہ یہ ہے کہ پارس کو یہ کیسے پتا چلا؟‘‘

’’ظاہر ہے، تنویر نے بتایا ہوگا!‘‘

’’تنویر بھائی ایسا کیوں کریں گے؟‘‘

’’فیضی، تم نے خود مجھے بتایا ہے کہ تنویر اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔‘‘ انہیں کوفت ہوئی۔

’’وہ تو ہیں اور اسی لیے اگر انہوں نے یہ بات پارس کو بتائی ہوتی تو اسے ہمارے سامنے نہ دہرانے کی تنبیہ بھی کرتے...... تاکہ ان پہ شک نہ کیا جائے۔ وہ اس طرح خود کو ایکسپوز نہیں کریں گے۔‘‘ وہ صوفے پہ جا بیٹھا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

’’اور یہ شیشہ اس کی کیا کہانی ہے؟‘‘

’’میں نہیں جانتا...... وہ اس کو کیوں مجھ سے منسوب کر رہی ہے مگر یہ میں نے بھائی جی کی جیکٹ کے اندر دیکھا تھا، اس نے اسے سنبھال رکھا تھا۔ مجھے لگا اس نے اسی سے ان کا قتل کیا ہوگا۔‘‘ فیضی نے میز پہ رکھا ٹکڑا اٹھایا اور چہرے کے قریب لا کر الٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگا۔

’’اگر یہ شیشہ آلۂ قتل ہے تو اس کا تم سے کیا تعلق؟‘‘ فیضان نے جواب نہیں دیا، وہ شیشے کو غور

سے دیکھ رہا تھا، دفعتاً اس کی آنکھوں میں ایک احساس ابھرا۔ جیسے وہ چونکا تھا۔ جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے سر اٹھایا مگر سویرا کے تاثرات دیکھ کر رکا۔ وہ آنکھیں سکیڑے مشکوک انداز سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

’’کیا، آپا؟‘‘

’’بھائی جی کو تم نے تو نہیں مارا، فیضی؟‘‘

ان کے الفاظ تھے یا چابک جو فیضان کے چہرے پہ لگے۔ اس کا رنگ سرخ پڑا۔ لب بھینچے، آنکھوں میں بے یقینی ابھری اور پھر غصہ، وہ تیزی سے کھڑا ہوا۔

’’نہیں، میرا مطلب تھا، شاید پارس یہ سمجھتی ہو کہ......‘‘ اس کے تاثرات پہ سویرا کو اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوا، انہوں نے وضاحت کرنی چاہی مگر......

’’آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا؟ میں اپنے بھائی جی کا قتل کر سکتا ہوں؟ آپ کو لگتا ہے میں اندر سے اتنا evil ہوں؟‘‘ وہ دکھی بھی تھا اور حیران بھی۔ ’’پچھلے ایک گھنٹے سے آپ مجھے یوں Cross-examine کر رہی ہیں جیسے میں عدالت میں کھڑا ہوں۔ آج پہلی دفعہ آپ پارس سے ملیں اور بیس منٹ کی اس ملاقات میں اس نے ہم دونوں بہن، بھائی کے درمیان پھوٹ ڈلوا دی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی، مبارک ہو۔‘‘

’’میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اچھا بیٹھو۔‘‘ سویرا نے بازو سے تھام کر اسے بٹھانا چاہا مگر اس نے سر جھٹکتے ہوئے بازو چھڑایا۔

’’اب مجھ سے ناراض ہو گے تو وہ واقعی کامیاب ہو جائے گی۔‘‘

’’اوکے!‘‘ فیضی گہری سانس لیتے ہوئے واپس بیٹھ گیا۔

’’کیا تم نے یہ شیشہ پہچان لیا؟‘‘ انہوں نے اپنے الزام سے قبل اس کی آنکھوں میں ابھرے چمک جانے والے تاثر کی بابت پوچھا۔ فیضی چند لمحے ان کو دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلایا۔

’’یہ میرا نہیں ہے، میں اسے نہیں پہچانتا۔‘‘ اس نے ایک ہی فقرے میں دو جھوٹ بولتے ہوئے شیشہ میز پہ رکھ دیا۔ سویرا خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

لابی میں معمول کی روشنی اور رونق تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ لوگ آگے پیچھے گزر رہے تھے۔ بے فکر، خوش باش چہرے۔ ایسے میں شاید صرف اسی کا چہرہ فکر مند تھا، پُرتشویش تھا جو ریسپشن ڈیسک سے کہنی ٹکائے کھڑا، دور رکھی کانفرنس ٹیبل کی سربراہی کرسی پہ بیٹھی پارس کو دیکھ رہا تھا۔ پارس کی وہ لمبی میز لابی کے بالکل سرے پہ تھی اور اس وقت وہاں ایک آفیشل لنچ چل رہا تھا۔ پارس ریسپشن ڈیسک کے ساتھ خاموش کھڑے فائز کی جانب متوجہ نہیں تھی جو مسلسل اس کو دیکھتا، بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔

’’وہ شیشہ اس کے ہاتھ کیسے لگا؟ اسے کیسے پتا چلا کہ اس کا مالک فیضان ہے؟ وہ اسے جانتی ہے؟ کیا وہ یہ جانتی ہے کہ فائز ہی فیضان ہے؟‘‘ گزشتہ دو دنوں سے اس کے ذہن میں بار بار ابھرتے سوال اب سر میں درد کرنے لگے تھے۔

اسے بھائی جی کے قتل کا اور پارس کے قاتلہ ہونے کا ثبوت نہیں مل رہا تھا۔

اس کے پاس ہوٹل کے اہم کاغذ بھی نہیں تھے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ناکام ہو رہا تھا۔ سب بہت مشکل لگ رہا تھا اور اس سارے مسئلے کا ایک ہی حل تھا۔ جو کام وہ اس صبح جنگل میں ادھورا چھوڑ آیا تھا، اب پورا کر دے۔ ایک دفعہ پارس مر جائے، وہ سب ہتھیا لے گا۔ بھلا پھر کون اسے اور سویرا آپا کو ہوٹل سے نکالنے کی جرأت کر سکے گا۔ تنویر کو کی جانے والی رقم ٹرانسفر کے ثبوت کو وہ انہیں بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ یوں ان کا منہ بند ہو جائے گا۔ پارس

مر جائے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ اس نہج پہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ آج وہ فیصلہ کرکے آیا تھا۔ اس نے لمبی ٹیبل کی سربراہی کرسی پہ بیٹھی پارس اور اس کے مہمانوں کو دیکھا اور پھر ان کے سامنے خالی برتنوں کو...... کھانا لگنے والا تھا۔ آرڈر دیے بیس منٹ ہو چکے تھے اور کسی بھی وقت سرونگ شروع ہونے والی تھی۔ فیضان مڑا اور تیز تیز قدموں سے ریسٹورنٹ کی طرف بڑھا۔ وہاں سے وہ ہوٹل کے کچن میں آیا۔

اُدھر معمول سے ذرا زیادہ افراتفری پھیلی تھی۔ ہیڈ ویٹر سارے میں بولتا، ڈانٹتا پھر رہا تھا۔ بار بار مسز پارس کی ٹیبل کے آرڈر کو دہرایا جا رہا تھا سب تیار تھا۔ شیف نے سوپ کا بھرا ہوا پیالہ سجا کر ٹرے میں رکھا۔ جو ویٹر اسے اٹھانے کے لیے آگے آیا، فیضان کو دیکھ کر رکا۔

''پانی نہیں رکھا آپ نے۔'' اس نے برہمی سے ویٹر کو مخاطب کیا۔ وہ فوراً مستعدی سے پلٹا۔ بس پانچ سیکنڈ کے لیے سوپ والی ٹرے کے گرد فائز کے سوا کوئی نہ رہ گیا۔ اس نے تیزی سے جیب سے ایک ننھی شیشی نکالی اور سامنے سب کو دیکھتے ہوئے شیشی سوپ میں الٹی اور واپس جیب میں رکھ دی۔

گرم بھاپ اڑاتے سوپ میں وہ فوراً گھل مل گئی۔ ویٹر پانی لے کر واپس آیا، یہ میڈم پارس کا آرڈر تھا۔ وہ سب جانتے تھے۔

فائز وہاں سے نکل آیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ ریسپشن ڈیسک کے ساتھ کھڑا تھا۔ پارس اسی طرح مسکرا کر رسمی انداز میں اپنے مہمانوں سے بات کر رہی تھی۔ باری باری ویٹرز آکر ان کے سامنے آرڈر رکھنے لگے۔ فائز کی نگاہیں ہر ایک ٹرے کو دیکھتیں پھر ان میں نفی کا تاثر ابھرتا۔ پارس کے خاص، سبزی کے سوپ کی ٹرے ابھی تک نہیں آئی تھی۔

فائز کے چہرے پہ بے چینی در آئی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کامیابی سے چند قدم دور یا کسی بڑی تباہی سے چند گز قریب، وہ کہاں کھڑا تھا، وہ نہیں جانتا تھا۔

''میں بھائی جی کی موت کا بدلہ لے رہا ہوں۔'' وہ خود کو کہہ رہا تھا مگر اس کا دل عجیب سے احساس میں گھرا تھا۔ دفعتاً اس نے ویٹر کو اس ہرے سوپ کی ٹرے لاتے دیکھا۔ وہ بالکل ساکن ہو گیا۔ جیسے کوئی مرا ہوا آدمی سیدھا کھڑا ہو۔

ویٹر نے ٹرے سے سوپ کا پیالہ سرونگ ڈش کے ہمراہ پارس کے سامنے رکھا۔ پارس نے نیپکن گود میں بچھاتے ہوئے ہلکا سا تھینکس کہا۔ لنچ شروع ہو چکا تھا۔ سب اپنے چھری کانٹے سنبھال رہے تھے، البتہ وہ اس وقت صرف سوپ لیا کرتی تھی۔

اس نے سویا ساس اٹھائی اور سوپ میں چند قطرے ٹپکائے۔ پھر چند ایک دوسری ساسز ڈالیں۔ سوپ کی سطح پر مختلف رنگوں کے قطرے اور دھاریں بکھری تھیں۔ اس نے سوپ کا چمچ دھیرے سے اندر ہلایا۔ سارے رنگ مکس ہوتے گئے۔ ہرا مائع ہلکے سے گہرے رنگ کا ہو گیا۔

پارس سر جھکائے، اس سرمئی ہرے مائع کو دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرائی۔ یہ مدھم مسکراہٹ اپنے مہمانوں کو دی جانے والی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے قطعاً مختلف تھی۔ اس میں اداسی بھی تھی، امید بھی، دکھ بھی، ڈر بھی اور کوئی خوب صورت یاد بھی۔

وہ دھیرے دھیرے چمچ ہلا رہی تھی۔ سارے رنگ اندر گھل مل گئے۔ سوپ میں تیرتے ٹکڑے گول گول گھوم رہے تھے۔ درمیان میں منجدھار سا بن رہا تھا...... گول گول گھومتا منجدھار......

رضوان حیات اس لمبی ٹیبل کی سربراہی کرسی پہ اکیلے بیٹھے تھے۔ ان کے مہمان لنچ کے بعد ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے۔ وہ سبزی کا سوپ کب کا ختم کر چکے تھے اور اب نیپکن سے لب تھپتھپا رہے تھے۔

ویٹرز آگے پیچھے پھرتے برتن اٹھا رہے تھے۔ باقی لوگوں نے جی بھر کر کھایا تھا البتہ رضوان کے سامنے صرف سوپ کا خالی پیالہ تھا۔ وہ دوپہر میں صرف سوپ لیتے تھے۔

نیپکن رکھ کر انہوں نے سر اٹھایا تو ریسپشن پہ کھڑی وہ.... بالیوں والی لڑکی انہی کو دیکھ رہی تھی۔ ان کو دیکھتا پا کر وہ جھینپ کر نیچے جھک گئی۔ پھر سیدھی ہوئی تو ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ اب وہ کاؤنٹر کے ایک طرف سے نکل کر ان کی سمت آرہی تھی۔

رضوان ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھے گئے۔ سیاہ کوٹ اور اندر بھورے گرم سویٹر میں وہ ہمیشہ کی طرح باوقار لگ رہے تھے۔ ریسپشنسٹ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ چلتی ان تک آئی اور جھک کر پیکٹ ان کے سامنے رکھا۔

''سر! تنویر صاحب صبح میں دے کر گئے تھے، ان کو شہر سے باہر جانا تھا۔ آپ دیکھ لیں۔''

''تھینکس، پارس۔'' رضوان حیات نے پیکٹ اٹھا کر کھولا۔ پارس کا چہرہ چمکنے لگا۔ کوئی کچھ نہ کہے، بس آپ کا نام پکار کر ایک لفظ بھی بول دے تو کتنا اچھا لگتا ہے......

وہ عینک لگا کر اندر موجود کاغذ پڑھنے لگے۔

''بیٹھ جائیں، کھڑی کیوں ہیں؟'' پڑھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''تھینک یو، سر! مگر اچھا نہیں لگے گا۔''

''کس کو؟'' انہوں نے عینک کے اوپر سے دیکھا جو ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

''میرے ساتھی ریسپشنسٹ کو۔ اسے لگے گا، باس کے ساتھ بیٹھ کر مجھے ترقی مل رہی ہے اور اپنے پڑوسی کی ترقی کسی کو اچھی نہیں لگتی سر! بادشاہ، بادشاہ سے جلتا ہے اور فقیر، فقیر سے۔'' وہ جیسے بے بسی سے مسکرائی۔ رضوان نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''جب آپ ہماری ریسپشنسٹ ہوتی ہیں تو بہت اچھی باتیں کرتی ہیں اور جب نہیں ہوتیں تو صرف باتیں کرتی ہیں اور وہ اچھی نہیں ہوتیں۔'' وہ کاغذ پہ نگاہیں دوڑاتے کہہ رہے تھے۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے سر۔'' وہ بولی تو اس کا پورا چہرہ glow کرنے لگا۔ ''میں بدلنا چاہتی ہوں، میں لوگوں کے ہاتھوں مزید ایکسپلائٹ نہیں ہونا چاہتی۔ میں مضبوط بننا چاہتی ہوں۔''

''تاکہ آپ شادی کر لیں اور وہ گھر آپ کو مل جائے؟'' وہ طنز نہیں کر رہے تھے، پوچھ رہے تھے۔

پارس نے مسکرا کر نچلا لب دانتوں سے دبایا۔

''سر! مجھے اس گھر سے بڑھ کر آپ سے کچھ اور چاہیے۔ وہ اعتماد جو آپ میں ہے، مجھے وہی مضبوطی چاہیے۔''

''مگر آپ تو کہتی ہیں کہ میں خود کو نہیں بدل سکتا تو آپ کو کیسے بدلوں گا؟''

''آپ بھی بدل جائیں گے کیونکہ کوئی پینٹر ایسا نہیں ہوتا جو کسی تصویر میں رنگ بھرے اور اس کے اپنے ہاتھوں پہ رنگوں کے نشان نہ پڑیں اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی کے اوپر عطر کی پوری بوتل انڈیل دیں اور آپ کے اپنے ہاتھ نہ مہکیں۔''

''اچھا واقعی!'' رضوان حیات نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''اگر آپ بدلنا چاہتی ہیں تو ڈرنا چھوڑ دیں۔''

''چلیں، چھوڑ دیا۔''

''پھر اپنے ساتھی ریسپشنسٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے بیٹھ جائیں۔'' انہوں نے قریبی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ پارس کے چہرے پر مسکراہٹ سمٹی، اس کی جگہ ہیجان نے لے لی۔ اس نے ایک متذبذب نگاہ ریسپشن پر ڈالی جہاں ساتھی لڑکا کوئی فون اٹینڈ کرتے ہوئے مسلسل ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''اگر آپ نہیں بیٹھیں گی تو میں اس کو بلا کر پوچھ لیتا ہوں کہ اس کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہے اس بات سے؟''

”اٹس او کے سر!“ وہ تیزی سے دائیں ہاتھ کی قطار کی پہلی کرسی پہ بیٹھ گئی پھر ہمت کر کے مسکرائی۔

”آپ جتنا ڈریں گی، لوگ آپ کو مزید ڈرائیں گے۔ جب ڈرنا چھوڑیں گی تو لوگ آپ سے ڈرنے لگیں گے۔ غلط بات پہ خاموش رہنا چھوڑ دیں، آپ سے کوئی غلط بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ بس اب آپ جا سکتی ہیں۔ آخر آپ کو اپنے ساتھی کا غصہ بھی تو سہنا ہے۔“

”میں اس سے نہیں ڈرتی۔“ وہ گردن سیدھی اٹھا کر مجبوراً خود پہ طاری کردہ فخر سے بولی اور کھڑی ہوگئی۔

”وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔“ وہ واپس کاغذات کی جانب متوجہ ہوگئے۔ پارس دھڑکتے دل کے ساتھ واپس اپنی جگہ پہ آئی تو ساتھی لڑکا جواب کی بورڈ پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا، تیزی سے اس کی طرف مڑا۔

”رضوان صاحب تم سے کیا کہہ رہے تھے؟“

”کچھ نہیں۔“ پارس سر جھکائے اپنے پرس کو کھنگالتے ہوئے بولی۔

”مگر تم اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔“

پارس نے آنکھیں بند کیں گہری سانس اندر اتاری پھر آنکھیں کھول کر گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ تمہیں جاب سے نکال کر کسی اور کو ریسپشن پہ رکھنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ ایسا کریں یا نہیں۔ میں نے کہا، نہ کریں، یہ لڑکا بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ بس یہی بات تھی۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنے کمپیوٹر پہ جھک گئی۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

گول، گول گھومتا منجدھار اب ساکن ہو رہا تھا۔ پارس نے سوپ کو ہلانا ترک کر دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اب سمٹ کر محض آزردگی کا نشان رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں، دل میں، بس ایک تکلیف۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر ریسپشن ڈیسک کو دیکھا۔ وہاں پہ وہی لڑکا آج بھی کوئی فون اٹینڈ کر رہا تھا۔ ساتھ کاؤنٹر پہ کہنی رکھے فائز کھڑا تھا۔

پارس ہلکا سا مسکرائی۔ فائز جواباً بدقت تھکان سے مسکرایا جیسے وہ مضطرب اور ناخوش ہو۔ پارس اپنے سوپ کی طرف متوجہ ہوئی۔

لوگ خود چلے جائیں، تب بھی اپنے اثرات، اپنی عادات ہمارے اردگرد ثبت کر جاتے ہیں۔ یہ سوپ بھی اس کے روڈ میپ کا ایک سائن بورڈ تھا۔

فائز نے دھڑکتے دل سے اسے دیکھا۔ اس کے لب اضطرابی انداز میں بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے کہنی کاؤنٹر سے ہٹا دی تھی۔ وہ اب کسی اور طرف نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

پارس نے چمچ بھرا اور لبوں کے قریب لے کر آئی۔ کن انکھیوں سے اسے کاؤنٹر پہ حرکت کا احساس ہوا۔ اس نے فائز کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ چمچ نے ابھی اس کے لبوں کو چھوا ہی تھا کہ......

”اسٹاپ۔“ وہ تیزی سے اس کے سر پہ پہنچا اور اس کا چمچ والا ہاتھ پکڑ کر پرے کیا۔ پارس کا ہاتھ مڑا، سوپ چھلک گیا، وہ شاکڈ رہ گئی باقی لوگ بھی اسے دیکھنے لگے۔

”میم، آئی ایم سوری مگر......“ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر ہانپتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”مگر جب ویٹر لا رہا تھا تو میں نے...... دیکھا اس میں کوئی کیڑا گرا اور پھر باہر نکل گیا۔ آئی ایم سوری......“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سب سے معذرت کی۔ ”مت پئیں، یہ خراب ہو چکا ہے سوری۔“ اس نے سوپ کا پیالہ اٹھا لیا پھر سب سے معذرت کی اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ البتہ اب اس کے چہرے پر ذرا سکون تھا۔

پارس حق دق بیٹھی تھی۔ دماغ ذرا کام کرنے کے قابل ہوا تو اس نے بدقت مسکرا کر تمام لوگوں کو دیکھا جو کھانا چھوڑ کر بیٹھے تھے۔ اس نے معذرت کی اور کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ چند لمحوں میں ماحول نارمل ہونے لگا۔

...وہ خود گا ہے بہ گا ہے پریشانی سے ریسپشن پہ نظر ڈال لیتی تھی۔ فائز اب وہاں کہیں نہیں تھا۔

☆☆☆

شکیل لاؤنج کے صوفے پہ ٹانگیں لمبی کیے بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ساتھ میں وہ ایک خوب صورت کرسٹل پلیٹ .... میں رکھے خشک میووں سے بھی انصاف کر رہا تھا۔ فیروزہ مائی کچن سے نکلی تو اسے دیکھ کر فکر مند نظر آنے لگی۔ وہیں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

”شکیل! تو نے آگے کا کیا سوچا؟“

”سوچنا کیا ہے، جو ذہن میں تھا بتا دیا۔ بتانے سے یاد آیا، ہزار دو ہزار ہوں گے تیرے پاس؟“ اس نے اس پلیٹ ...... کے بادام کے خانے میں سے مٹھی بھری اور منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے وہ کچھ دیتی ہی کب ہے؟“ فیروزہ مائی کی جان جل گئی۔

”پہلے بھی تو نہیں دیتی تھی تو خود لے لیتی تھی۔ اب کیا ہو گیا ہے؟“

”پہلے وہ رضوان حیات کی بیوی نہیں تھی۔“

”بیوہ۔“ اس نے اب دو انگلیوں سے کشمش اٹھاتے ہوئے تصحیح کی۔

”اب میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“

”مگر اس کے تالوں میں چابی تو اب بھی تو لگا سکتی ہے نا۔“ شکیل سیدھا ہو کر بیٹھا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”چپ کر۔“ فیروزہ مائی نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر شکیل کو......

”لے کھا اور سوچ، اس کے لاکرز کدھر ہوتے ہیں۔“ شکیل نے کرسٹل کی ڈرائی فروٹ پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ فیروزہ مائی نے تشویش زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ گول پلیٹ میں کراس لگا کر چار خانے بنے تھے۔ ہر خانے میں میوے تھے۔

بادام، اخروٹ، کشمش اور کاجو۔ تمام خشک میوہ جات آدھے، آدھے بچے تھے۔ ان کے خانوں میں کرسٹل کی زمین نظر آ رہی تھی، دھندلا کرسٹل جو منعکس بھی کرتا اور آر پار بھی دکھاتا۔

فیروزہ مائی کی نگاہیں کرسٹل کی سطح پہ جم گئیں۔ اَن مٹ کہانیاں ایک دفعہ پھر ابھرنے لگی تھیں۔

کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ شکیل نے آواز دینے کا سوچا۔ پھر ارادہ ترک کر کے اندر جھانکا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں اچنبھے سے پھیلیں۔

فیروزہ مائی زمین پہ بیٹھی، الماری کے نچلے خانے سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ تلاش کافی دیر سے جاری تھی کیونکہ ساری الماری کا سامان باہر بکھرا تھا۔

”امی!“ فیروزہ مائی ڈر کر پلٹی۔ اسے دیکھتے ہی اس کی اُڑی رنگت بحال ہوئی جیسے سانس میں سانس آئی۔

”تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“ وہ سونے کے جھمکوں والے کانوں کے پیچھے دوپٹا اُڑس کر دوبارہ الماری کی طرف متوجہ ہوئی۔ شکیل نے حیرت سے سارے میں نظر دوڑائی۔

”تو کیا کر رہی ہے پارو کی الماری میں؟ اور پارو کدھر ہے؟“ ساتھ ہی آس پاس دیکھا۔

”وہ ٹیوشن سینٹر گئی ہے۔ موقع اچھا ہے اس کے آنے تک میں اس کے صندوق کی چابی ڈھونڈ لوں گی۔“ فیروزہ مائی کے ہاتھ اور زبان مسلسل چل رہی تھی۔ شکیل نے الجھن سے اسے دیکھا تبھی چارپائی پہ رکھا چھوٹا سا صندوق نظر آیا جس کو ننھا سا تالا لگا تھا۔

”اس میں کیا ہے؟“

”پارو کی ماں کا زیور ہے۔ اس نے اپنی بہن کے پاس رکھوایا تھا۔ کل وہ ایبٹ آباد سے آئی تھی تو پارو کو دے گئی ہے۔“

”اچھا، وہ پارو کی خالہ اس لیے آئی تھی؟“

شکیل نے ساتھ ہی صندوق اٹھایا۔ چھوٹا سا جیولری باکس۔ اس نے ہلایا۔ اندر چیزیں چھن چھن بجیں۔

''مل گئی۔'' فیروزہ مائی کی فاتحانہ پکار بلند ہوئی۔ تھکاوٹ مگر خوشی سے معمور پکار۔ وہ ننھی سی چابیوں کا رنگ لیے پلٹی اور صندوق شکیل کے ہاتھ سے جھپٹا۔

''تو زیور کا کیا کرے گی؟''

''چپ تو کر نہ'' اس نے تالا کھولا اور ڈھکن اٹھایا۔ اندر سونے کی چمک نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ گو کہ ایک ہار، دو بندے اور دو کڑے ہی تھے اور بہت بھاری بھی نہ تھے مگر پیلے رنگ کی اس دھات کی شکل ہی دل باندھ دیا کرتی ہے۔

''تو باہر دیکھ، وہ آ نہ جائے۔'' اس کو دروازے پہ پہرہ دینے کا کہہ کر فیروزہ مائی جلدی جلدی زیور نکال کر اپنے دوپٹے پر رکھنے لگی۔ پھر اس نے دوپٹے کے پلو کے کونے پر باندھ کر پوٹلی بنائی، آخری گرہ دی اور......

''لے کھاناں......'' شکیل کی آواز پر وہ چونکی۔ پھر بددلی سے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے نہیں پتا وہ پیسے کدھر رکھتی ہے۔ کمرے میں شاید کوئی لاکر ہو اور......''

شکیل اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتی تھی وہ کیا کرنے جا رہا ہے، سو بات ادھوری چھوڑ دی اور خود بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ پریشانی، تجسس۔ لالچ سب گڈمڈ ہو گیا۔

پارس کے کمرے میں خاموشی اور نیم تاریکی تھی۔ شکیل نے بتی جلائی اور پھر الماری کے ایک، ایک کر کے سارے پٹ کھولے۔ نفاست سے ٹنگے کپڑے، تہ لگی شالز، جوتے۔ صرف ایک نظر میں ہی ساری الماری سامنے آگئی۔ شاید آدھا منٹ بھی نہیں ہوا جب شکیل کو نچلے، جوتوں کے خانے میں سیف نظر آیا۔ وہ پنجوں کے بل جھکا اور سیف کو باہر نکالنا چاہا

مگر وہ وہاں نصب تھا۔ اس نے جھکے، جھکے اس کے دروازے پر ہاتھ پھیرا۔

وہاں صفر سے نو تک دس ہندسے بنے تھے اور ساتھ چھوٹی سی اسکرین۔

''یہ کیسے کھلے گا؟'' فیروزہ مائی اس کی پشت پہ جھکی تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

''اس کا پاس ورڈ لگانا پڑے گا، تجھے پتا ہے پاس ورڈ کیا ہے؟'' شکیل نے نمبرز پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''میں بتاؤں پاس ورڈ؟''

وہ دونوں کرنٹ کھا کر پلٹے۔

دروازے میں پارس کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے، کندھے پہ پرس، چہرے پر سکون اور آنکھوں میں سرد مہری۔ شکیل تھوک نگلتے بہ مشکل اٹھا۔ فیروزہ مائی کا چہرہ فق ہو چکا تھا۔

''وہ......'' فیروزہ مائی نے کچھ کہنا چاہا، پارس نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔

''کسی جھوٹ کی ضرورت نہیں ہے، یہ میری خالہ کے صندوق کا تالا نہیں ہے جسے تم دونوں کھول لو گے۔'' وہ اندر آئی اور پرس اتار کر سنگار میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے میرا تم دونوں کے لیے ایک مشورہ ہے۔'' گلاسز میز پر رکھ کر وہ پلٹی اور شکیل کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سختی سے بولی۔

''یہ میرا گھر ہے، اگر ادھر رہنا ہے تو انسانوں کی طرح رہو، ورنہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینکنے میں مجھے پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے، سمجھے تم؟''

''تم سیدھے طریقے سے پیسے دے دو، تو مجھے انگلیاں ٹیڑھی نہیں کرنی پڑیں گی۔'' وہ سنبھل چکا تھا اس لیے خباثت سے مسکرا کر بولا۔

''ایک پیسہ نہیں دوں گی، جو کرنا ہے کر لو، ناؤ گیٹ آؤٹ۔'' اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ شکیل نے کالر جھٹکا، منہ ہی منہ میں

مسکرا کر کچھ بولا اور باہر نکل گیا۔ فیروزہ مائی پارس سے نگاہ ملائے بغیر جانے کے لیے مڑی تو اس نے اسے کہنی سے تھام کر روکا۔

"اپنے بیٹے کو سمجھا دو، ورنہ تم نے ہی کہا تھا کہ پارس نے رضوان حیات کو مارا ہے تو یاد رکھو، اگر میں رضوان حیات کو مار سکتی ہوں تو تمہارا بیٹا کیا چیز ہے؟" انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتے ہوئے وہ بولی تو بیک وقت فیروزہ مائی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر رے مگر وہ کچھ کہے بنا باہر نکل گئی۔

شکیل اپنے کمرے میں بیڈ کے سرے پر بیٹھا تھا۔ فیروزہ مائی نے اندر قدم رکھا تو اس نے سر اٹھایا۔

"یہ تو واک کے لیے گئی تھی، اتنی جلدی کیسے آ گئی؟" فیروزہ مائی جواب دیے بِنا قریب آئی اور شکیل کا چہرہ سوگواریت سے دیکھا۔

"تو ٹھیک کہتا تھا اگر یہ زندہ رہی تو رضوان حیات کی طرح تجھے بھی مار دے گی، ناگن۔"

"یعنی تو میرے ساتھ ہے امی؟" بالآخر شکیل کے چہرے پر سکون آمیز مسکراہٹ ابھری۔

فیروزہ مائی نے سر ہلا دیا۔ نفی میں نہیں۔ اثبات میں......

☆☆☆

وہ بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ بیڈ کور سینے تک ڈلا تھا اور ویران آنکھوں سے وہ چھت کو تک رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ چوکھٹ پہ کھڑے شخص کا پہلے ہیولا نمودار ہوا پھر اس نے لائٹ جلائی تو بستر پر لیٹا فیضان چونکا۔

"فیضی! ایسے کیوں لیٹے ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" سویرا آپا آگے آئیں اور اس کی پیشانی چھوئی۔

"ٹھیک ہوں۔ بس تھک گیا تھا۔" وہ سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا اور دونوں آنکھیں ملیں بہت دیر اندھیرے میں رہنے کے بعد ایک دم ڈھیر ساری روشنی یونہی چند لمحے کے لیے بصارت کو چُندھیا دیتی ہے...... مگر پھر جیسے جیسے آنکھیں عادی ہوتی ہیں ہر شے واضح نظر آنے لگتی ہے، اور...... دل مزید بوجھل ہوجاتا ہے۔

"آپ اِدھر کیسے؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟" اس نے پلکیں سکیڑے سویرا آپا کو دیکھا، جو اَب سامنے کرسی پہ بیٹھ گئی تھیں۔

"پارس آفس میں ہے اور مجھے باقی کسی کا خوف نہیں مگر تم اتنے بجھے بجھے کیوں لگ رہے ہو؟"

"یونہی۔" فیضان نے پھر سر جھکا دیا۔ وہ رات سے یونہی لیٹا تھا اور اب صبح ہوچکی تھی۔ اس کے جوگرز ابھی تک پیروں میں تھے۔ گزشتہ روز والا اضطراب بھی چہرے پہ تھا۔

"تنویر بھائی کا فون آیا تھا، بتا رہے تھے کل تم نے پارس کا سوپ اُلٹ دیا۔ اس کا اتنا خیال کب سے ہونے لگا تمہیں؟" وہ خفا تھیں اور مشکوک بھی۔

فیضان نے تھکی تھکی نگاہوں سے سویرا آپا کو دیکھا۔

"کیونکہ میں بہت کچھ ہوسکتا ہوں مگر قاتل نہیں۔ میں اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کرسکا۔"

"فیضی!" وہ مزید کچھ نہ بول سکیں۔

"ہاں اس نے بھائی جی کو قتل کیا ہے، ہاں اس نے ہم سے بھائی جی کو چھینا ہے مگر میں اسے قتل نہیں کرسکتا۔ مجھ سے یہ نہیں ہوا۔" وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے تھکاوٹ سے کہہ رہا تھا۔

"تم اپنے مقصد سے ہٹ رہے ہو۔ یاد ہے تم نے یہاں آنے سے قبل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو پارس اِدھر نہیں ہوگی۔" وہ بے چینی سے تیز تیز بول رہی تھیں جیسے پٹڑی کے آگے سے ہٹ جانے والے بچے کی انگلی پکڑ کر اسے جلدی، جلدی ٹرین کے سامنے لانے کی کوشش کررہی ہوں۔

"مگر میں کیا کروں؟ میں اس کو مار نہیں سکتا۔

مجھے اب بھی شک ہے کہ وہی بھائی جی کی قاتل ہے مگر میں اس کے ساتھ وہ نہیں کرسکتا جو اس نے بھائی جی کے ساتھ کیا۔ میں کسی سے یوں جینے کا حق نہیں چھین سکتا۔ ہم قانونی کارروائی کررہے ہیں ناں، کیا وہ بہت نہیں ہے؟"

سویرا آپا نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"ہو تو تم بھائی جی کے بھائی۔ اس کے حُسن نے تمہیں بھی ان کی طرح مسحور کردیا ہے مگر یاد رکھنا، میں تمہیں بھائی جی والی غلطی نہیں کرنے دوں گی۔"

"آپ بات کو کس طرف لے کر جارہی ہیں؟ مجھے اس کی شکل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔" وہ برا مان کر بولا مگر سویرا آپا نفی میں سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم بزدل ہوگئے ہو فیضی۔" حسبِ توقع اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

"میں بزدل نہیں ہوں، میں صرف......"

"اور کسے کہتے ہیں بزدلی؟ تم اگر اپنے باپ جیسے بھائی کے قتل کا بدلہ نہیں لے سکتے تو تم اپنے مرد ہونے پر لعنت کرنا۔" وہ غصے میں کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔ فیضی لب کاٹتا ان کو دیکھتا رہ گیا پھر بے اختیار بے بسی و غصے سے بیڈ پہ زور سے مکا مارا۔

"ڈیم اٹ......!"

پھر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا تو دیکھا دور جنگل میں پارس چلتی جارہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کینوس شوز پہنے تیز تیز چلتی وہ درختوں کے بیچ سے گزر رہی تھی۔ بال ڈھیلے جوڑے کی شکل میں بندھے تھے اور چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا یہاں پھولوں کے اوپر سے بہہ کر اس کے قدموں میں گر رہی تھی۔ خوب صورتی در خوب صورتی۔

اس نے ہلکا سا سویٹر پہن رکھا تھا جس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ مگن سی قدم اٹھا رہی تھی۔ ہر درخت، ہر پتے پہ ایک یاد رقم تھی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی، یادوں کا روڈ میپ پھر سے کھلنے لگتا۔

ایک درخت کے سامنے وہ بے اختیار رکی۔ پھر اس کے تنے پہ ہاتھ پھیرا۔ وہاں چاقو سے ایک تاریخ کُھدی تھی۔ سات ماہ قبل دسمبر کی تاریخ۔

پارس کی آنکھیں گلابی پانی میں ڈوبنے لگیں، اس نے انگلیوں سے ان ہندسوں کو چھوا۔ ہر عدد صاف تھا۔ ہر لکیر، ہر دائرہ، سب واضح تھا۔ پھر بھی اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں وہ دھندلا پڑتا گیا۔ اس نے جھپک کر پلکیں کھولیں تو درخت کا تنا صاف تھا! اس پر کچھ نہ لکھا تھا اور وہ اسی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس نے گھٹنوں تک آتا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور بال کھلے تھے۔ ہاتھ میں چاقو تھا جس کی نوک کو تنے پہ رکھے وہ کچھ لکھنے کا سوچ رہی تھی۔ یک دم چونک کر پلٹی۔

پیچھے رضوان کھڑے تھے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ہڈ والا جیکٹ پہنے مسکراتے ہوئے، درخت سے ٹیک لگا کر اسے دیکھتے ہوئے۔

"آپ میرا پیچھا کررہے تھے؟" وہ مسکراہٹ دبا کر خفگی سے بولی۔

"نہیں، میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ آپ لکھنا جانتی ہیں یا نہیں۔"

"اور کس نتیجے پر پہنچے آپ؟"

"یہی کہ آپ نہیں جانتیں، ورنہ اتنی دیر چاقو پکڑے بیکار نہ کھڑی رہتیں۔" پارس نے بہ مشکل مسکراہٹ روکی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ کیا لکھوں مگر ابھی فیصلہ نہیں کر پائی۔ ویسے مجھے پتا تھا آپ ضرور آئیں گے۔" وہ دونوں آمنے سامنے درختوں کے بیچ کھڑے تھے۔

"پچھلے چار دن سے ہم اکٹھے واک کررہے ہیں، اس لیے مجھے بھی معلوم تھا کہ آپ میرا انتظار کریں گی۔"

"مجھے واک کی عادت نہیں ہے مگر میں ہر دفعہ وہ گھر دیکھنے آتی ہوں جو آپ مجھے گفٹ کرنے جا رہے ہیں۔" اب کے وہ شرارت سے مسکرا دی تھی۔ رضوان نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے، کندھے اچکائے۔

"کل میں نے وہ گھر خرید لیا ہے، اب بتائیں، کب ہے آپ کی شادی؟"

"نہیں...... سر...... وہ تو...... وہ تو محض ایک مذاق تھا۔" پارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی، آنکھوں میں حیرت اتری اور پھر پریشانی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا تھا اور میں اس طرح کے مذاق نہیں کرتا۔"

"مگر سر...... اوہ گاڈ...... آپ نے وہ گھر خرید لیا؟ میرے لیے؟" اس کی تو جیسے سانس رک گئی تھی۔ رضوان نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا مگر اس وعدے کی ایک شرط بھی تھی۔ آپ شادی ضرور کریں گی۔"

پارس لب کاٹتی انہیں دیکھنے لگی۔ بھویں بھینچے وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

"سر! میں یہ گھر...... اتنا بڑا گفٹ...... میں نہیں لے سکتی۔"

وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور بالکل سامنے آ رکے۔

"کل آپ نے کہا تھا کہ جب سے آپ میرے ساتھ واک کرنے لگی ہیں، آپ میں اعتماد آ رہا ہے، آپ اچھا محسوس کرتی ہیں۔ پارس وہ اعتماد اگر میرا دیا تحفہ ہے اور آپ وہ قبول کرتی ہیں تو وہ اس گھر سے بڑا تحفہ ہے کیونکہ خود پہ اعتماد ایک ایسی چیز ہے جو آپ پیسے سے نہیں خرید سکتیں۔"

پارس کی آنکھوں میں اداسی اتری۔ اس نے پلکیں جھکا دیں۔

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں شادی کروں گی مگر شاید میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔"

"کوئی چھوڑ کر چلا گیا تھا جس کا انتظار کر رہی ہیں؟" انہوں نے آنکھیں سکیڑے بغور اس کے جھکے سر کو دیکھا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" پارس نے چونک کر چہرہ اوپر کیا۔ البتہ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزرے تھے۔

"تو پھر زندگی کا فیصلہ کر لیں، ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔"

"آپ میرے بارے میں اتنے فکرمند کیوں رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا تو اس کی آواز میں زمانوں کی اداسی تھی۔

"مجھے آپ میں اپنا آپ نظر آتا ہے۔ اپنی جوانی اور مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نے شادی کیوں نہیں کی، اس لیے چاہتا ہوں کہ میری غلطی آپ نہ دُہرائیں۔"

"تو آپ اب کر لیں شادی" اس کے لبوں سے بے اختیار پھسلا۔

"اس عمر میں مجھ سے کون کرے گا شادی؟" وہ ہلکے سے مسکرائے۔

"ارے" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ "آپ رضوان حیات ہیں، آپ سے تو ہزاروں لڑکیاں شادی کرنے پر راضی ہوں گی۔"

"مگر ان ہزاروں میں سے ایک بھی میری دولت کے بجائے میری ذات سے محبت نہیں کرتی ہوگی۔ مجھے کوئی ایسی بیوی نہیں چاہیے جو میرے مرنے کا انتظار کرے تاکہ تب وہ ساری دولت سمیٹ کر اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ چلی جائے۔ مجھے ایسی بیوی چاہیے جو میری ساتھی ہو۔ وہ جیسے عیسائی شادی کے وقت عہد لیتے ہیں ناں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھی رہیں گے۔

"in sickness and in health"

بالکل ویسی ہی صحت اور بیماری میں ساتھ رہنے والی چاہیے مجھے۔"

"کوئی تو ملی ہوگی ایسی؟" وہ چند لمحے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر دوبارہ مسکرائے مگر اداسی سے۔

"ہاں، ملی مگر بہت دیر سے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے بھویں سکیڑیں۔

"ایسا کریں، یہاں آج کی تاریخ لکھ لیں۔" انہوں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "کیونکہ آج کے دن ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے کتنی دیر سے ملی۔"

"مگر...... پہلے آپ بتائیں اگر ایک عورت آپ کے ساتھ مخلص ہے تو اس کو پروپوز کرنے سے کیا چیز آپ کو روک رہی ہے؟" وہ ناراضی سے بولی جیسے دماغ وہیں اٹکا تھا۔ رضوان حیات کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اداسی بڑھی۔

"اس کے ہاتھ میں پکڑا چاقو۔" وہ دھیرے سے بولے۔

اور چاقو بنا آواز کے زمین پہ جا گرا۔ پارس کی سانس رکی، آنکھوں میں بے یقینی اتری۔ وہ بالکل ساکت ہو گئی تھی۔

"آئی ایم سوری، مجھے آپ کو یہ کبھی نہیں بتانا چاہیے تھا۔" وہ مزید اس کی طرف دیکھے بنا پلٹ گئے۔ وہ ہکا بکا انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ دل و دماغ سُن ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ درختوں کے بیچ دور جاتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے جیکٹ کی ہڈ ہوا سے ہولے ہولے جھول رہی تھی، پارس نے انہیں آواز دینی چاہی مگر حلق میں کانٹے اگ آئے۔ وہ سردی میں برف کا بت بنی کھڑی رہی۔

پھر کتنی ہی دیر بعد اس نے جھک کر چاقو اٹھایا اور پلٹ کر تنے پہ ہندسے کھودنے لگی۔ جو بھی تھا، وہ ان کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔

"کیا یہ کوئی خاص تاریخ ہے؟" آواز پر پارس ڈر کر پلٹی۔ ماضی کا فسوں لمحے بھر میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے شجاع کھڑا تھا۔

وہ پرانی یاد میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ ٹھیک سے ردِعمل بھی نہ ظاہر کر سکی۔ شجاع کو دیکھا، اردگرد درختوں کو اور واپس کُھدے ہوئے تنے کو۔

"تم رو رہی ہو، پارس؟" شجاع کے دوسرے فقرے نے اسے مکمل طور پر ماضی سے کھینچ کر باہر نکالا...... اس نے بے اختیار ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

"ہاں، دراصل، یہ تاریخ...... یہ وہ دن تھا جب رضوان نے مجھے پروپوز کیا تھا۔" جواب دیتے ہوئے وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ شجاع نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور خاموش ہو گیا۔

"تم اِدھر کیسے......؟" پارس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی...... سب سنسان پڑا تھا۔ "اور پلیز یہ مت کہنا کہ تم اتفاق سے مجھ سے ٹکرائے ہو۔"

"افضل بابا نے بتایا تھا کہ تم واک کے لیے گئی ہو...... اس لیے تمہیں ڈھونڈنے آیا۔"

"اب تو میں واپس آنے والی تھی، تمہیں مجھے ڈھونڈنے کا خیال اتنی دیر سے کیوں آتا ہے شجاع......؟" وہ اسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے کھڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"اور تم مجھ سے ہمیشہ ناراض کیوں رہتی ہو؟"

"ناراض اُن سے ہوا جاتا ہے جن پر مان ہوتا ہے کہ وہ منا لیں گے اور ہم مان جائیں گے اور جس پر سے سارا اعتبار اٹھ جاتا ہے اس سے کوئی ناراض نہیں ہوتا۔"

"میں نے تمہارا اعتماد توڑا یا تم نے میرا......؟" وہ برہمی سے پوچھنے لگا۔ "میں تو تمہیں فون بھی کرتا تھا، خط بھی لکھتا تھا مگر تم نے منع کر دیا، تم مجھ پر چیختی چلاتی تھیں کہ میں یہ سب نہیں کیا کروں۔"

پارس ایک لمحے کو بالکل چپ ہو گئی البتہ اس کی آنکھوں میں دکھ ابھرا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر تم پرانے کھاتے کھلوانا ہی چاہتے ہو تو سنو۔" وہ بولی تو اس کی آنکھوں میں دکھ

کے ساتھ ساتھ انگارے جلنے لگے۔ ”میں کہتی تھی چھت پہ نہ ملو، تم کہتے تھے، تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں، کیا تم اتنے بچے تھے شجاع کہ تمہیں احساس نہ ہوا کہ یوں چھت پر ملنا، یوں خط، فون، یہ سب میری بدنامی کا باعث بن سکتا تھا، میں ایک کمزور اور غریب لڑکی تھی، تم نے......“

”تم مجھ پر اعتبار تو کرتیں، میں تمہیں بدنام نہ ہونے دیتا، ساری دنیا سے لڑتا تمہارے لیے اگر تم ساتھ ہوتیں۔“ وہ بات کاٹ کر اسی مضبوطی سے بولا۔

”میری دنیا بھائی اور امی، رافعہ اور تمہاری ماں بہنوں پہ ختم ہوجاتی تھی، شجاع تم ان سے لڑ نہیں سکے، اُن کے سامنے مجھے بے عزت و رسوا ہونے سے نہیں روک سکے اور تم دنیا سے میرے لیے لڑتے؟“ بولتے بولتے اس کی گردن کی نسیں ابھر آئی تھیں، آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں مگر وہ خائف نہیں ہوا تھا۔

”تم میرے ساتھ کھڑی تو ہوتیں، مجھے کبھی کہا تو ہوتا کہ میرا انتظار کروگی، کیا میں اتنا بے اعتبار تھا تمہارے لیے؟“

”انتظار؟“ اس کے منہ پہ تو گویا طمانچہ پڑا۔

”تم لوگوں نے اپنا وہ گھر بیچ دیا اور کسی دوسرے محلے میں شفٹ ہوگئے، بتایا بھی نہیں کہ کدھر جارہے ہو، میں نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا مگر تم نے دعوے کیے تھے، تم واپس کیوں نہیں آئے؟ ان آٹھ سالوں میں ایک دفعہ بھی تم پاکستان نہیں آئے کیا؟“

”آیا تھا مگر تم لوگ بھی تب وہ گھر چھوڑ کر جاچکے تھے۔“

”ہمارے نئے گھر کا پتا خاندان میں سب کو معلوم تھا، کیا تم نے کسی سے پوچھا؟“

”امی نے کہا تھا کہ تم لوگوں نے پتا کسی کو نہیں......“

”تم اپنی امی کو جانتے تھے شجاع، تو تم نے ان کے علاوہ کسی اور سے کیوں نہیں پوچھا؟“ شجاع لمحے بھر کو بالکل خاموش ہوگیا، وہ سلگتی آنکھیں لیے اس کے سامنے کھڑی سارے حساب مانگ رہی تھی۔

”سچ تو یہ ہے کہ میں تائی کو بھی جانتا تھا، اسی لیے کچھ بن کر آنا چاہتا تھا تاکہ تائی مجھے انکار نہ کرسکے۔“

”یہ تو وہ ہے جو تم نے اپنی تائی کے لیے کیا، تم نے میرے لیے کیا کیا، مجھے وہ بتاؤ؟“

”پارس ...... پارس ......“ وہ چکرا گیا تھا۔

”میں آیا تھا، جب مجھے لگا میں کسی قابل ہوگیا ہوں تو میں تم سے ملنے مری آیا تھا، میں نے تمہارا مری کا پتا تک ڈھونڈ لیا تھا مگر جب میں آیا تو تم شادی کرچکی تھیں، وہ بھی ایک امیر بوڑھے سے...... میں نے تمہارے لیے یہ کیا کہ تمہاری زندگی ڈسٹرب کیے بغیر اپنے دل پر پتھر رکھ کر واپس چلا گیا۔“

”تم تب آئے جب امی نے تمہاری خالہ کو فون کرکے بتایا کہ پارس نے رائل ہوٹل کے مالک سے شادی کرلی ہے...... تب تمہاری خالہ نے بتایا کہ شجاع تین دن بعد پاکستان آرہا ہے، اگر تم نے میرے لیے کچھ کرنا ہوتا تو یہ خبر اپنی خالہ سے سن کر خاموشی سے بیٹھ جاتے یا کہ پاکستان آنے کے تیسرے روز ہی مری آجاتے؟“ شجاع کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔

”تو تم جانتی تھیں میں آیا تھا؟“

”ہاں...... تمہاری خالہ سے فیروزہ مائی کا رابطہ اس شادی کے بعد شروع ہوا تھا مگر قائم ابھی تک ہے ان سے ہر خبر ہمیں مل جاتی ہے، ہمیں نہ کچھ پوچھنا پڑتا ہے، نہ پوچھنے کی خواہش ہے۔“ وہ چبا چبا کر بولی۔ آنکھیں ابھی تک جل رہی تھیں اور جلا رہی تھیں۔

”میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ خالہ نے جھوٹ کیوں بولا کیونکہ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ تم یوں کسی اور سے شادی کرسکتی ہو۔“

”بلکہ یوں کہو کہ تم مجھ سے حساب مانگنے آئے تھے مگر میرے شوہر کی دولت اور مرتبہ دیکھ کر مرعوب ہوکر خاموشی سے چلے گئے۔“ وہ استہزائیہ مسکرائی۔ شجاع کی پیشانی پر بل پڑے۔

”پارس تم ہر کسی کو دولت کا لالچی کیوں سمجھتی ہو؟“

”جاؤ شجاع، میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دینے کے بجائے اکتاہٹ سے رخ پھیر لیا، وہ چند ساعتیں وہیں کھڑا رہا پھر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

پارس اپنے سامنے درخت پر کندہ تاریخ کو دیکھتی رہی...... آنکھوں میں جلتی سلگتی چنگاریاں اب کرچیوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

فائز نے پارس کے آفس کے گلاس ڈور کے پار جھانکا...... وہ سر جھکائے تیز تیز کاغذ پر قلم چلارہی تھی۔ صبح وہ جس طرح پژمردہ سی واک سے واپس آرہی تھی، اب اس پژمردگی کا شائبہ تک اس کے وجود پہ نہ تھا۔ وہ پرسکون، بے تاثر اور سنجیدہ لگ رہی تھی۔

فائز نے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا، پارس نے سر اٹھایا...... اسے دیکھ کر وہ نرمی سے مسکرائی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائی تھی۔

”یہ فائلز آپ نے منگوائی تھیں؟“ اس نے چند فائلیں پارس کے سامنے رکھیں، اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ اور ویران تھیں۔

”شکریہ......“ پارس نے فائلز کو نہیں، اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اٹس او کے میم...... یہ سامنے ہی رکھی تھیں، مجھے کوئی محنت نہیں کرنی پڑی۔“

”میں کل والی بات کا ذکر کررہی ہوں، میرا اتنا خیال کرنے کا شکریہ۔“ فائز کے چہرے پر سایہ سا لہرایا...... اس نے سر جھکایا۔ اٹھانے کی ہمت نہیں

ساتواں بھائی

عوام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک غریب اور دوسرے وہ جو امیر نہیں ہوتے۔ غریب، امیروں کی ملکیت ہوتے ہیں کیونکہ انہیں خدا نے نہیں، امیروں نے بنایا ہوتا ہے۔ اسکول میں ایک بار ٹیچر نے ہم سے پوچھا۔ ”رابن ہڈ صرف امیروں کو ہی کیوں لوٹتا تھا؟“ تو ہم نے کہا۔ ”غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے وہ لوٹتا۔“ غریبوں کے قدرتی وسائل اور مسائل بچے ہی ہوتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں ڈبلیو ایچ او کے ایک عہدیدار نے ایک شخص سے پوچھا۔ ”آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے؟“ کہا۔ ”ایف ایس سی۔“ بیٹے سے پوچھا اس نے کہا۔ ”بی ایس سی۔“ ماں سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”ایم ایس سی۔“ وہ خوش ہوا کہ یہاں خواندگی کی شرح اتنی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ اس سے مراد تھا...... فادر آف سیون چلڈرن، برادر آف سیون چلڈرن اور مدر آف سیون چلڈرن۔ سات بھائیوں والے ایک امریکی مزاح نگار کا واقعہ ہے۔ ایک صحافی نے کہا۔ ”وہ صاحب کہتے ہیں تو ان کا سگا بھائی ہے، تم کہتے ہو تمہارا اس کا دور کا رشتہ ہے؟“ کہا۔ ”ہاں دور کا رشتہ ہے کیونکہ یہ میرا ساتواں بھائی ہے۔“

اقتباس: از مزاحیات

تحریر: ڈاکٹر یونس بٹ

انتخاب: نفیسہ آرا، یو اے ای

ہوئی، وہ مسکرا بھی نہیں سکا۔

"پتا نہیں، شاید میں نے آپ کا لنچ خراب کردیا۔" اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"نہیں بلکہ مجھے اچھا لگا۔" پارس نے گہری سانس لی۔ "بہت سارے دشمنوں کے درمیان اگر کوئی ایک خیال رکھنے والا ہو تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

فائز نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں تکلیف تھی، وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ "مگر آپ کے اتنے دشمن کیوں ہوں گے؟"

"جن کو لگتا ہے میں نے ان سے کچھ چھینا ہے، وہ اس سب کو واپس لینے کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں وہ ہر حد تک جائیں گے۔" وہ سوگواریت سے مسکرائی۔

"کیا آپ نے واقعی ان سے کچھ چھینا ہے؟" پارس نے فائز کا چہرہ دیکھا...... اس کے چہرے پر سوال تھے۔ اس نے جواب دینے کے لیے لب کھولنے چاہے مگر لمحے بھر میں سب کچھ دھندلا گیا۔ وقت کا رولر کوسٹر ایک دفعہ پھر اسے پیچھے لے جانے لگا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں، سر؟" اس نے دھیرے سے ادھ کھلا دروازہ بجایا...... دوسری طرف رخ کیے کھڑے رضوان حیات جو بک شیلف سے کچھ نکال رہے تھے، چونک کر پلٹے، اسے دیکھ کر لمحے بھر کو چپ سے رہ گئے پھر خاموشی سے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

پارس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آئی۔ بیٹھی نہیں، ان کے مقابل جا کھڑی ہوئی اور آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔ رضوان خاموشی سے منتظر رہے۔

"کل آپ نے جو کچھ کہا، وہ...... وہ کیوں کہا؟"

"میں معذرت کر چکا ہوں، مجھے واقعی ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں سر، آپ کو واقعی میرے ساتھ اس قسم کا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس کے چہرے پر دکھ تھا، احساسِ توہین تھا۔

"پچھلے کچھ دنوں سے صبح واک پہ میں نے آپ کو بہت سی باتیں بتائیں، اپنی امی کی، بھائی کی، ان کی بے حسی کی، آپ نے بھی بتائیں، اپنی بہن اور بھائی کی بے حسی کی......"

"میرا بھائی بے حس نہیں ہے، وہ مجھ سے واقعی بہت محبت کرتا ہے۔" انہوں نے بے اختیار دھیرے سے ٹوکا مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

"مگر سر...... اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ مجھ سے یوں مذاق کرتے......؟"

"مگر میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔" رضوان کے چہرے پر حیرت ابھری۔

"آف کورس آپ مذاق کر رہے تھے، میں جانتی ہوں۔" پارس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"میں اس طرح کا مذاق کرنے والا آدمی لگتا ہوں آپ کو؟ اگر آپ واقعی مجھے پندرہ بیس سال پہلے ملی ہوتیں تو میں آپ کو پروپوز کرتا، اب بھی کرنا چاہتا تھا مگر یہ بات آپ کو ہرٹ کرے گی، اسی لیے......" انہوں نے سر جھٹکا جیسے مزید اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔

"کیوں؟ آپ کو تو ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں آپ کے سامنے۔" پارس حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، آپ کے سامنے شاید میں کچھ نہیں ہوں، آپ جوان ہیں، خوب صورت ہیں، مجھ جیسے بوڑھے سے۔" انہوں نے پھر سر جھٹکا۔

"آپ مجھے خود سے بہتر سمجھتے ہیں؟" وہ دم بخود تھی۔

"بالکل......" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر میں آپ کو پروپوز نہیں کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ کسی اور کا انتظار کر رہی ہیں۔" آج

اس بات پر اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں اترا۔

"مجھے کسی کا انتظار نہیں ہے۔"

"کیا آپ نے اس پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے؟" وہ جانچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں، میں نے کبھی اس پر اعتبار کیا ہی نہیں تھا۔" وہ خاموشی سے جا کر کرسی پر بیٹھ گئی اور سر جھکا دیا۔ رضوان اسی طرح کھڑے رہے۔

"وہ میرے چچا کا بیٹا ہے، شجاع...... بچپن ہمارا ساتھ گزرا، وہ ہمسائے میں رہتا تھا۔ جب میں چھوٹی تھی اور ابا زندہ تھا تو چاچی کے منہ سے سنتی تھی کہ شجاع میرا منگیتر ہے۔ بچپن سے یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ میری شادی اسی سے ہونی ہے پھر ابا مر گیا۔ تب بھی چاچی اس بات کو دُہراتی رہتی تھی۔ امی کو یہ رشتہ پسند نہ تھا، وہ شجاع کو گھر میں نہیں داخل ہونے دیتی تھی، مجھے بھی ڈانٹتی تھی۔" وہ جو ایک سانس میں بولتی جا رہی تھی، ذرا دیر کو رکی۔

"مجھے وہ برا نہیں لگتا تھا مگر میں اس سے بچ جاتی تھی، اس سے دور رہتی اور پھر وہ واقعی دور چلا گیا۔ انگلینڈ جانے سے پہلے اس نے بہت سے وعدے کیے تھے مگر ہر وعدہ میری رسوائی بن گیا۔ خط، فون...... امی نے ہر چیز پر پابندی لگا دی۔ میں نے پھر بھی انتظار نہیں چھوڑا۔ اس کے گھر والوں نے مکان بدل لیا، ہم سے رابطہ ختم کردیا، میں پھر بھی انتظار کرتی رہی، ہم مری آگئے، میں اِدھر نوکری کرنے لگی، اتنے سال گزر گئے، وہ مڑ کر نہیں آیا، مجھے پھر بھی انتظار رہا اور کل جب آپ نے وہ سب کہا تو...... تو میں نے اس کی خالہ کو فون کیا......" اس نے پہلی دفعہ نگاہیں اٹھائیں، اس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ "میں نے اس کی خالہ سے اس کا انگلینڈ کا نمبر لیا اور اسے فون کیا۔ اگر وہ منگنی ہی تھی تو مجھے اس سے آزادی چاہیے تھی یا اس کی مضبوطی چاہیے تھی۔ مجھے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے اسے فون کیا۔"

آفس میں چند ثانیے کو بالکل خاموشی چھا گئی، رضوان مکمل توجہ اور دھیان سے اسے سن رہے تھے۔

"اس نے فون اٹھایا، ہیلو، بولا اور...... اور پوچھا کون بات کر رہا ہے، میں نے کہا پارو...... اس نے کہا کون پارو......؟ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی مگر میں تو کبھی نیند میں بھی نہیں بھولی کہ کون شجاع پھر وہ کیسے بھول گیا کہ کون پارو...... مجھے میرا جواب مل گیا تھا، میں نے فون بند کردیا...... مجھے اب اس آدمی کو یاد بھی نہیں رکھنا۔" ایک آنسو ٹوٹا اور گال پر لڑھک گیا۔ پارس نے ہتھیلی کی پشت سے اسے صاف کیا، دوسرا آنسو نہیں گرا...... ایک قطرے کی بارش......

"کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟" وہ بولے تو بس یہی۔

"آپ مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے بھیگی نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

"کیونکہ میں آپ کے ساتھ خوش رہوں گا، کیا آپ کو لگتا ہے آپ میرے ساتھ خوش رہیں گی؟" وہ پُراعتماد تھے، مضبوط تھے، اٹل تھے اور بہادر بھی۔

"مجھے نہیں پتا، آپ...... میری امی......"

"اپنی بات کریں، پارس، آپ میرے ساتھ رہنا چاہیں گی؟"

"مجھے بس اتنا پتا ہے کہ مجھے آپ کا میرا یوں نام لینا اچھا لگتا ہے۔" پارس ہلکا سا مسکرائی...... وہ پہلی دفعہ مسکرائے...... مہربان مسکراہٹ۔

"کیا آپ نے واقعی کچھ چھینا میم؟" بعض آوازیں ہمیں کسی یاد میں دھکا دے دیتی ہیں تو بعض ہاتھ پکڑ کر کسی یاد سے کھینچ نکالتی ہیں...... وہ فائز کی آواز پر چونک کر واپس آئی۔

"نہیں۔" اس نے تکان سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جیسے بہت دور سے واپس آئی تھی۔

"تو پھر انہیں کیوں لگتا ہے کہ آپ نے ان

سے کچھ چھینا؟''

''کیونکہ وہ خود بے حس، لالچی اور خود غرض لوگ ہیں۔'' وہ بولی تو اس کی آنکھوں میں نفرت ابھرنے لگی تھی۔ فیضان کے جبڑے کی رگیں تن گئیں، لب بھینچ گئے۔

''تم بزدل ہو، اگر تم اپنے باپ جیسے بھائی کے قتل کا بدلہ نہ لے سکے تو اپنے مرد ہونے پر لعنت کرنا۔''

''کیا آپ رضوان صاحب کے رشتے داروں کی بات کررہی ہیں؟'' بولتے ہوئے اس نے آہستہ سے میز پر رکھے پیپر نائف پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ ''میں پرسنل نہیں ہونا چاہتا مگر اس دن آپ نے مجھے جانے سے روکا تھا...... کیا وہ لوگ...... کیا رضوان صاحب بھی اتنی ہی نفرت کرتے تھے۔ فیضان صاحب سے جتنی آپ کرتی ہیں؟'' اس نے پیپر نائف اپنی انگلیوں کے بیچ گھماتے ہوئے پوچھا۔ پارس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ اتر آئی۔

''وہ دل کے بہت سچے انسان تھے فائز...... وہ ساری دنیا کو غلط کہہ سکتے تھے، اپنے بھائی کو نہیں...... سویرا سے بھی انہیں شکایات تھیں مگر فیضان میں ان کی جان تھی، وہ اسے غلط مان ہی نہیں سکتے تھے۔'' وہ افسوس سے کہہ رہی تھی۔ ''وہ لڑکا ساری عمر اُن سے صرف بٹورتا رہا، اُن کو جلی کٹی سنا کر چلا جاتا، وہ دل مسوس کررہ جاتے، اس کی باتوں پہ کئی دن تک اداس رہتے، ہرٹ ہوتے، وہ صرف اُن کے پیسے سے محبت کرتا تھا مگر وہ نہیں مانے...... آسمان سے فرشتے اتر کر بھی کہتے کہ فیضی لالچی، خود غرض... اور بے حس ہے تو وہ کہتے، وہ لالچی اور خود غرض ہوسکتا ہے وہ مگر بے حس نہیں ہے، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔'' اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔

پیپر نائف پہ اس کی گرفت مضبوط ہوگئی...... آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی، تنی ہوئی رگیں مزید تن گئیں۔ پارس اپنے قلم کو انگلیوں میں گھماتی، اپنے دھیان میں بولے جارہی تھی، فیضان کا ضبط بس ختم ہونے کے قریب تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے، فیضان صاحب کس قسم کے انسان ہیں؟''

''گھٹیا اور بے حس...... جسے اپنے مفادات کے آگے کچھ عزیز نہیں...... دولت کے پیچھے وہ کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔ چاہے وہ اس کا اپنا بھائی ہو یا میں۔''

پیپر نائف کو پکڑے فیضی کے ہاتھوں میں پسینہ آگیا...... اس نے دھیرے سے نائف چھوڑ دیا...... وہ بنا آواز واپس میز پر گرگئی۔ وہ تنی ہوئی رگوں سے پارس کو دیکھتے ہوئے گہری سانس لے رہا تھا۔

''آپ نے کہا کہ اس رات فیضان صاحب مری میں تھے جبکہ مسز سویرا اس بات کی نفی کررہی تھیں۔ میم، آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ اس رات وہیں تھے؟''

''کیونکہ اس رات میں نے خود اسے یہاں دیکھا تھا...... وہ یہیں تھا اور آج جو کچھ بھی ہوا ہے۔ اس کا ذمے دار وہی ہے۔'' پارس نے قلم گھمانا روک کر فائز کو سنجیدگی سے دیکھا اور بولی۔

فائز کی سانس رک گئی، وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا...... کون کس کے ساتھ کھیل رہا تھا، سمجھنا مشکل تھا۔

''کیا آپ اُن سے مل چکی ہیں پہلے؟ میرا خیال تھا آپ فیضان صاحب سے پہلے کبھی نہیں ملیں۔''

''کسی اور موضوع پر بات کریں فائز، میں اس آدمی کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے اکتاہٹ سے سر جھٹکتے ہوئے فائل کھول لی۔ فیضان اسی طرح اسے دیکھتا رہا اس کی رنگت ہر رنگ کھو کر سفیدی سی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

تنویر صاحب نے کافی کا گھونٹ بھر کر کپ واپس میز پر رکھا پھر ایک نظر سامنے بیٹھے فیضان اور سویرا پر ڈالی۔

''آپ نے کہا تھا کہ آپ جلد قانونی کارروائی کریں گے تو کیا بنا اس کا؟'' سویرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر فیضان پہلے بول پڑا۔

''ہم کوئی قانونی کارروائی نہیں کریں گے۔''

سویرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''فیضی تم نے ہی تو کہا تھا کہ ایف آئی آر اور لاش کا پوسٹ مارٹم......'' انہوں نے اسے ٹہوکا دینا چاہا۔

''میں نے کہا ناں ہم کوئی قانونی کارروائی نہیں کریں گے۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے طور پر ثبوت ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا اور جو بھی قاتل ثابت ہوا اُسے ہم پولیس کے حوالے کردیں گے۔''

''جو بھی......؟'' سویرا نے دبے دبے غصے سے دُہرایا۔ ''قاتل پارس ہے۔''

''نہیں، اس نے قتل نہیں کیا......'' وہ سپاٹ انداز میں کہتا سامنے تنویر صاحب کو دیکھ رہا تھا جو خاموشی سے دونوں کی جھڑپ سن رہے تھے۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم یہاں پارس کے خلاف ثبوت ڈھونڈنے آئے تھے اور اب تم اسی کے وکیل بن رہے ہو۔''

''میں نے کہا ناں پارس نے قتل نہیں کیا۔'' فیضان کی آواز اونچی ہوئی، سویرا آپا ذرا خائف ہوئیں۔

''تو پھر کس نے کیا ہے؟'' وہ خاموش رہا...... تنویر صاحب نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''سویرا کا سوال درست ہے فیضی، پارس کے علاوہ کون ہے ایسا جس کے پاس رضوان بھائی کو قتل کرنے کا کوئی معقول motive ہو؟''

''motive تو ہم تینوں کے پاس بھی ہے، بھائی جی کی موت سے ہم تینوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو کیا ہم میں سے بھی کوئی قاتل ہے؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔ سویرا اور تنویر صاحب کو سانپ سونگھ گیا۔

''کیا تم اس لیے قانونی کارروائی روکنا چاہتے ہو کہ قاتل ہم میں موجود ہے؟'' تنویر صاحب نے احتیاط سے پوچھا۔

''نہیں بلکہ ہم چاروں میں سے کسی نے قتل نہیں کیا، قاتل کوئی اور ہے اور ہمیں اس کو ڈھونڈنا ہے، ہر حال میں۔'' اس کا لہجہ اٹل تھا۔

تبھی لان میں کوئی آتا دکھائی دیا...... آہٹ پر سب نے اس جانب دیکھا افضل بابا ڈھیلی چال چلتے چلے آرہے تھے۔

''کہیے، بابا، خیریت؟'' سویرا نے تیکھی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... تنویر صاحب، مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔'' وہ ان دونوں کو دیکھ کر ہچکچائے...... یہ تنویر صاحب کا گھر تھا اور وہ قطعاً وہاں سویرا اور فیضان کی توقع نہیں کررہے تھے۔

''تو ہمارے سامنے کرلیں بات، ہم بھی تو جانیں، ایسا کیا ہے جو اتنا اہم ہے؟'' سویرا تنک کر بولیں۔ فیضی کا سارا غصہ بابا پر نکلنے کو بے تاب تھا۔

''جی جی افضل بابا، آپ بتائیں۔'' تنویر صاحب فوراً اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔

''وہ جی...... اس روز جب پارس بی بی واک پر گئیں تو......'' پارس کے نام پر فیضان آگے کو ہوا اس کے اعصاب تن گئے۔ سویرا نے بغور اس کا یہ انداز دیکھا۔

''تو ان کے بھائی اور والدہ ان کے لاکر میں چوری کا منصوبہ بنارہے تھے، میں نے انہیں اُدھر آتے جاتے دیکھا تو پارس بی بی کو فون کردیا۔ وہ آئیں اور ان کو اپنے کمرے سے نکال دیا...... پھر...... بی بی نے مجھے کہا کہ میں ان پر نظر رکھوں......

میں فوراً ان کے پیچھے گیا تو وہ دونوں شکیل بابو کے کمرے میں تھے اور غصے اور عجلت میں وہ دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ میں نے ان کی باتیں سنیں، وہ......وہ دونوں پارس بی بی کو قتل کر کے ساری دولت ہتھیانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔"

افضل بابا روانی سے بتاتے چلے گئے......سویرا کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری، فاتحانہ مسکراہٹ......اور انہوں نے فوراً فیضی کو دیکھا جو حق دق سا سن رہا تھا۔

"مگر......وہ کیوں اسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟" وہ بدقت کہہ پایا۔

"بات صاف ہے پارس کے مرنے کے بعد اس کی ساری جائداد اس کی ماں اور بھائی کو چلی جائے گی۔" تنویر صاحب نے جیسے تبصرہ کیا البتہ وہ کوئی خاص فکر مند نہیں نظر آ رہے تھے۔ فیضان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"مگر......اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟" وہ واقعتاً پریشان ہو گیا تھا۔

"یہ پارس کا ذاتی مسئلہ ہے، افضل بابا، آپ اس کی خبر اپنی بی بی کو دیں۔ تنویر صاحب کو کیوں دے رہے ہیں؟" سویرا آپا جانے کیوں مسرور و مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

"میں نے بی بی کو یہ بات نہیں بتائی، میں نے بی بی کو یہ بھی نہیں بتایا کہ فیضان بابو، فائز صاحب ہیں' میں بی بی سے پہلے......" انہوں نے تنویر صاحب کو دیکھا......"ہر بات تنویر صاحب کو بتاتا ہوں کیونکہ بڑے صاحب ان پر بھروسا کرتے تھے۔"

"ٹھیک ہے بابا، آپ جائیں، ہم مسئلہ حل کر لیں گے۔" تنویر صاحب نے جیسے انہیں وہاں سے ٹالنا چاہا، وہ خاموشی سے غمزدہ سے واپس پلٹ گئے۔

فیضان مضطرب سا جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، وہ جیسے بے بس تھا، دل و دماغ کے بیچ چھڑی جنگ میں پس سا گیا تھا مگر خاموش رہنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

ڈائننگ ہال میں نیم روشنی سی بکھری تھی، کمرے کی صرف ایک زرد بتی روشن تھی البتہ میز پر رکھے کینڈل اسٹینڈ کی دو...... لمبی لمبی موم بتیاں جل رہی تھیں۔ فیروزہ مائی نے ڈونگا شکیل کی طرف بڑھایا، جس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا، وہ پہلے ہی سیخ کباب سے پلیٹ بھر چکا تھا۔ فیروزہ نے ڈونگا واپس رکھ دیا، میز پر وہ دونوں ہی تھے۔

"پھر......کیا سوچا تو نے؟" وہ دھیرے سے گویا ہوئی......ساتھ ہی پلیٹ میں شوربہ نکالا۔

"موقع دیکھ کر پارو کو اس کے شوہر کے پاس پہنچانا ہے، اس کالا کرا اپنے قبضے میں کرنا ہے، کسی نہ کسی طرح تو وہ کھل ہی جائے گا اور پھر قانونی کارروائی کر کے سارے ہوٹلز ہتھیانے ہیں۔" وہ دانتوں سے کباب کاٹتا بول رہا تھا۔

"تجھے لگتا ہے اتنی آسانی سے وہ بڈھے کی بہن ہمیں سب ہتھیانے دے گی؟ وہ اسی دولت کے پیچھے تو آئی ہے۔" فیروزہ مائی کے چہرے پہ تنی لکیریں موم بتی کے ٹمٹماتے شعلے میں مزید گہری لگ رہی تھیں......وہ فکر مند تھی، غیر مطمئن بھی......

"دیکھ امی، بڈھے کے پاس بہت مال تھا، صرف حق مہر میں اس نے پورا ہوٹل لکھ دیا، منہ دکھائی میں یہ گھر دے دیا، اب دولت کے اس صحرا میں سے ہم مٹھی بھر لیں، تب بھی اگلے بیس سال اچھے گزر جائیں گے۔"

اس کے انداز پر بے اختیار فیروزہ مائی نے اطراف پہ نگاہ ڈالی، سجا سجایا خوب صورت گھر، فانوس، انگیٹھیوں کے کارنس پر رکھے قیمتی ڈیکوریشن پیسز، مخملیں پردے، چمکتے فرش لمحے بھر کو ان مادی

چیزوں کی چکا چوند نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں، جب یہ چمکتی ہوئی روشنی کی بارش مدھم ہوئی تو ایک نیا منظر دکھائی دینے لگا۔

چھوٹے سے لونگ روم کی ساری بتیاں روشن تھیں، آتش دان میں لگا ہیٹر بھی سرخ دہک رہا تھا۔ کمرے میں موجود تینوں نفوس خاموش تھے، پارس لب کاٹتی چپ بیٹھی تھی، رضوان حیات کی خاموشی تمہید کے مترادف تھی اور فیروزہ مائی کی خاموشی میں کنفیوژن تھا۔

"بڑے صاحب، ایسی کیا بات تھی جو آپ خود چل کر آئے؟ مطلب......ہمیں بلا لیا ہوتا۔" اس نے گفتگو کا آغاز کرنے کی سعی کی......چہرے پر پریشانی تھی، پارس اس کی وجہ سمجھ رہی تھی مگر خاموش رہی۔

"بات اہم تھی، مجھے خود آنا چاہیے تھا۔" وہ نرمی سے گویا ہوئے، سوٹ میں ملبوس، گریس فل شخصیت اور چند روز قبل کا احسان، فیروزہ مائی سخت مرعوب ہو چکی تھی۔

"کیا وہ قرضہ ہمیں جلد واپس کرنا ہوگا؟" اس نے خود سے پوچھ لیا، اب مزید صبر نہیں ہو رہا تھا، پریشانی حلق تک پہنچ چکی تھی۔

"ارے نہیں، اس کی آپ فکر نہ کریں، مجھے پارس کے حوالے سے بات کرنی تھی۔" پارس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی وہ دل سے راضی تھی یا نہیں، اسے ان کا یوں اپنا نام پکارنا بہت اچھا لگتا تھا۔

"جی......بتائیں، کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا اس سے؟"

"دیکھیں مسز فیروزہ، میں لمبی بات نہیں کیا کرتا......میری درخواست صاف اور واضح ہے، میں پارس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، پارس کو کوئی اعتراض نہیں......کیا آپ اس... بات کی اجازت دیں گی؟"

فیروزہ مائی کے لب آدھے کھل گئے، پہلے تو وہ

مردوں کا زیور پہننا

حضرت عمرانؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کے بازو میں پیتل (یا تانبے) کا ایک کڑا دیکھا تو نبی کریم ﷺ نے (اس سے) فرمایا۔ "ارے بھئی یہ کیا ہے؟"

اس نے بتایا یہ ایک بیماری کی وجہ سے پہن رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس سے تمہاری کمزوری (بیماری) میں مزید اضافہ ہی ہوگا اسے اتار پھینکو اگر تم اس حال میں مر گئے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں ہو تو تم کبھی کامیاب نہیں ہو گے۔

مسند احمد بن حنبل

مرسلہ: تسنیم ماہ پارہ، کراچی

قابلِ غور

ایک نوجوان عورت نے ایک ماہرِ نفسیات کے پاس جا کر شکایت کی کہ وہ چھ بچوں کی ماں بن چکی ہے لیکن اب بھی اس کا شوہر اس سے محبت نہیں کرتا۔ یہ سن کر ماہرِ نفسیات نے جواب دیا۔ "شکر کرو کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا ذرا سوچو اگر وہ تم سے محبت کرتا تو تمہارے بچوں کی تعداد کیا ہوتی؟"

انعام

ایک نوبیاہتا دلہن نے اپنے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا شوہر کو کھلاتے ہوئے پوچھا۔ "اگر میں آپ کو اسی طرح کھانا کھلاتی رہی تو بتائیں مجھے کیا انعام ملے گا؟"

"میرے انشورنس کے پچاس ہزار روپے۔" شوہر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

ہکا بکا رہ گئی پھر یہ بے یقینی مدھم ہوئی، دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو اس نے پارس کو دیکھا۔ وہ پورے اعتماد سے اسے دیکھ رہی تھی، البتہ اب بھی اس اعتماد میں واضح کمزوری تھی، کچھ دن سے بدلی بدلی لگ رہی تھی مگر اب بھی وہ ماں سے ڈرتی تھی، فیروزہ مائی نے واپس رضوان صاحب کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... مجھے کوئی اعتراض نہیں...... یہ تو خوشی کی بات ہے......'' وہ پریشانی اور خوشی سے مسکرائی۔ ''مگر...... آپ کو پارس میں......''

''وہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے مگر انداز میں قطعیت تھی جیسے وہ کسی کو اس پر تبصرہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، فیروزہ مائی فوراً پیچھے ہٹی۔

''جی...... وہ تو ٹھیک ہے مگر...... آپ کے خاندان والے؟''

''مجھے کسی کی اجازت نہیں چاہیے، میں کچھ عرصے بعد اس شادی کو اوپن کروں گا، خاندان والوں کو ابھی نہیں بتایا۔'' انہوں نے اور کچھ والے انداز میں اسے دیکھا۔

''مگر...... اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد پارس کو چھوڑ کر نہیں چلے جائیں گے؟'' فیروزہ مائی کا اعتماد واپس آرہا تھا، پارس نے برہمی سے اسے دیکھا مگر وہ دونوں اس کی طرف متوجہ نہ تھے۔

''آپ کو کس قسم کی گارنٹی چاہیے؟''

''آپ پارس کے نام کچھ کردیں، کوئی پلاٹ، مکان، کچھ بھی، جس سے ہمیں پتا چلے کہ آپ......''

''میں مری والا ہوٹل حق مہر میں پارس کے نام لکھ رہا ہوں، ٹھیک؟'' انہوں نے سوالیہ ابرو اٹھائی، فیروزہ مائی کا منہ کھلا سو کھلا، پارس بھی سناٹے میں رہ گئی۔

''سر......'' اس نے ان کو روکنا چاہا مگر ان کی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

''اس کے علاوہ میں نے ہوٹل کے قریب ایک بنگلا بھی پارس کے لیے خریدا ہے۔''

''تو پھر شادی کے بعد میں بھی وہیں رہوں گی۔'' فیروزہ مائی تیزی سے بولی۔

''مجھے اعتراض نہیں ہے، البتہ ایک بات میں واضح کردوں، یہ میری طرف سے پہلا اور آخری فیور ہوگا جو آپ کو ملے گا، ہوٹل، بنگلا، میں سب کچھ پارس کے نام کروں گا اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے مزید کوئی ڈیمانڈ نہیں کریں گی۔''

اور فیروزہ مائی کو اب لگا کہ وہ دنیا کی سب سے بے وقوف عورت ہے، اسے خوشی اور جوش میں ''ہاں'' کرنے کے بجائے پہلے اپنی ڈیمانڈ سامنے رکھنی چاہیے تھیں۔ پھر گارنٹی مانگتی، پھر ہاں کرتی مگر اس نے ترتیب الٹ دی اور اب اس کی قسمت الٹ گئی تھی، پارس مالکن تھی اور وہ ایک ہاؤس کیپر، کل کو پارس اس کو گھر سے نکال دیتی تو اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

''امی...... سن نہیں رہی؟'' شکیل نے اس کی کہنی ہلائی تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔

''ہاں، کیا......؟''

''سنا نہیں؟'' شکیل نے معنی خیز انداز میں سامنے کھڑی ملازمہ کی جانب اشارہ کیا جو کوئی پیغام لے کر آئی تھی۔ فیروزہ مائی نے الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''سویرا صاحبہ آئی ہیں، ہم سے ملنے۔'' وہ کرسی دھکیل کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ فیروزہ مائی چونک کر ساتھ ہی اٹھی۔

لان میں ایک کرسی پر سویرا براجمان تنقیدی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں، ان کو آتے دیکھ کر نخوت سے مسکرائیں، اٹھی نہیں۔

''جی میڈم، ہم سے کیا کام آگیا آپ کو؟'' شکیل نے ڈھیلے ڈھالے مگر خوشگوار انداز میں بیٹھتے ہوئے کرسی سنبھالی۔ سویرا کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''مجھے علم ہوا ہے کہ تم دونوں پارس کو قتل کر کے اس کی جائداد ہتھیانے کا سوچ رہے ہو؟''

شکیل کی مسکراہٹ اڑنچھو ہوئی، اس نے بے اختیار ماں کو دیکھا، جس کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

''دیکھو انکار مت کرنا کیونکہ میں سب جانتی ہوں اور ابھی میں نے اس بات کا پارس کو نہیں علم ہونے دیا مگر جلد یا بدیر مجھے اس کو خبر تو کرنی ہوگی۔'' شکیل نے بے اختیار تھوک نگلا پھر چہرے پر سختی لا کر بولا۔

''دیکھیں میڈم جی، آپ کو کوئی غلط فہمی......''

''میں نے کہا...... انکار مت کرنا۔'' وہ ایک دم آگے ہو کر شعلہ بار انداز میں بولیں تو شکیل کی زبان بند ہوگئی، سویرا نے گہری سانس لی، مسکرائیں اور واپس پیچھے ہوئیں۔

''مسئلہ یہ ہے کہ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں، اس لیے تمہیں ایک بات واضح کرنے آئی ہوں، پارس کے نام موجود ساری جائداد بہت جلد ہمارے نام ہوجائے گی، تم لوگ ویسے ہی اس کے سوتیلے رشتے دار ہو اور شکیل، تمہارا تو اس سے خون کا رشتہ تک نہیں، تم لوگوں کے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا۔''

''تو پھر آپ ہمارے پاس کیوں آئی ہیں؟'' شکیل آنکھیں سکیڑ کر انہیں بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ سویرا کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''کیونکہ پارس میری اور تمہاری مشترکہ دشمن ہے اور جب دشمن ایک ہو تو ہمیں بھی ایک ہوجانا چاہیے۔''

''مطلب؟'' فیروزہ اور شکیل نے الجھے ہوئے انداز میں سویرا کو دیکھا۔

''میں تمہیں دو کروڑ دوں گی، تم پارس کو قتل کرو مگر ایسے کہ وہ ایک ایکسیڈنٹ لگے...... اگر تم انکار کرو گے تو میں پارس کو تمہاری اصلیت بتادوں گی اور اگر تم اپنے طور پر اسے قتل کرو گے، تب بھی ساری جائداد میرے پاس آئے گی، تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھ سے پیسے لے لو، بدلے میں، میں تمہاری مدد کروں گی اور تمہیں protect بھی کروں گی۔''

''اور اگر میں یہ سب، آپ کا آنا اور آپ کی آفر، پارس کو بتادوں، تو؟'' اس کی بات پہ سویرا نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش میں تم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، وہ آل ریڈی جانتی ہے کہ میں اس کی دشمن ہوں، اس لیے اسے شاک نہیں لگے گا، البتہ تم لوگ اس کے رشتے دار ہو، آگے تم خود سوچ سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، مگر میں تین کروڑ لوں گا۔'' شکیل جبراً مسکرایا گو کہ اندر باہر طوفان سا مچا تھا۔

''دو کروڑ، اور بس...... میں سودے بازی کرنے نہیں آئی، منظور ہے تو بتاؤ ورنہ میں اسے پیسے دیے بغیر کسی سے بھی ختم کرواسکتی ہوں۔'' وہ تیز نگاہوں سے اسے گھور کر بولتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ شکیل جلدی سے ساتھ کھڑا ہوا۔ فیروزہ مائی تو اب تک بیٹھی ہی نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے مگر یہ کام کب کرنا ہے؟'' سویرا کی تیز نگاہیں پھر سے میٹھی مسکراہٹ میں بدل گئیں۔

''تین دن بعد ہوٹل میں ایک پارٹی ہے، اس ہوٹل کی بارہویں سالگرہ، اس رات تمہیں پارس کو قتل کرنے کے بہت سے مواقع ملیں گے اور جیسا کہ میں نے کہا، میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔'' شکیل پہلی دفعہ مطمئن انداز میں مسکرایا۔

''بس تین دن......'' اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

☆☆☆

''میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں احسان صاحب کہ آپ بطور خاص اتنے شارٹ نوٹس پر آئے۔'' کاریڈور کے سرے پر پارس بہت تشکر سے مسکراتی ساتھ کھڑے صاحب سے کہہ رہی تھی،

شال کندھوں کے گرد، پرس کہنی پہ، سیدھے بال اور خوب صورت مسکراہٹ، احسان صاحب پہ اس کے رعب میں مزید اضافہ ہوا، انہوں نے سر کو خم دے کر جیسے شکریہ قبول کیا۔

''مسز رضوان، یہ میرا فرض تھا، میں آپ کے کسی کام آؤں، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے میرے لیے؟ رضوان صاحب کے بہت احسان ہیں مجھ پر۔''

''بہت اچھا لگتا ہے جب ایک شخص کی آپ ہر ایک سے تعریف سنیں اور وہ آپ کا بہت اپنا بھی ہو، اسی لیے میں ہر سال کی طرح اس پارٹی کو ویسے ہی ارینج کرنا چاہتی ہوں جیسا کہ ان کے وقت ہوا کرتی تھی، مجھے یہ چیز بہت خوشی دے گی۔'' پارس نرمی سے مسکرائی۔

''آپ بے فکر رہیں...... میری ٹیم ہر ممکن کوشش کرے گی کہ آپ کی توقعات پر پوری اترے...... ویسے کوئی خاص تھیم ہے آپ کی نظروں میں؟'' وہ دونوں کاریڈور کے سرے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے جہاں کاریڈور ختم ہوتا، وہاں شیشے کا دروازہ تھا اس کے پار چند آفس کیبن بنے نظر آرہے تھے، وہاں چہل پہل جاری تھی، مصروفیت اپنے عروج پر تھی۔

''نہیں، میں اتنی کریٹو... ہوتی تو آپ کو کیوں بلواتی؟'' وہ جھینپ کر مسکرائی۔ ''بس میں چاہتی ہوں کہ آپ ہر چیز پچھلی دفعہ کی طرح ارینج کریں۔''

''مگر میرا یہ مشورہ ہوگا کہ ہم پچھلی دفعہ سے بڑھ کر سب کچھ کریں، انسان کو امپروومنٹ کی گنجائش ہمیشہ رکھنی چاہیے۔'' احسان صاحب بہت خوش نظر آرہے تھے، اسی خوشگوار موڈ میں انہوں نے یونہی دائیں طرف دیکھا؟ جہاں شیشے کے دروازے کے پار کیبن تھے اور ستائش سے مسکرائے۔

''مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ فیضان صاحب آپ کے ساتھ بہت کوآپریٹ کر رہے ہیں اور ہوٹل کے لیے مل کر کام کر رہے ہیں، ویسے کب آئے وہ مری؟''

پارس کی مسکراہٹ معدوم ہوئی، آنکھیں اچنبھے سے سکڑیں، اس نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا، جہاں ایک کیبن کے باہر ہاتھ میں فائل پکڑے فائز فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

''جی......؟'' پارس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے احسان صاحب کو دیکھا۔

''وہ فیضان صاحب ہیں ناں، رضوان صاحب کے بھائی، ان کی بات کر رہا ہوں، وہ گرے کوٹ میں، ابھی آتے ہوئے انہیں دیکھا، مصروف نظر آرہے تھے، مل نہیں سکا، واپسی پر مل لوں گا، مجھے پتا تو چلا تھا کہ وہ لاہور آئے تھے پچھلے ماہ مگر یہ نہیں علم تھا کہ وہ آپ کے ساتھ ادھر کام کر رہے ہیں۔''

پارس بالکل ٹھہری ہوئی کبھی اُن کو دیکھتی، کبھی دور فون پر مصروف نظر آتے فائز کو۔

''وہ ...... گرے کوٹ والے جو فون پر بات کر رہے ہیں؟'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔ ''آر یو شیور وہ رضوان کا بھائی ہے؟''

''جی! بالکل......'' وہ حیران ہوئے۔ ''اتنے سالوں سے دیکھ رہا ہوں ان کو، کیوں نہیں پہچانوں گا۔''

پارس نے دور نظر آتے فائز...کو دیکھا، فیضان حیات...... فائز حسن؟ اس کے چہرے پر سختی در آئی، آنکھوں میں انگارے دہکنے لگے، لب بھینچ گئے، اتنے زور سے کہ گردن کی رگیں ابھرنے لگیں۔

''تو یہ ہے فیضان......!'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

سویرا، فیضان اور شکیل...... پارس کے دشمنوں کی نئی اس مثلث کا کون سا کونا بودا ثابت ہوا......؟ رضوان حیات کے قتل کا معما کیسے حل ہوا...... یہ سب جاننے کے لیے پڑھیں آخری حصہ اگلے ماہ۔



مکمل ناول



پارس

نمرہ احمد

آخری حصہ



''کیا آپ کو نہیں معلوم یہ فیضان صاحب ہیں؟'' احسان صاحب اپنی حیرت کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکے۔ پارس بدقت مسکرا پائی۔

''اگر مجھے نہیں معلوم تو اس کا واضح مطلب ہے کہ فیضان صاحب مجھے نہیں بتانا چاہتے۔ اس لیے میری آپ سے ایک درخواست ہے اگر وہ نہیں خود کو ظاہر کرنا چاہتے تو آپ ان کو نہیں بتائیں گے اس گفتگو کے بارے میں۔''

''مگر...... وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ دق دق تھے۔

''وجہ وہ خود بہتر جانتے ہوں گے مگر مجھے امید ہے کہ آپ میرے کہے کا مان رکھیں گے۔'' وہ خود کو مکمل طور پر کمپوزڈ کرچکی تھی، متانت سے کہہ کر پلٹ گئی۔ جاتے وقت اس نے فائز کو دوبارہ ضرور دیکھا تھا۔

اپنے آفس میں آکر اس نے پرس میز پر تقریباً پھینکا اور کرسی پر گر کر کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبایا۔ اندر باہر طوفان سے چل رہے تھے۔ شاک، بے یقینی، دھوکا، توہین...... اس کے چہرے پہ ہر احساس رقم تھا۔

پچھلے کچھ دنوں کے مناظر اس کے سامنے چلنے لگے۔ فائز کا اس کا سوپ گرانا۔ اپنی بہنوں اور ماں کی محبت کے قصے دُہرانا، اس سے رضوان حیات کے رشتے داروں کے بارے میں سوال کرنا، اس سے شجاع کا ذکر چھیڑنا...... کچھ اتفاق نہ تھا۔ سب پلاننگ تھی۔

پارس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کو عجیب تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فائز کو پہچان نہیں سکی۔ وہ دھوکا کھا گئی۔ وہ فیل ہوئی۔ مگر...... مگر کیا وہ اب بھی فیضان کو ٹھیک پہچان رہی ہے یا ابھی تک اس کی آمد کے اصل مقصد سے ناواقف ہے؟

پارس ہولے ہولے کنپٹیوں کو مسلنے لگی۔ اسے خود کو پُرسکون کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والے دنوں کا لائحہ عمل بھی طے کرنا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ پہلا اسٹیپ وہ کیا اٹھائے؟

دروازہ ذرا سی آہٹ کے ساتھ کھلا اور تنویر صاحب اندر داخل ہوئے۔ پارس نے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا۔ مسکرائی نہیں بس خالی، خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

''بیٹھیے۔'' کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شکریہ کہتے ہوئے بیٹھے۔

''سویرا قانونی کارروائی کا کہہ رہی تھی، غالباً وہ لاش کا پوسٹ مارٹم کروانا چاہتی ہے۔''

پارس جوابی تبصرہ کیے بغیر اُن کو دیکھتی رہی۔

''مگر فی الحال ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا۔ فیضان شاید ایسا نہیں چاہتا۔''

''فیضان واپس کب آرہا ہے؟'' پلک جھپکے بنا انہیں دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

تنویر صاحب نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا، شاید وہ ابھی کچھ عرصے تک واپسی کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ خیر، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ مجھے ایک اور بات بھی کرنی تھی۔'' ذرا سے توقف کے بعد وہ بولے۔ ''آپ کے بھائی، شکیل صاحب مجھے وہ کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگتے۔''

''مجھے تو اب یہاں بہت سے لوگ ٹھیک نہیں لگتے تنویر صاحب!'' وہ ان پر نگاہیں جمائے چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مگر ہم شکیل کی بات کر رہے ہیں، آپ ان سے تھوڑی سی احتیاط کریں وہ......''

''تنویر صاحب! آپ کو یاد ہوگا کچھ ماہ قبل آپ کو میں نے جو رقم ٹرانسفر کی تھی، اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ رضوان کی موت اور آس پاس کے واقعات کو اچھے سے کور اپ کرنا اور ہمارے من پسند نتائج سامنے لانا۔ ہماری اس ڈیلنگ میں ذاتیات پر بات کرنا شامل نہیں تھا، اس لیے آپ مجھے شکیل یا کسی دوسرے کی اصلیت مت بتائیں کیونکہ ایک بات میں نے آپ پر پہلے دن سے واضح کی تھی کہ نہ آپ میرے ساتھ وفادار ہیں، نہ مجھے آپ پر اعتبار ہے۔''

''کچھ ہوا ہے، میم؟'' تنویر صاحب اب غور

پارس کو دیکھ رہے تھے۔

''جی اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے آفس آکر مجھ سے میرے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں اور یہ بات مجھے پسند نہیں آئی۔'' اس کا لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں، آپ جانتی ہیں میں صرف آپ کی خیر خواہی عزیز رکھتا ہوں۔'' وہ خفیف نظر آنے لگے۔

''آپ جا سکتے ہیں، مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔'' وہ رخ ذرا پھیر کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ تنویر صاحب خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے، البتہ وہ کچھ کھٹکے ہوئے لگ رہے تھے۔

☆☆☆

فائز چند فائلز اٹھائے کاریڈور میں چلتا جارہا تھا جب کسی نے اسے پکارا۔ ''فیضان صاحب!''

وہ اپنے قدموں پر منجمد ہوا مگر اگلے ہی لمحے چابک کی سرعت سے گھوم کر پلٹا۔

سامنے احسان صاحب کھڑے تھے۔ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھتے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''اوہ...... احسان صاحب...... السلام علیکم!'' اس نے بدقت مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

''آپ اِدھر ہوتے ہیں؟ حیرت ہے، مسز پارس سے میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کراچی سے نہیں آئے۔'' وہ بہت حیرت سے کہہ رہے تھے۔

فیضان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔ اس نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔

''میں کسی وجہ سے اِدھر ہوں مگر مسز پارس کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ میں رضوان حیات کا بیٹا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔'' وہ جلدی، جلدی کہنے لگا۔

''مگر...... سر...... وہ کیا آپ کو پہچانتی نہیں ہیں؟''

''احسان صاحب! کیا آپ میرے راز کو راز رکھ سکتے ہیں؟'' اس نے جواب دیے بنا دوٹوک لہجے میں پوچھا۔ احسان صاحب نے پریشانی بھرے چہرے کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، میں پہلے آپ سے کبھی ملا ہی نہیں۔''

''گڈ!'' وہ اپنی پریشانی چھپاتا، سنجیدگی سے یہ کہتا پلٹ گیا۔

کاریڈور خالی ہو گیا تو احسان صاحب نے موبائل سے ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔

''جی مسز پارس! ان کو یقین ہے کہ میں ان کے بارے میں آپ کو خبر نہیں دوں گا۔ اب بتائیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''مجھے فیضان حیات کے بارے میں ہر وہ معلومات چاہیے جو آپ اکٹھی کر سکیں اور یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔''

''شیور میم۔'' انہوں نے پختہ لہجے میں کہہ کر کال کاٹ دی۔

☆☆☆

پارس تھکے تھکے انداز میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے شکیل اور فیروزہ نے یہ محسوس ضرور کیا تھا مگر بولے کچھ نہیں، بس خاموشی سے میوے کھاتے رہے۔ وہ اتنی ہی خاموشی سے اوپر چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر سب ویران سا نظر آیا۔ دھوکا دہی کا احساس انسان کو اندر باہر سے ویران کر دیتا ہے۔ خود پر سے اعتبار اٹھنے لگتا ہے۔

''میں؟ کیا میں اتنی بے وقوف تھی؟ کیا میں اتنی بے وقوف ہو سکتی تھی؟'' وہ وہیں چوکھٹ میں کھڑی رہی۔ کہنی پر ٹنگا بیگ جانے کب پھسل کر فرش پر آن گرا۔ کاریڈور میں روشنی تھی، اندر

اندھیرا تھا۔ وہ روشنی میں گھری اندھیرے کا منظر دیکھنے لگی۔ وہ اندھیرے میں گھری روشنی کی امید تلاش کرنے لگی۔ امید کا وہ دیا جو سامنے نظر آتے کمرے کو روشنی میں نہلا دے، ایسی بے کراں روشنی جس میں اس کمرے کی ہر شے پر ثبت ہر یاد کا عکس زندہ مجسم ہو کر سامنے آجائے۔

ایسی روشنی جو کہانی سنانے لگے...... ماضی کے ایک دن کی کہانی......

رضوان حیات نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا، اندر بیڈ روم چکا چوند روشنی میں نہایا ہوا تھا۔

"یہ ہے تمہارے پسندیدہ گھر کا سب سے خوب صورت کمرا...... ہمارا کمرا......" انہوں نے اندر قدم رکھتے ہوئے جیسے تعارف کروایا۔ اس کا کمرے سے یا کمرے کا اس سے، وہ فیصلہ نہ کرسکی، بس دائیں سے بائیں دیکھتے ہوئے چوکھٹ پار کی۔

وہ سلک کی گہری نیلی ساڑی میں ملبوس تھی۔ گھر سینٹرلی ہیٹڈ تھا۔ اس لیے شال اور کوٹ نیچے اسٹینڈ پر چھوڑ آئی تھی۔ سیدھے بال کمر پر، ذرا سا میک اپ، گردن میں ہیروں کا ایک نازک ہار جو آج کے موقع کے لیے رضوان نے دو روز قبل دلوایا تھا۔ اس کا چہرہ پُرسکون تھا مگر اداس بھی، آنکھوں میں احساسِ تشکر اور طمانیت تھی مگر ایک چبھن بھی، ہلکی سی تکلیف جو بائیں پہلو میں اکثر ان لوگوں کو اٹھتی ہے جو بھی کسی کو ادھر بسا لیتے ہیں...... اور جو پھر ہمیشہ ان سے بچھڑ جاتے ہیں۔

رضوان ایک آرام دہ آرم چیئر پر بیٹھ گئے تھے اور اب ٹانگ پر ٹانگ رکھے بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا تم خوش ہو؟"

پارس ذرا سا مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں ملال جھلکا۔ شجاع سے بچھڑنے کا غم نہیں بلکہ اسے کبھی دل میں اتنی سی جگہ بھی دینے کا پچھتاوا جس کے وہ قابل نہ تھا۔

"میں جانتی ہوں میں آپ کے ساتھ خوش رہوں گی۔ پندرہ دن پہلے میں آپ کے نام کے علاوہ کسی چیز سے واقف نہ تھی مگر پندرہ دن بعد کی اس تبدیلی پر مجھے نہ پچھتاوا ہے، نہ افسوس...... اور نہ ہی یہ احساس کہ ہم نے عجلت سے کام لیا۔ میں خوش ہوں، مطمئن ہوں۔" بہت اعتماد سے کہتی وہ بیڈ کے کنارے پر آبیٹھی۔ وہ اس کی بات پر مسکرائے۔ ان کا چہرہ اتنا مہربان اور نرم تھا کہ وہ دس سال اسی پالکی پر بیٹھی، ان کو یونہی دیکھ سکتی تھی۔ وہ نقوش کے وجیہہ نہیں تھے مگر دل کے ضرور تھے۔

"مگر مجھے احساس ہے کہ ہم نے عجلت سے کام لیا۔ یقیناً سویرا اور فیضان اس رشتے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود میں خوش ہوں۔"

دوسرے فقرے کے دوسرے نام تک ہی وہ پہنچے تھے کہ پارس کے حلق میں کوئی کڑوی گولی آپھنسی۔ اس کے تاثرات میں سوگواریت در آئی۔

"آپ ان کو بتا دیں۔"

"ابھی نہیں پارس! ابھی میں کچھ دن سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد بتا دوں گا۔ سب کو بتا دوں گا۔ مجھے اپنی زندگی کا بھروسا نہیں رہا۔" ان کی مسکراہٹ میں اداسی در آئی۔ "مجھے لگتا ہے میری موت قریب ہے۔ ایسے میں، میں کچھ دن اپنے لیے جینا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھتی تھی امی اور شکیل جیسے صرف ایک ہیں دنیا میں اور وہ، وہ خود ہی ہیں۔ مگر جب سے میں آپ کے توسط سے مسز سویرا اور فیضان کو جاننے لگی ہوں، میں...... میں بہت دکھ محسوس کرتی ہوں۔" وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پائی۔ "مگر اس سب کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ آپ ان کی کمی محسوس کررہے ہیں۔ آپ کہہ نہیں رہے مگر آپ کی خواہش تھی کہ فیضان اس وقت آپ کے ساتھ ہوتا۔"

"آخر وہ میرا بھائی ہے، میرے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔" وہ آزردگی سے مسکرائے۔

اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"میں شکیل اور امی سے کبھی محبت نہیں کرسکی۔ بزدلی کی وجہ سے ایکسپلائٹ ہوتی رہی۔ آپ فیضان اور سویرا سے محبت کرتے رہے اور محبت کے ہاتھوں ایکسپلائٹ ہوئے۔ کیا اس آگہی کے بعد بھی آپ کی محبت میں فرق نہیں آیا؟" وہ نہیں جانتی تھی اپنی شادی کی رات وہ ان دو ناپسندیدہ ہستیوں کا ذکر کیوں کررہی ہے؟

"فیضان اور سویرا میں فرق ہے پارس! فیضان مجھے کتنی کرواہٹ دے میں تب بھی اس کے بارے میں برا نہیں سوچ سکتا۔"

کمرے کی روشنی مدھم ہوئی یہاں تک کہ اندر اندھیرا چھا گیا۔ وہ روشن کاریڈور میں کھڑی رہ گئی۔ اندھیرے سے روشنی تک کا سفر لمحوں میں طے ہوگیا اور صدیوں کی تھکن چھوڑ گیا۔

اس نے جھک کر پرس زمین سے اٹھایا اور اندر آکر بیڈ کی پالکی پر ٹھیک اسی جگہ بیٹھی جہاں آٹھ، نو سال پہلے اس رات بیٹھی تھی۔

سامنے والی آرم چیئر خالی تھی۔ اسے ابھی خالی رہنا تھا۔

موبائل کی بیپ بجی تو اس نے اسے پرس سے نکالا۔ احسان صاحب کی ای میل آئی تھی۔ پارس ماضی اور مستقبل کے منجدھار سے خود کو نکال کر پوری توجہ سے ای میل کی طرف متوجہ ہوئی۔

فیضان حیات...... شناختی کارڈ کی تصویر...... تعلیمی اسناد...... سی وی کی کاپی...... تمام جابز کا ریکارڈ...... یہاں تک کہ ایک اپوائنٹ منٹ بھی...... رائل ہوٹل کی لاہور برانچ افتتاحی تقریب کی تصاویر میں بھی وہ کھڑا تھا۔ گرے تھری پیس میں سنجیدہ اور نمایاں...... وہی جو آج کل اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کے سامنے اس تصویر میں بیسیوں لوگ ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

فائز اور فیضان ایک ہی تھے اسے کیوں علم نہ ہوسکا؟

"مجھے وہ اتنا سخت ناپسند تھا کہ میں نے کبھی اس کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔" وہ خود سے بڑبڑائی۔ ایک تلخ مسکراہٹ چہرے پر ابھر کر معدوم ہوئی۔ دروازے پر مانوس سی دستک سنائی دی۔ پارس نے پلٹ کر دیکھا۔

چوکھٹ میں افضل بابا کھڑے تھے۔

"بی بی! کھانا لاؤں؟" مؤدب، ہاتھ باندھے، سر جھکائے۔ اس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور دوسری نظر موبائل پر فیضان کی تصاویر پر ڈالی۔ تیسری نظر جب افضل بابا کی طرف اٹھائی تو وہ غور سے، باریک بینی سے انہیں دیکھتی، پرکھتی ہوئی نظر تھی۔

"گھنٹے تک لگا دیجیے گا کھانا، بابا۔" الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے لمحے بھر کے لیے بھی آنکھیں ان سے نہ ہٹائیں۔ وہ جانتے تھے، وہ سب جانتے تھے، بس اس کو بے خبر رکھا۔

"بہت بہتر۔" وہ تعظیماً سر جھکائے باہر چلے گئے۔ پارس خاموش نظروں سے خالی چوکھٹ دیکھتی آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگی۔

☆☆☆

رضوان، فیضان اور سویرا کے مری والے بڑے گھر کا ڈرائنگ روم خاصا شاندار تھا۔ شاہانہ انداز کی سجاوٹ اور زرد روشنی۔ شکیل ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا، چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ہر شے کو نگاہوں سے سراہ رہا تھا۔ سامنے بیٹھی سویرا جیسے بہت دیر سے ضبط کررہی تھیں، بالآخر چبا چبا کر بولیں۔

"تم یہاں اس طرح سرعام آنے کا مقصد

چائے کے کتنے کپ پینے کے بعد بتاؤ گے؟"
"آپ کو میرے آنے پر اعتراض ہے یا یوں چائے پینے پر؟" شکیل نے ہنس کر سر جھٹکا اور ایک طویل گھونٹ بھرا۔
"مجھے ہر چیز پر اعتراض ہے۔" وہ پھٹ پڑنے کو بے تاب تھیں۔ "جب میں نے کہا تھا کہ تم سے رابطہ میں خود کروں گی تو تم یوں کیوں منہ اٹھا کر آ گئے؟"
"بس...... بھئی ہم تو پارٹنرز ہیں، اب اتنا بھی کیا کہ مل نہ سکیں؟"
"پارٹنرشپ کی آفر میں کسی بھی وقت ختم کر سکتی ہوں شکیل، یاد رکھو میں یہ کام کسی سے بھی کروا سکتی ہوں۔" وہ خطرناک لہجے میں بولیں تو شکیل پھر سے ہنسا۔
"پارس تو آپ کی دشمنی سے واقف ہے مگر سوچ لیں، اگر اسے کسی اور نے قتل کیا تو کیا میں پولیس کے پاس جا کر نہیں کہوں گا کہ اس کام کی آفر سویرا صاحبہ نے پہلے مجھے کی تھی؟ یاد رکھیں، میرے پاس میری ماں کی گواہی بھی ہوگی۔"
سویرا لب بھینچ کر رہ گئیں۔ شکیل اس دفعہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔
"کیا چاہتے ہو؟" وہ غصہ دبا کر بولیں۔
"یہ...... اس طرح پیار سے بات کیا کریں ناں۔" وہ جیسے "یہ چیز" کہنے والے انداز میں خوشی سے مسکرایا۔ "پرسوں رات ہوٹل کی پارٹی ہے۔ اس میں مجھے یہ کام کرنا ہے مگر ظاہر ہے اس کے لیے مجھے لاجسٹکس کی ضرورت......"
"لمبی بات کٹ کرو، اور بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟" انہوں نے ترشی سے کہتے ہوئے پرس اٹھایا۔ شکیل کی آنکھوں میں چمک در آئی۔
"اتنا تو ہو کہ میں اپنی تیاری مکمل کر سکوں۔"
سویرا خاموشی سے چیک بک پر کچھ لکھتی رہیں۔

پھر ایک چیک پھاڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔
"یہ لو، اور اسی پر اکتفا کرو۔" شکیل نے چیک پکڑا، پڑھا اور مسکرایا۔ پھر تہ کر کے جیب میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"اب مزید زحمت نہیں دوں گا آپ کو۔ جلد ہی آپ کو اچھی خبر سناؤں گا۔"
"یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔" وہ تند و تیز نگاہوں سے اسے گھورتیں بہ مشکل ضبط کر رہی تھیں۔
وہ جیسے ہی باہر نکلا، فیضان کی گاڑی گیٹ کے قریب آئی۔ شکیل کی اس طرف پشت تھی۔ فیضان پھر بھی جھک کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ شکیل نگاہوں سے اوجھل ہوا تو فیضی کار اندر لایا۔ برآمدے کے دروازے کو عبور کر کے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سویرا ابھی وہیں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر بری طرح چونک گئیں۔
"تم...... کب آئے؟" رنگت ذرا سی فق ہوئی، بے اختیار فیضی کی پشت پر دیکھا جیسے تسلی کرنا چاہ رہی ہوں کہ شکیل چلا گیا ہے یا نہیں۔
"یہ پارس کا بھائی اِدھر کیا کر رہا تھا؟" وہ گہری چبھتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھتا اسی جگہ آ کر بیٹھا جہاں ابھی شکیل بیٹھا تھا۔ فیضان کو وہ جگہ گرم لگی۔ سویرا نے یقیناً بہت دیر شکیل کو وہاں بٹھایا تھا۔ سامنے پڑے چائے کے برتن بھی ابھی اٹھائے نہیں گئے تھے۔
"وہ...... مجھ سے بات کرنے آیا تھا۔ یہ کہنے کہ اس جائداد پر اس کا اور اس کی بہن کا حق ہے لہٰذا میں اس معاملے میں بھی ٹانگ اُڑانے کی کوشش نہ کروں تو بہتر ہے۔"
فیضان آنکھیں سکیڑے آپا کو دیکھتا رہا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
"آپ نے کیا کہا؟"
"میں نے ٹھیک ٹھیک اسے اس کی اوقات یاد

بھلا خوب بے عزت کر کے نکالا۔"
"وہ تو لگ ہی رہا ہے۔" اس نے ایک نظر [illegible]ے لوازمات پر ڈالی۔
سویرا نے نظر انداز کیا۔ جیسے یہ اہم بات نہ ہو۔
"تم بتاؤ، خیر سے آئے ہو؟"
"ہوں...... آج احسان صاحب مل گئے، احسان ملک۔ لاہور والی برانچ میں کام کرتے ہیں۔" وہ صوفے پر پیچھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بتانے لگا۔
"اوہ...... کیا انہوں نے تمہیں پہچان لیا؟"
"ظاہر ہے اور مجھے یقین دہانی بھی کروائی ہے کہ پارس کو نہیں خبر ہونے دیں گے۔ مگر بہر حال، جلد یا بدیر یہ راز کھل ہی جائے گا۔"
"اسی لیے کہتی ہوں اہم ڈاکومنٹس اپنے قبضے میں کر لو، جائداد کی منتقلی کے کاغذات صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دو اور......" وہ رک گئیں۔
"اور پارس کو قتل کر دوں۔ یہی چاہتی ہیں ناں آپ؟" وہ تلخی سے مسکرایا۔
"یہاں آنے سے قبل تم بھی یہی چاہتے تھے۔"
"تب میں پارس کو قاتل سمجھتا تھا۔"
"اب کیا سمجھتے ہو؟" وہ چونک کر بولیں۔ فیضی چند لمحے کے لیے بالکل خاموش رہ گیا۔
"کم از کم قاتل نہیں۔" وہ بولا تو اس کی آواز میں [illegible]انوں کی تھکن تھی۔
"تو پھر قاتل کون ہے؟ یا تم اس بات پر ایمان لے آئے کہ "وہ...... سیڑھیوں...... سے...... گر...... گئے تھے؟" انہوں نے توڑ توڑ کر فقرہ ادا کیا گویا [illegible] کی نقل کی۔
"وہ قتل ہوئے ہیں، مجھے یقین ہے مگر [illegible] نہیں...... یہ کوئی اور ہے۔"
"یا تو تم قاتل کو جانتے ہو اور اسے چھپا رہے ہو یا تم پارس کو پروٹیکٹ کر رہے ہو......" وہ بھی اس

کی طرف سے مشکوک تھیں۔
"آپ کیا چاہتی ہیں، میں پارس کو قتل کر دوں؟" وہ زچ ہو گیا۔
"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ان کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ فوراً زبان دانتوں تلے دبائی۔ فیضان چونکا۔
"کیوں؟ کیا اس کام کے لیے کوئی اور مل گیا ہے؟"
"اونہوں، جب تم ہی کنونس نہیں ہو کہ وہ قاتل ہے تو ہم اس کو سزا کیسے دے سکتے ہیں؟ تمہارے اپروول کے بغیر تو کچھ نہیں ہوگا فیضی۔"
"اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔" وہ سختی سے بولا۔
سویرا آپا نے سر کو خم دیا جیسے فرمانبرداری و تعاون کی یقین دہانی کی۔
فیضان اپنی سوچوں میں گم تھا۔

☆☆☆

آفس میں حزن بھری خاموشی پھیلی تھی۔ پارس سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے، انگلیوں میں قلم تھمائے، چھت کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے فائلز، کاغذات بکھرے پڑے توجہ کے منتظر تھے۔ مگر اس کے پاس سوچنے کو بہت کچھ تھا۔
اسی طرح سر رکھے، اس نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور بولی۔
"فائز صاحب کو بھیجیں۔" اور بٹن بند کر دیا۔
باہر بیٹھی سیکریٹری مستعدی سے ریسیور اٹھا کر فائز کو کال کرنے لگی۔ چند منٹ بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آتا دکھائی دیا۔
پارس سیدھی نہیں ہوئی، سر اسی طرح پیچھے ٹکائے رکھا۔ بس نگاہوں سے فائز کے چہرے کا احاطہ کیا۔
"جی میم؟" وہ مؤدب سا کھڑا پوچھ رہا تھا۔ انداز میں متانت تھی، ادب تھا مگر پارس اس کی

آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ وہ گہری تھیں۔ معائنہ ومشاہدہ کرتی، پرکھتی، جانچتی آنکھیں......

"آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" اس نے اسے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ وہ منتظر سا کھڑا رہا۔

"جی کہیے۔"

"آپ کے پرانے باس..... فیضان صاحب...... رضوان کے بھائی، اُن کے بارے میں کچھ بات کرنا تھی۔"

"جی بتائیں۔" فائز کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے، وہ سنجیدگی سے اور دھیان سے سننے لگا مگر اس کی آنکھوں کے microexpressions ضرور بدلے تھے، وہ ذرا چونکا ہوا تھا۔ آگہی کا عدسہ لگائے بغیر پارس کو شاید کبھی یہ expressions نظر نہ آتے۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کر سکتے ہیں؟"

"جی، میرے پاس ان کا نمبر اور ای میل ایڈریس ہے مگر میں نہیں جانتا کہ میرے پیغام کو وہ سنجیدگی سے لیں گے یا نہیں۔"

"ضرور لیں گے اگر وہ پیغام پارس رضوان حیات کی طرف سے ہو۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔ نگاہیں ایک پل کے لیے بھی فائز کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا، البتہ آپ پراپر چینل کے تھرو، مطلب ان کی سیکریٹری کے ذریعے بھی پیغام پہنچا سکتی ہیں تو پھر میں کیوں؟" وہ ذرا سا الجھ کر بولا۔ یہ فائز حسن کی الجھن تھی، ایک ادنیٰ ملازم کی مالک کے اس اہمیت دینے پر ظاہر کی جانے والی الجھن...... البتہ فیضان حیات کی آنکھوں میں کوئی الجھن نہ تھی، بس وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیونکہ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔"

"تھینکس میم! کیا کہنا ہے اُن سے؟"

"کل رات ہمارے ہوٹل کی اینیورسری ہے، ان سے کہیے کہ وہ انوائٹڈ ہیں، مسز سویرا کے ساتھ ان کی شرکت بھی میرے لیے ضروری ہے اور میں امید کرتی ہوں کہ کل کی پارٹی میں وہ ضرور آئیں گے۔"

"شیور میم! میں کہہ دوں گا۔ کیا آپ ان کو انوی ٹیشن کارڈ بھی بھجوائیں گی؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے فائز صاحب، آپ اس کی فکر نہ کریں۔ جو میں نے کہا ہے بس وہ کریں۔" پارس ذرا سا مسکرائی۔

فائز خاموش ہو گیا پھر سر کو خم دیا اور واپس پلٹ گیا۔

پارس نے نگاہیں واپس چھت پر مرکوز کر دیں۔ سفید فالس سیلنگ کی اسپاٹ لائٹس جگمگا رہی تھیں۔ اس کی نظریں روشنی کے ایک گولے سے دوسرے پر پھسلتی گئیں، آنکھیں چندھیانے لگیں...... جیسے بہت سے چاند سفید چادر میں پھیلا دیے گئے ہوں۔ چاندنی ہی چاندنی ہر سو بکھرنے لگی...... جب وہ چھتی تو سیاہ آسمان پر بس ایک ہی چاند نظر آ رہا تھا۔ گول تکیا کی طرح کا چاند......

وہ ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے کھڑی، گردن اٹھا کر چاند کو دیکھ رہی تھی۔ شال کندھوں کے گرد سختی سے لپیٹے، نیچے اوورکوٹ، بند بوٹ، البتہ بال کھلے تھے۔ رضوان کو اس کے کھلے بال اچھے لگتے تھے اور اسے رضوان ہی بہت اچھے لگتے تھے۔

آہٹ پر بے اختیار پارس نے گردن موڑی۔ رضوان خاموشی سے آ کر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ یہ ان کے بیڈ روم کے سامنے کا ٹیرس تھا جہاں دور دور تک پھیلے مری کے پہاڑ نظر آتے تھے۔

"کیا ہوا؟" اس نے تشویش سے اُن کا چہرہ دیکھا۔ وہ فکرمند نظر آ رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے زبردستی مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ پارس ان کے ساتھ کرسی پر آ بیٹھی۔

"چھپانا چاہیں تو میں آپ کی پرائیویسی کا احترام کروں گی لیکن اگر بتانا چاہیں تو میں آپ کے اعتبار پر اچھا محسوس کروں گی۔"

رضوان نے گہری سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

"میں نے فیضی اور سویرا کو اپنی شادی کا بتا دیا ہے۔"

ٹیرس پر خاموشی چھا گئی۔ صرف چاند کی چاندنی بکھری رہی۔

"تو انہوں نے کیا کہا؟"

"سویرا بہت غصہ ہوئی، ناراض ہوئی، رونے بھی لگ گئی۔ اور فون تھک سے بند کر دیا۔"

"مگر آپ کو اس بات نے پریشان نہیں کیا۔ آپ وہ بتائیں جس پر آپ اپ سیٹ ہیں۔" وہ غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ اتنے دنوں میں اتنا تو سمجھنے لگ گئی تھی وہ انہیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں سویرا کی عادت کا عادی ہوں۔"

"مگر...... فیضی...... اس کی وجہ سے اپ سیٹ ہیں ناں آپ؟" وہ ان کے ایک، ایک تاثر کو نوٹ کر رہی تھی۔

"ہاں۔" انہوں نے تسلیم کر لیا۔ وہ اس کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے، بس ٹیرس کی ریلنگ سے اوپر دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہا اس نے؟ اونچا بولا، غصہ کیا، ناراضی ہوا، مجھے چھوڑنے کا حکم...... کیا کہا اس نے؟" وہ نرمی سے بولی۔

"کچھ بھی نہیں...... بس ہلکا سا گلہ کیا جو بجا بھی تھا اور کچھ نہیں کہا اس نے۔ جیسے وہ بہت ہرٹ ہے۔"

"آپ کیوں دل پہ لے رہے ہیں؟ اگر وہ اس سب میں شامل نہ ہوتا تو آپ کی شادی کب کی ندا سے ہو گئی ہوتی۔ اگر آپ کا گھر نہیں بسا تو اس کی وجہ وہ لوگ ہیں۔ اب اگر بس گیا ہے تو بھی وہ ناراض ہیں۔" وہ دبے دبے غصے سے کہنے لگی۔

"وہ ناراض نہیں ہے، وہ ہرٹ ہوا ہے۔ مجھے اسے بتا دینا چاہیے تھا۔" وہ پشیمان نظر آ رہے تھے۔

"تاکہ وہ فوراً یہاں آ جاتا اور ہر ممکن طور پر آپ کو مجھ سے دور کرنے کی کوشش کرتا۔ نتیجتاً آپ پھر اکیلے ہوتے۔ کیا یہ ٹھیک ہوتا؟"

"پارس! وہ میرا بھائی ہے، میرے بیٹوں جیسا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں وہ مجھ سے محبت کرتا ہے تبھی ہرٹ ہوا ہے۔"

"وہ آپ کا بھائی ہے، بیٹوں جیسا ہے اور میں اسے نہیں جانتی۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ اسے بھی آپ سے اتنی محبت ہو گی جتنی آپ کو اس سے ہے۔ اسے آپ کی ضرورت ہے اور وہ زیادہ عرصے آپ سے ناراض نہیں رہ سکے گا۔"

وہ تھکاوٹ سے مسکرائے اور پہلی بار اسے دیکھا۔

"تم اسے نہیں جانتیں۔ وہ سویرا جیسا نہیں ہے۔ اس میں اور سویرا میں بہت فرق ہے۔"

"وہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ شکیل اور امی جیسے۔ ہمارے رشتے آپس میں جڑواں ہیں رضوان۔"

"پارس اگر میں تمہیں کہوں کہ تمہارا کزن شجاع بھی تمہاری ماں اور بھائی جیسا ہی ہے، اسے بھی تمہاری ضرورت تھی اور وہ اس لیے دور چلا گیا کہ اسے تم سے بہتر ضرورت پوری کرنے والا مل گیا ہو گا تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

پارس بالکل چپ ہو گئی۔ اسے واضح برا لگا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے میرے دل میں اس کے لیے جگہ ہے؟"

"ہرگز نہیں، مگر تمہارا perception اس کے بارے میں اچھا ہے، تم اسے کبھی مفاد پرست نہیں سمجھ سکتیں لیکن اگر تم مجھ سے پوچھو تو وہ فیضی سے

زیادہ مفاد پرست ہے۔ اب تمہیں برا لگ رہا ہے۔ مجھے بھی ایسے ہی برا لگتا ہے۔ جب تم فیضی کو برا کہتی ہو۔" وہ غصہ نہیں ہو رہے تھے۔ بس دھیمے، تھکے ہوئے لہجے میں سمجھا رہے تھے۔

"آپ شجاع کا فیضان سے مقابلہ کیوں کر رہے ہیں؟ میرا شجاع سے کوئی رشتہ نہیں ہے مگر فیضان آپ کا بھائی ہے۔ ٹھیک ہے میں اسے برا نہیں کہوں۔ مگر میں یاد رکھوں گی کہ ہماری پہلی تلخ کلامی کی وجہ فیضان ہی تھا۔" وہ خفگی سے بولتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور آپ اسے یہ بھی بتا دیں کہ آپ نے ہوٹل میرے نام کر دیا ہے اور جب وہ بھڑکے تو فوراً سے ہوٹل.... واپس لے لیں کیونکہ مجھے آپ بھائیوں کے درمیان کی دیوار نہیں بننا۔ مجھے ہوٹل نہیں چاہیے۔" وہ تیزی سے اندر کی طرف مڑ گئی۔

"پارس!" رضوان نے پژمردگی سے اسے پکارا۔ شاید چاند نے بھی پکارا مگر اس نے نہیں سنا۔ چاند کی کول ٹکی تھی رہ گئی اور پھر اس کی چاندنی پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ سیاہ آسمان سفید ہو گیا اور بہت سے چاند اس پہ بکھرتے گئے، اسپاٹ لائٹس ہنوز جگمگا رہی تھیں۔

پارس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پہ بے پناہ حزن بکھرا تھا۔ دفعتاً اس کے موبائل کی بیپ بجی...... وہ کسلمندی سے سیدھی ہوئی اور فون دیکھا۔ آنے والا پیغام...... پڑھ کر وہ چونکی۔

"میں آپ کے اوپن ائر کیفے میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں اور یہ پیغام بھیج کر فون بند کر رہا ہوں۔ فوراً مجھ سے ملیں، مجھے کچھ بات کرنی ہے شجاع۔"

اس کی بھویں پُرسوچ انداز میں بھنچ گئیں۔ چند لمحے جیسے اس نے غور کیا پھر سامنے اسٹینڈ میں رکھے دعوت ناموں میں سے ایک اٹھایا۔ اس پہ شجاع کا نام تحریر کیا اور پرس سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک بات اسے بھی کرنی تھی۔

☆☆☆

رائل ہوٹل کے مصلا ریسٹورنٹ کے سامنے کھلا ٹیرس تھا جس میں اوپن ائر کیفے بنا تھا۔ ریلنگ کے ساتھ رکھی میز کرسیاں اور چند ایک ٹہلتے لوگ..... وہاں کھڑے ہو کر دیکھو تو دور دور تک پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں...... سرما میں یہاں سب برف سے ڈھکا ہوتا تھا اور گرما میں سبزے سے' ان پہاڑوں کے لیے زندگی کے دو ہی رنگ تھے۔ سفید اور سبز اور دونوں مبارک تھے۔

شجاع ایک کرسی میز کے ساتھ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے، جھکا کھڑا دور پھیلے مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی گلاسز سے جھلکتی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ فیصلہ کن سوچ قطعی انداز.....

آہٹ پہ اس نے گردن موڑی، پارس کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ وہی شاہانہ انداز، ٹانگ پہ ٹانگ رکھی، پرس نزاکت سے میز پر رکھا اور ایک کارڈ دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی؟" شجاع مسکرا کر سیدھا ہوا۔

"مجھے آنا تھا کیونکہ مجھے بھی تم سے کچھ بات کرنی تھی۔ اگر نہ کرنی ہوتی تو شاید اس وقت تم مجھے یہاں نہ دیکھتے۔" وہ ذرا سا مسکرا کر بولی اس کی آنکھیں البتہ نہیں مسکرائی تھیں۔

"پہلے تم کہو......" وہ سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

"شیور......" پارس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ جیسے اسے واقعی صرف اپنی کہنے سے غرض ہو۔ "کل رات ہمارے ہوٹل کی اینورسری کا فنکشن ہے۔ مجھے لگا مجھے تمہیں بھی انوائٹ کرنا چاہیے۔" ساتھ ہی کارڈ میز کے عین وسط میں رکھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے بلایا۔" شجاع نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر پارس بولی۔ "اگر تم نے کچھ کہنا ہے تو کہو کیونکہ میرا شیڈول آج بہت ٹائٹ ہے۔"

"تم مجھ سے کیوں بھاگتی ہو پارس؟"

"بھاگنے کا رواج تمہارے یہاں ہے، میرے یہاں نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پورے وقار سے بولی۔

"مگر تم مجھے avoid کر رہی ہو، جب سے میں آیا ہوں تم مجھ سے ٹھیک سے ملی تک نہیں ہو، ہم نے ایک دفعہ بھی ساتھ بیٹھ کر اچھے ماحول میں بات نہیں کی۔"

"اور ہم ساتھ بیٹھ کر اچھے ماحول میں باتیں کیوں کریں؟ مثلاً تم میرے کیا ہو جو اتنا کچھ ایکسپیکٹ کر رہے ہو؟"

"میں تمہارا کزن ہوں، تمہارا منگیتر تھا اور ہمیشہ تمہاری زندگی میں ایک نہ بھولے جانے والے شخص کی طرح رہوں گا۔" وہ جیسے غصے میں آ گیا۔ اپنی ناقدری کا غصہ یا شاید اس کی بے اعتنائی کا۔

"کزن کا تعلق قسمت نے بنایا، منگیتر کا مبہم اور ادھورا رشتہ...... چند ایک بار کے کہے گئے تمہارے اور میرے والدین کے الفاظ کی وجہ سے کچھ عرصہ قائم رہا اور رہی یہ بات کہ میں کبھی تمہیں بھول نہیں پاؤں گی تو یہ بھی درست ہے، میں تمہیں بھلانا ہی نہیں چاہتی شجاع کیونکہ تم میری زندگی میں اتنے اہم نہیں ہو کہ مجھے تمہاری یاد آتی ستائے کہ میں تمہیں بھولنے کی خواہش کروں۔"

"ٹھیک ہے، تمہاری ساری باتیں درست، شجاع ہمیشہ سے غلط تھا، میں نے تمہاری پروا نہیں کی، تمہیں ڈھونڈ نہیں سکا یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ میں نے جستجو ہی ترک کر دی لیکن کیا تم اس بات سے انکار کر سکتی ہو کہ میں نے جو بھی کیا اپنے اور تمہارے لیے کیا؟" پارس خاموش تھی، وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا تم اس بات کو جھٹلا سکتی ہو کہ جب تک ہم ساتھ تھے، میں نے تمہارے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کیا، تمہیں استعمال نہیں کیا، تمہارا استحصال نہیں کیا، کیا تم مجھے بھی شکیل یا تائی کی طرح کا لالچی سمجھتی ہو؟ کیا تم ایسا سمجھ سکتی ہو؟"

چند ساعتیں اس میز پر اتنی خاموشی چھائی رہی کہ پارس کے سانس لینے کی آواز بھی شجاع کو سنائی دی پھر وہ دھیرے سے بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم ایسے نہیں ہو۔"

شجاع کی آنکھوں میں مدھم سا تاثر جاگا حیرانی، خوشی، تشکر۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے ایسے سمجھا۔"

"مگر ہمارے راستے الگ ہیں شجاع اور میں نہیں چاہتی کہ تم مزید میرا راستہ کاٹو۔"

"میں تمہارا راستہ کاٹنے والا نہیں، اس پہ تمہارے ساتھ چلنے والا بننا چاہتا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا، نگاہ پارس کی آنکھوں سے نہ ہٹائی۔ ان میں... بلااختیار اضطراب در آیا۔ اس نے ساتھ ہی پہلو بدلا۔ وہ غیر آرام دہ ہوئی تھی۔

"شجاع......"

"پلیز بات مت بدلنا۔ مجھے کہنے دو جو میں کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر پارس کو روکا۔ "مجھے بتانے دو کہ میں تمہارے لیے واپس آیا ہوں، قدرت کو ہمارا ملنا منظور تھا۔ اس لیے اس نے ہمیں ملوا دیا۔ رضوان حیات بہت اچھے سہی مگر وہ تمہارے لیے وہ نہیں ہو سکتے جو میں تمہارے لیے تھا اور اب وہ نہیں ہیں، تمہیں ان کے دکھ سے باہر آنے میں وقت لگے گا، جتنا چاہے وقت لے لو مگر مجھے اجازت دو کہ میں تمہارا انتظار کر سکوں۔ میں آج بھی تمہارے لیے وہی ہوں پارو...... جگہ صرف تم نے بدلی ہے۔"

پارس کی آنکھوں میں گلابی پن جھلکنے لگا۔ اس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ کئی بھینچی گہری سانس اندر کو اتاری، شجاع اس کی ایک، ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"وہی جو ہمیشہ سے چاہتا تھا، تمہاری اور میری شادی۔"

"اگر تم حقیقت جان لو تو کبھی اس کی خواہش نہ کرو۔" وہ مدھم سا بولی، اتنا مدھم کہ بہ مشکل آواز نے لبوں سے خود کو آزاد کیا۔

"کس کی حقیقت......؟"

"میری...... اور وہ جو میں کر چکی ہوں کیا تم نے نہیں سنا کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں؟" وہ مضطرب سی کہہ رہی تھی جیسے بس کہنے کو بے تاب ہو...... جب وہ اس کرسی پر بیٹھی تھی تو یکسر مختلف اور پُراعتماد لگی تھی مگر اب وہ اعتماد پھسل رہا تھا۔

"ہاں میں جانتا ہوں رضوان صاحب کے بارے میں کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر......"

"وہ حادثہ نہیں تھا۔" وہ میز پر ہاتھ رکھ کر آگے ہو کر اتنی تکلیف سے شجاع کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی کہ وہ اپنی بات بھول گیا۔

"اگر میں تمہیں کہوں کہ اُن کو میں نے...... میں نے دھکا دیا تھا، تب......؟ تم تب بھی مجھ سے شادی کرو گے؟"

شجاع نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کر سکتیں اور تم ایسا کیوں کرو گی؟"

"کیونکہ وہ اپنا یہ ہوٹل اپنے بھائی کے نام کر رہے تھے اور میرے پاس ان کو اس کام سے روکنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں ان کی...... ان کی جان لے لوں......" وہ دبے دبے لفظوں میں جیسے غرّائی۔ "میں نے ان سے شادی روپے، پیسے کے لیے نہیں کی تھی مگر تم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کے بہن، بھائی ان کو کس طرح لوٹ رہے تھے، میرے پاس ہوٹل کو بچانے کے لیے یہ واحد راستہ تھا، کیا میں نے غلط کیا؟"

شجاع دم بخود بیٹھا رہا...... دھماکوں کی زد میں آیا زلزلوں کا شکار...... بہ مشکل بڑی دیر بعد اس نے ذرا سا سر جھٹکا۔

"میں نہیں یقین کر سکتا کہ تم ایسا کر سکتی ہو۔"

"مگر میں نے کیا، میں نے خود ان کے ساتھ یہ سب کیا مگر مجھے افسوس ہے، ندامت ہے، پچھتاوا ہے، میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی، بس مجھ سے ہو گیا۔" وہ بے بسی سے لب کاٹتی، مٹھیاں بھینچتی کہہ رہی تھی۔

"پارس...... پارس تم...... تم نے جان بوجھ کر کچھ بھی نہیں کیا، تم اتنے اچھے دل کی ہو کہ یوں کسی کی جان سرد مہری سے نہیں لے سکتیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت حالات ایسے بن گئے ہوں کہ تم سے سب ہو گیا۔" وہ آگے کو ہوا جیسے تسلی دینے لگا۔ جیسے اسے خود بھی سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ اس لڑکی کو اذیت سے کیسے نکالے۔

پارس نے اضطراری کیفیت میں لبوں کو چھوا پھر بال پیچھے کیے، اس کے ہاتھ ہولے، ہولے کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں کا گلابی پن اب نمی سے لبریز ہو رہا تھا۔

"وہ بہت اچھے تھے شجاع، بہت مہربان، بہت نرم دل، میں انہیں مارنا نہیں چاہتی تھی بس مجھ سے...... بس یہ ہو گیا......" دو آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اس نے بے دردی سے رخسار رگڑے۔

"پلیز تم...... کسی کو مت کہنا کہ میں نے...... پلیز......" اس کی آنکھوں میں التجا در آئی۔ شجاع نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

"کبھی نہیں...... جو ہو گیا اسے بھول جاؤ اور یہ بات خود سے بھی نہ کرنا، ٹھیک؟" اس نے یہ کہتے ہوئے ٹشو اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے ٹشو لے کر آنکھوں کے کنارے صاف کیے پھر گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی۔

"اس دن...... کیا ہوا تھا کہ تم نے یہ سب کیا؟" شجاع نے دھیرے سے یہ الفاظ ادا کیے۔ پارس نے اس کے چہرے کو دیکھا پھر اس کے لبوں کو جہاں سے یہ الفاظ نکلے تھے، آواز کی لہریں جو وہاں سے ٹوٹ کر ہوا میں بکھریں اور ہر حرف الگ الگ ہو کر اڑنے لگا، یوں نرمی سے جیسے پانی پہ بہتا ہو۔ دھیرے دھیرے...... نرم نرم سا...... اس نے ان اڑتے حروف کو پکڑنا چاہا تو وہ دور بھاگتے گئے، اتنی دور کہ موسم کے رنگ پرانے ہونے لگے۔ رنگ بدل کر سفید برف بنتا گیا۔ بہار جیسی ہوا سرد خنکی میں بدل گئی۔

پارس نے خاموش نظروں سے سامنے کھڑے رضوان حیات کو دیکھا جو کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہے تھے۔

"کیا آپ فیضان سے بات کر رہے تھے؟" اس نے گفتگو کا آغاز کیا گویا اُن کی مشکل آسان کی۔

"ہوں...... میں اسے ہوٹل کا بتا رہا تھا۔"

"پھر ہوٹل؟" وہ چڑ گئی مگر ظاہر نہیں کیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"اسے اچھا نہیں لگا۔" کہتے ہوئے وہ سامنے صوفے پر بیٹھے، ٹانگ پر ٹانگ رکھی، کہنی آرم ریسٹ پر گردن سیدھی تنی ہوئی۔ پارس نے لاشعوری طور پر کمر سیدھی کی، گردن تنی، کہنی صوفے کے ہتھے پر براجمان کی۔

"تو پھر آپ یہ فیصلہ واپس لے لیں۔"

"پارس...... مجھے پتا ہے مجھے ہوٹل کس کو دینا

ہے، اس لیے ہم دوبارہ اس ٹاپک پہ بات نہیں کریں گے۔"

"مجھے لگتا ہے آپ کے بہن، بھائی مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ اس طرح تو ہماری شادی کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔"

"پارس...... زندگی کبھی شہد اور مکھن نہیں ہوتی، حالات ہر روز نئے ہوتے ہیں، قطار میں ایک جیسے دن رات کبھی نہیں آتے۔" وہ اسے سمجھا رہے تھے۔

"میں گھبرا نہیں رہی، نہ ہی میں آپ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" اس نے جیسے بےبسی سے بتانا چاہا۔ "میں صرف آپ کے اور آپ کے بہن، بھائی کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔ جب میں ان کے خلاف بات کرتی ہوں تو آپ کو برا لگتا ہے، اس لیے میں انہیں اپنے اور آپ کے بیچ کی دیوار نہیں بنانا چاہتی۔"

"اور میں چاہتا ہوں کہ تم ان کی طرف سے اپنا دل صاف کر لو۔ کم سے کم فیضان کی طرف سے۔"

"رضوان، میرا دل اگر میلا ہوا ہے تو انہی باتوں کی وجہ سے ہوا ہے جو آپ مجھے بتایا کرتے تھے...... مجھے لگا وہ لوگ بے حس ہیں مگر آپ کو اس سب کے باوجود وہ بے حس نہیں لگتے اور فیضان تو بالکل بھی نہیں، رضوان میری اور آپ کی ایک ہی حالت تھی۔ ہم دونوں کو ہمارے رشتے ایکسپلائٹ کرتے تھے۔ میں ان کی حقیقت جانتی تھی مگر میرے اندر ان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ آپ کے پاس حوصلہ، اعتماد، سب ہے مگر آپ ان کی حقیقت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔" وہ جیسے ایک ہی بات کہہ، کہہ کر تھک گئی تھی۔

"وہ میرے خون کے رشتے ہیں، میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن بھی نہیں ہے کہ...... درگزر کر دوں پھر فیضان اور سویرا میں فرق ہے۔

فیضان مجھ سے واقعی محبت کرتا ہے۔"

"کرتا ہوگا مگر وہ موقع ملتے ہی آپ کو betray ضرور کرے گا۔ اس میں اور شکیل میں کوئی فرق نہیں ہے رضوان۔"

"کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟" وہ جیسے تھک کر بولے۔ پارس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"آپ ٹھوکر کھا کر سنبھلیں گے، اس لیے میرا کہنا بیکار ہے، بس اب ہم اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کریں گے۔" ذرا سے توقف کے بعد وہ مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کافی پئیں گے؟"

"ضرور......" وہ تھکان سے مسکرائے اور سر ہلایا۔ ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ کے چاروں حروف کمپاس کی چاروں سمتوں کو اڑنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کرۂ ارض کا احاطہ کر لیا اور پھر اس سے بھی دور نکلتے گئے۔ روشنی کی رفتار سے بھی تیز...کہ لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا... سفید چادر بچھ گئی اور پہاڑوں پہ سبزہ لہلہانے لگا۔

"میں یاد نہیں کرنا چاہتی۔" پارس نے ٹشو سے آنکھ کا کونا رگڑا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا راز رکھ لینا شجاع...... اس سے زیادہ میں تم سے کچھ توقع نہیں کرتی۔" کہہ کر، وہ پلٹی اور تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔

شجاع تنہا بیٹھا رہ گیا۔

ملاقات ختم ہوئے پورا منٹ بھی نہیں گزرا تھا جب اس نے اپنے لباس کی اندرونی جیب سے ایک چھوٹا سا موبائل نکالا اور اسٹاپ کا بٹن دبا کر ریکارڈنگ بند کی۔ پھر ایک ایم ایم ایس تیار کیا، ریکارڈنگ اس میں ڈالی اور سویرا اسجد کے نام سے محفوظ کردہ نمبر پر بھیج دی۔

میسج کا مضمون یہ تھا۔

"آپ کے بھائی کے قتل کا معما یا آخر حل

ہوگا۔ آپ کا ایک خیر خواہ......"

دس سیکنڈ بعد پیغام کی ڈلیوری رپورٹ موصول ہوگئی۔ اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ در آئی۔

☆☆☆

میسج ٹون پہ سویرا نے ٹی وی پر سے نظر ہٹا کر اپنے موبائل کو دیکھا۔ اس میں ان کی پاکستانی سم تھی۔ جس کا نمبر پچھلے کئی سال سے ایک ہی تھا اور بہت لوگوں کے پاس نہیں تھا۔

انہوں نے ریموٹ رکھا اور موبائل اٹھایا۔ ایم ایم ایس موصول ہوا تھا، سویرا نے اسے کھولا، آڈیو فائل تھی، انہوں نے اسے پلے کیا۔

دو لوگوں کی گفتگو...... ایک پارس، دوسرا کوئی مرد...... شادی کی آفر کے جواب میں پارس کا اعترافِ جرم...... سویرا جیسے سُن سی ہو گئیں، دنگ سی رہ گئیں۔

ریکارڈنگ ختم ہوئی تو انہوں نے بے اختیار دوبارہ پلے کیا...... ایک، دو، تین، پورے چار بار انہوں نے گفتگو سنی کیونکہ ان کو ہمیشہ سے پارس پر شک تھا اور شک کی تصدیق ہمیشہ نئے سرے سے حیران کیا کرتی ہے، وہ دم بخود رہ گئی تھیں۔

ریکارڈنگ کے اثر سے وہ نکلیں تو بے اختیار فیضان کو فون ملایا۔

"فیضی...... فوراً میرے پاس آؤ، میرے پاس تمہیں دکھانے بلکہ سنانے کے لیے کچھ ہے۔"

فون پر بس یہی انہوں نے کہا تھا۔

☆☆☆

پارس کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تو ڈرائیور نے احترام سے دروازہ بند کیا اور خود آگے جا کر اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ گاڑی کے انجن کی حرارت کے ساتھ ہی پارس نے فون پر ایک نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگایا۔

پارس

"احسان صاحب...... مجھے کل کی پارٹی کے حوالے سے بات کرنی تھی۔"

"جی کہیے میم......"

"مجھے کچھ تبدیلی کرنی ہے فارمیٹ میں۔"

"میں سن رہا ہوں بتائیں۔"

پارس نے کہنا شروع کیا۔ اس نے ابھی تین فقرے ہی بولے تھے کہ ڈرائیور نے بے اختیار بیک ویو مرر میں اسے دیکھا۔ حیرانی اور اچنبھے سے۔ وہ بولتی گئی اور ڈرائیور بار بار اسے دیکھتا گیا۔

"آر یو شیور میڈم کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے؟" اس کی بات ختم ہوئی تو بہت دیر بعد احسان صاحب بول پائے۔

"مجھے نہیں یاد اگر میں نے اظہارِ رائے کی درخواست کی تھی۔ میں نے صرف عمل درآمد کا کہا تھا۔ خدا حافظ۔" اس نے موبائل رکھا اور کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

سویرا نے اسٹاپ کا بٹن دبا کر ریکارڈنگ بند کی۔ پھر سامنے بیٹھے فیضان کو دیکھا...... وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔

"یہ بھیجی کس نے ہے؟" وہ آنکھیں سکیڑ کر آپا کو دیکھتا پوچھنے لگا۔

"جس نے بھی بھیجی ہو، ہمیں کیا...... تم یہ تو دیکھو کہ ہمارے ہاتھ پارس کے خلاف اتنا بڑا ثبوت لگ گیا ہے۔" آپا جیسے اس کے سوال پر بدمزہ ہوئیں۔

"اونہوں...... سب سے اہم بات ہے کہ یہ کس نے بھیجی ہے؟ مجھے یہ ٹیلی فون کال نہیں لگ رہی ہے، سامنے بیٹھ کر بات کی گئی ہے مگر ان دونوں کے اتنے قریب کون ہو سکتا ہے جو ان کی گفتگو ریکارڈ کرے؟" وہ پُرسوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''فیضی، جو بھی ہو، ہمیں کیا......؟''

''نہیں، یہ کون ہے جو ہمارا اتنا ہمدرد ہے کہ ہماری یوں مدد کرے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟''

''وہ صرف ہماری مدد کرنا چاہ رہا ہوگا۔''

''مگر کیوں......؟ اس کا اس میں کیا فائدہ؟ یہاں بنا مفاد کے کوئی کچھ نہیں کرتا۔''

سویرا آپا کو اب غصہ آنے لگا۔ وہ کچھ اور بات کر رہی تھیں اور فیضان کچھ اور کہہ رہا تھا۔

''فیضی، تمہیں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ پارس کیا کہہ رہی ہے تم بھیجنے والے کے پیچھے پڑ گئے ہو؟''

''فرق تب پڑے گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ یہ اصلی ریکارڈنگ ہے۔'' وہ بے پروا انداز میں کہتا صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا جیسے اسے واقعی فرق نہ پڑتا ہو۔

''کیا؟ تمہیں یہ جعلی لگتی ہے؟'' سویرا آپا کو شاک لگا۔

''میرا نہیں خیال کہ پارس نے بھائی جی کو قتل کیا ہے مگر بالفرض یہ آڈیو اصلی ہے، تب بھی کوئی اتنی آسانی سے ان کی گفتگو کیسے ریکارڈ کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ......'' وہ جیسے خود بھی چونکا...... ''یہ......شاید شجاع نے کی ہو۔''

''کون شجاع......؟'' سویرا آپا بے اختیار آگے کو ہوئیں۔

''یہی جو اس میں بول رہا ہے، پارس کا کزن......لیکن اس کو یہ ہمیں دے کر کیا فائدہ ہوگا؟ اسے تو پارس کو پروٹیکٹ کرنا چاہیے کیونکہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، اس صورت میں وہ ساری دولت کا مالک بن جائے گا۔ وہ اپنے ہاتھ۔ آیا پارس یوں کیوں گنوائے گا؟''

''بس فیضی......!'' سویرا آپا کا ضبط جواب دے گیا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ ہمیں اس آڈیو کا کیا کرنا ہے؟''

''ہوں......'' اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ ''شجاع ہی ہے، یہ بھی یقیناً ہم سے کچھ چاہتا ہے۔ بہرحال، اس آڈیو کو ہم ابھی سنبھال کر رکھیں گے تاکہ وقت آنے پر استعمال کر سکیں۔''

سویرا آپا کے چہرے پر بدمزگی پھیلی۔ یہ ان کی توقع کے برخلاف تھا۔

''کیا ہم اس کو پارس کے حوالے نہ کریں۔ میرا مطلب ہے، ایک کاپی اس کو بھجوا نہ دیں تاکہ وہ جان لے کہ ہم اس کی حقیقت سے باخبر ہیں۔ اور......''

''آپا جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کریں، بس۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''کم از کم کل رات کی پارٹی تک آپ کچھ نہ کریں۔''

''کیوں، کل کی پارٹی میں اہم کیا ہے؟''

''بظاہر کچھ بھی نہیں مگر میری gut feeling کہتی ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ آخر پارس نے فیضان حیات کو مدعو کیا ہے، اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔''

وہ اٹھا تو سویرا نے بے اختیار اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

''تم کہاں چلے؟ کھانا کھا کر جاؤ۔''

''اونہوں! مجھے پارس کو کال کرنی ہے۔'' وہ موبائل پر نمبر ملاتا باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی سویرا نے اپنا فون اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

''حکم کیجیے میڈم جی!'' شکیل کا معنی خیز لہجہ سن کر وہ سلگ گئیں پھر ضبط کر لیا۔

''تمہاری تیاری مکمل ہے؟''

''جی......ایک دم مکمل......اگر......کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟'' ان کے لہجے سے جھلکتی پریشانی اسے پریشان کر گئی۔

''ہاں، ہمیں پارس کے خلاف کچھ ملا ہے۔''

''نہیں......؟''

''مطلب مجھے......''

''تو پھر؟ اسے نہیں مارنا؟''

سویرا نے ایک لمحہ، بس ایک لمحہ لیا سوچنے میں پھر بولیں۔

''ہمارا پلان نہیں بدلے گا، ویسے ہی آگے چلے گا جیسے ہم نے سوچا تھا۔'' ان کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ شکیل بشاشت ہو گیا۔

باہر لان میں کھڑا فیضان موبائل کان سے لگائے ٹہلتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''جی میم! میری ان سے بات ہو گئی تھی، آپ کا پیغام دے دیا ہے۔''

''گڈ...... انہوں نے آگے سے کیا کہا؟'' پارس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں...... خاموش ہو گئے، مزید کچھ نہیں۔'' وہ تابعداری سے پوچھنے لگا۔

''مجھے اُن کا جواب مل گیا ہے، مزید کچھ نہیں چاہیے۔ تھینکس!'' پارس نے کال کاٹ دی۔

فیضان نے آہستہ سے فون کان سے ہٹایا۔ وہ کچھ گہرے مخمصے میں الجھا تھا۔

☆☆☆

فیروزہ مائی نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ بستر کی پائنتی پہ بیٹھا شکیل نوٹ گن رہا تھا۔ ماں کو آتے دیکھ کر جلدی، جلدی نوٹ سمیٹے اور والٹ میں ڈالے۔ فیروزہ مشکوک نظروں سے دیکھتی اندر آئی۔

''اور تو کہتا ہے تیرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔''

''جھوٹ نہیں کہتا۔'' اس نے بدمزہ ہو کر کہتے ہوئے والٹ جیب میں ڈالا۔

''پھر یہ پیسے کہاں سے آئے؟''

''سویرا میڈم نے دیے ہیں۔''

کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ فیروزہ مائی کے چہرے پر مجرمانہ اضطراب پھیل گیا۔

''تو...... واقعی پارو......کو مارنے جا رہا ہے؟'' اور یہ کچھ فقرے فیروزہ مائی بھی ایک وقفہ میں ادا نہیں کر سکی تھی۔

''میں نہیں، ہم۔'' شکیل نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پُرعزم انداز میں دُہرایا۔ ''اور یاد رکھنا اماں، اگر پھنسے تو دونوں پھنسیں گے۔''

''اللہ نہ کرے......'' وہ دہل کر بولی۔

''تو بس فکر نہ کر اور دیکھتی جا کہ میں کیا کرتا ہوں۔'' اس نے بے نیازی سے کہتے ہوئے بازوؤں کا تکیہ بنا کر بیڈ کراؤن سے سر ٹکایا۔

''وہ سویرا......وہ مکر تو نہیں جائے گی کہیں؟''

''اس کی ایسی ہمت نہیں ہوگی۔ میں نے احتیاطاً اپنی اور اس کی ساری گفتگو ٹیپ کر رکھی ہے اگر اس نے مجھے ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی تو ساری عمر بھگتے گی۔''

''مگر......تو کیسے کرے گا...... یہ سب؟'' وہ ابھی تک فکرمند تھی۔

''شش...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں؟'' اس نے ماں کو تنبیہ کی...... فیروزہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

''بس تو کل شام کی پارٹی کا انتظار کر اماں۔'' وہ ٹیک لگائے چھت کو دیکھتا مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

فیروزہ مائی نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کا چہرہ اندیشوں سے بھرا تھا۔

☆☆☆

رات آئی، گزر گئی......سویرا آیا، اتر گیا اور پھر اگلی شام ڈوبنے لگی۔

اپنے چھوٹے سے بنگلے کے بالائی منزل کے کمرے میں کھڑے فائز نے آئینے کو دیکھتے ہوئے

سیاہ سوٹ کا آخری بٹن بند کیا، ٹائی کی ناٹ درست کی، بالوں کو آخری دفعہ برش کیا اور پرفیوم اٹھا کر گردن پر اسپرے کیا۔ محلول کے قطرے اڑے اور فضا میں بکھر گئے۔

اس نے چابی، موبائل اور والٹ اٹھایا، ایک نظر کھڑکی سے دکھائی دیتے پارس کے گھر پر ڈالی اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند میل دور، شہر سے ذرا فاصلے پر واقع رضوان حیات کے بڑے سے گھر کے ڈرائیو وے میں سویرا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ رہی تھیں۔ انہوں نے براؤن سلک کا نفیس لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ بال جوڑے میں باندھ رکھے تھے۔ چہرے پر عمر کے حساب سے میک اپ اور آنکھوں میں اعمال کے حساب سے اتری پریشانی واضح تھی۔

ڈرائیور نے کار کا دروازہ بند کیا اور اپنی جگہ سنبھالی۔

''ہوٹل جانا ہے۔'' کروفر سے کہہ کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگیں۔ ڈرائیور سر ہلا کر کار ریورس کرنے لگا۔

''میں اس پارٹی میں جا کر کیا کروں گی؟'' پارس کے گھر میں کھڑی تیار ہوتی فیروزہ مائی نے... بددلی سے کہتے ہوئے شکیل کو دیکھا جو کوئی پانچویں بار ڈریسنگ مرر کے سامنے کھڑے ہو کر پیلی شرٹ کا کالر گہرے نیلے کوٹ کے اوپر ٹھیک کر رہا تھا۔

''کیوں امی......؟ تو پڑھے لکھے لوگوں کی کمپنی میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کرتی ہے؟'' وہ ہنسا۔

''بکواس نہ کر، جلدی کر...... ٹائم ہونے والا ہے۔'' اس نے گھڑی کو دیکھتے ہوئے کانوں کے پیچھے اڑسا دوپٹا مزید سختی سے اڑسا۔ ''وہ میڈم صاحبہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی یا ہم اکیلے جائیں گے؟'' ساتھ ہی کھلے دروازے سے نظر آتی سیڑھیوں کو دیکھا۔

''ہمیں پہلے جانا چاہیے۔'' شکیل کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پہاڑ کی دوسری جانب سڑک پر ایک نیلی کار دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شجاع خاموش سا اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے کار چلا رہا تھا۔ اس کی کار کا رخ رائل ہوٹل کی جانب تھا۔ وہ خاموش تھا مگر طمانیت کے احساس سے لبریز...... پارس کی باتیں اب بھی اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔

☆☆☆

ڈرائیور شکیل اور فیروزہ کو ہوٹل چھوڑ کر واپس آچکا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کی سیڑھیاں اتری دکھائی دی...... سیاہ ساڑی اور سیدھی مانگ نکال کر جوڑے میں بندھے بال، کانوں میں سلور کی بالیاں، گردن میں ہیروں کا نازک ہار...... وہ اونچی ہیل سے پُراعتماد قدم اٹھاتی لمبی گردن تنے، کار میں آکر بیٹھی۔

''رائل ہوٹل، میم؟'' ڈرائیور نے کنفرم کرنے کو پوچھا۔

''نہیں...... تنویر صاحب کے گھر چلو۔'' متحکمانہ انداز میں کہہ کر اس نے رخ پھیر لیا۔ ڈرائیور نے حیرانی سے بیک ویو مرر میں اسے دیکھا پھر کار اسٹارٹ کی۔

وہ خاموش تھی، سارا راستہ خاموش ہی رہی، تنویر صاحب کا گھر بھی آبادی سے الگ تھلگ ایک سبز پہاڑی کے پُرپیچ راستوں کے اندر واقع تھا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں چند روز قبل افضل بابا نے آکر اس کے عزائم کی خبر دی تھی۔

آج ان کا برآمدہ خالی تھا۔

''میں دس منٹ میں آرہی ہوں۔'' کار رکتے ہی وہ تیزی سے نکلی اور اسی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ بنا رکے، بنا ٹھٹکے اس کے انداز میں ملکیت تھی جیسے وہ اکثر یہاں یونہی بے دھڑک داخل ہو جاتی ہو۔ البتہ اس کی آنکھوں میں جارحیت تھی، وہ

واضح تھا وہ جیسے ان کو کنفرنٹ کرنے آئی تھی۔

وہ اسٹڈی میں آرم چیئر پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے، ان کی دروازے کی سمت پشت تھی، جب وہ اندر داخل ہوئی، چند لمحے چوکھٹ میں کھڑے ہو کر ابلتے غصے پر قابو پایا پھر تیز آواز میں بولی۔

''آپ جانتے تھے وہ میرا اکاؤنٹس ایڈوائزر...... فیضان ہے مگر آپ نے مجھے نہیں بتایا؟''

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''آپ کو معلوم تھا کہ وہ فیضی ہے مگر سب کی طرح آپ نے بھی مجھ سے چھپایا۔ مت کہیے گا کہ آپ کو علم نہیں تھا۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ وہ ایک ہفتہ میرے ساتھ، میرے ارد گرد رہا ہو اور آپ جانتے نہ ہوں کہ وہ کون ہے؟''

انہوں نے ہنوز خاموشی برقرار رکھی۔ جیسے اس وقت اس کتاب سے زیادہ اہم کچھ نہ ہو۔ پارس کا لہجہ تیز ہونے لگا۔

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں......! آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ فائز دراصل آپ کا بھائی ہے، رضوان؟'' وہ اونچی آواز میں بولی تو... آرم چیئر پر بیٹھے رضوان حیات نے کتاب بند کی، عینک اتاری اور کرسی کا رخ پارس کی جانب موڑا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکرائے۔

''کیا ان سات ماہ میں تم یہ سمجھتی رہیں کہ میں فیضی کا امتحان لے رہا ہوں، پارس؟ اونہوں!'' انہوں نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

''میں تمہارا امتحان لے رہا تھا پارس۔''

پارس کے چہرے پر شاک ابھرا۔ بے یقینی، دھوکا دیا جانے کا احساس۔ اس نے بے اختیار بونٹ کو ہاتھ سے تھاما۔

''میرا...... میرا امتحان؟'' وہ بنا پلک جھپکے ان کو دیکھ رہی تھی۔

''مگر...... آپ نے کہا تھا کہ آپ یہ سب اس لیے کر رہے ہیں کہ...... کہ......'' وہ رک گئی۔ ادھوری باتیں سمجھ آنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اتری بے یقینی، صدمے میں بدلنے لگی۔

''فیضان...... فیضان یہاں کیوں آیا ہے، رضوان؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے عین سامنے آکھڑے ہوئے۔ اسٹڈی میں صرف ایک بتی اور ایک ٹیبل لیمپ کی روشنی پھیلی تھی۔ ان دونوں کے چہرے اسی روشنی میں آدھے تاریک، آدھے روشن تھے۔

''وہ تمہاری جان لینے آیا ہے۔''

پارس کی آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیل گئیں۔

''میں جانتی تھی۔ وہ کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔ میں نے اس رات بھی آپ سے یہی کہا تھا۔''

اس کے لبوں سے نکلے الفاظ ٹوٹ کر فضا میں بکھرتے گئے۔ ہر حرف کے ساتھ رنگ تھے۔ صوفی قوسِ قزح اور...... رنگین کمان دھیرے، دھیرے اسٹڈی کی ہر شے پہ چھانے لگی۔ بلیک اینڈ وائٹ اسٹڈی میں رنگ بھرنے لگے۔ گہرے سے ہلکے تک کا سفر اور ہلکے سے گہرے تک کی مسافت، سب آپس میں گڈمڈ ہونے لگے، یہاں تک کہ حال، ماضی بن گیا اور...... ماضی، حال میں تبدیل ہوتا گیا۔

☆☆☆

وہ دوپہر سفید تھی۔ سرما کے مری کی پہلی سفید دوپہر اسے یاد نہیں تھا کہ اس سے قبل اس سرما برف پڑی تھی کہ نہیں مگر اسے اتنا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حسین برف ملکہ کوہسار میں کبھی نہیں پڑی ہوگی۔

وہ ہوٹل کے ریسٹورنٹ کے باہر اوپن ائر کیفے میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں دور دکھائی

دیتے... سفید پہاڑوں پہ جمی تھیں۔ ایک رات کی برفباری نے ان کو بوڑھا کر دیا تھا۔ اس نے سوچا اور لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ کھلے بال شانوں پر ڈالے وہ بہت وقار سے ایک بازو کرسی کے ہتھے پر جمائے بیٹھی تھی۔ اس کا ہر انداز اندرونی خوشی کا غماز تھا یا شاید خوشی سے زیادہ یہ اطمینان تھا جو اس کے رگ و پے سے جھلک رہا تھا۔

''مسز رضوان!'' باوردی ویٹر اس کے قریب آ کر جھکا، وہ ذرا سی چونکی۔ پھر رکی سا مسکرائی اور استفسار سے ابرو اٹھائی۔

''آپ کے لیے ایک کال ہے۔'' ساتھ ہی کارڈلیس فون اس کی جانب بڑھایا۔

''رضوان ہیں؟ وہ فارغ ہو گئے؟'' فون پکڑتے ہوئے اس نے گردن اونچی کر کے دور نظر آتے ایڈمن بلاک کو دیکھا جہاں رضوان میٹنگ میں مصروف تھے۔

''نہیں، کوئی خاتون ہیں۔'' وہ ہلکا سا چونکی، پھر اچنبھے سے ہیلو کہتے ہوئے فون کان سے لگایا۔ ویٹر جھک کر کورنش بجا لاتا رخصت ہو گیا۔

''پارس میڈم؟'' کوئی عورت تیز لہجے میں طنزیہ بولی تھی۔

''جی فرمائیں...!''

''مجھے پہچانا تم نے؟''

''نہیں سوری...... میں......''

''بلکہ مجھے تم پہچان بھی کیسے سکتی ہو؟ مجھے تو اپنی دانست میں تم نے مکھن سے بال کی طرح بھائی جی کی زندگی سے نکال باہر کیا ہے، بہت مہارت سے تم نے پتے کھیلے اور بالآخر تم جیت گئیں۔ اپنی فتح کا جشن کیسے منا رہی ہو پھر......؟''

''جی؟ کیا مطلب......؟'' وہ حق دق سن رہی تھی۔ ذہن جیسے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

''میں سویرا امجد ہوں۔ رضوان حیات کی بہن مگر تم مجھے کیسے جان سکتی ہو؟ بھائی جی کو کبھی تم نے اجازت جو نہیں دی کہ وہ تمہیں ہم سے ملواتے۔'' زہر اگل رہی تھیں اور پارس، وہ زہر نہ چاہتے ہوئے بھی اندر اتارنے پر مجبور تھی اور اب وہی زہر اس کو نیلا کر رہا تھا۔

''مسز امجد، آپ کو کوئی غلط فہمی......''

''میری بات مت کاٹو...... میری بات کاٹنے کی ہمت آج تک بھائی جی کو نہیں ہوئی...... تو تم کون ہو؟'' وہ حلق کے بل چلائی تھیں۔ ''دو ٹکے کی نوکرانی جس کو اس کی ماں نے ہوٹل کے عوض بیچ دیا۔ تم کون ہو، کیا اوقات ہے تمہاری؟ ہمارے بھائی کو ہم سے چھین لیا، ہوٹل چھین لیا اب اور کتنا چھیننا چاہتی ہو؟ تمہاری وجہ سے، تمہاری وجہ سے آج بھائی جی نے مجھ سے ایسے بات کی جیسے میں...... میں ان کی کوئی دشمن ہوں۔'' وہ بلند آواز سے رو رہی تھیں۔ پارس صدمے سے گنگ رہ گئی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب احساسِ توہین نے اس کے گال دہکائے، کب آنکھوں کو بہایا اور کب پانی کے قطرے گردن تک لڑھکا دیے۔

''تم ہر چیز کی ذمے دار ہو، میں نہیں جانتی کہ تم نے ان کو کیسے مجبور کیا کہ وہ ہماری شکل دیکھنے سے بھی جائیں، وہ بھائی جو ہم پہ جان چھڑکتا تھا، آج اتنی سی خواہش پہ بھڑک اٹھا جب میں نے کہا کہ مری والا ہوٹل امجد کو سنبھالنے دیں۔ تم نے ان کو ہمارے خلاف بھڑکا کر ہم سے انہیں اتنا دور لا کھڑا کیا ہے کہ آج...... آج وہ مجھ پہ غصہ ہوئے، جو کبھی نہیں ہوا وہ آج ہوا اور اس کی وجہ تم ہو، صرف اور صرف تم......'' وہ غصے سے چلائی، اب ہانپنے لگی تھیں۔

دم بخود، بے آواز آنسو بہاتی پارس پل بھر میں ڈھائی ماہ پہلے کی پارو بن گئی تھی۔ ڈری، سہمی، بزدل، پارو...... اس کا دماغ ہر جواب، ہر دلیل سے خالی ہو گیا تھا۔ اس کا تو سارا دل ہی خالی ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ ہوٹل تمہارے نام کرنے والی بات انہوں نے مجھ سے جان چھڑانے کے لیے کی ہے یا واقعی تمہارے جادو نے ان کو اندھا کر دیا ہے مگر میں تمہیں ایک بات بتائے دے رہی ہوں پارس...... یا جو بھی نام ہے تمہارا۔'' وہ اب رو نہیں رہی تھیں، خطرناک لہجے میں وارن کر رہی تھیں۔ پارس کے جسم پہ چیونٹیاں رینگنے لگیں یا شاید وہ بچھو تھے جو ڈنک مار مار کر اسے نیلا کر رہے تھے۔

''میرے شوہر کو یہ ہوٹل چاہیے اور میں اپنی بات بدلنے والوں میں سے نہیں ہوں، میری ضد ہے اب یہ ہوٹل...... مجھے یہ چاہیے اور تم...... ہاں تم مجبور کرو گی بھائی جی کو یہ کرنے پر...... اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھنا، میں تمہارے ساتھ وہ کروں گی کہ تمہاری سات نسلیں پناہ مانگیں گی بلکہ نسل تو تب چلے گی جب بھائی جی تمہارے ساتھ ہوں گے اور ان کو میں تمہارے ساتھ رہنے ہی نہیں دوں گی۔ کسی قیمت پر نہیں پارس میڈم...... تم مجھے ابھی جانتی نہیں ہو۔ خدا، ان کی جوانی کی محبت جب میرے سامنے نہ ٹک سکی تم تو پھر بڑھاپے کی بے وقوفی ہو۔'' وہ غصے میں تیز، تیز بول رہی تھیں۔

''وہ تم سے ایسے دور ہوں گے کہ تم ان کی شکل دیکھنے کو بھی ترسو گی، اس لیے یا تو وہ کرو جو میں نے کہا ہے یا پھر اپنی ماں سے کہو تمہارے لیے کوئی اور بڈھا ڈھونڈ لے، جس کے ہاتھ وہ تمہیں بیچ آئے کیونکہ اگر تم میری بات مان جاؤ تو شاید میں تم پہ رحم کھا لوں اور تمہیں بھائی جی کے ساتھ رہنے دوں لیکن دوسری صورت میں مجھ سے کسی رعایت کی امید مت رکھنا۔''

فون کھٹ سے بند ہوا، ایسے جیسے کھٹ سے آری کسی کی گردن پر چل جاتی ہے۔ وہ سُن سی وہاں بیٹھی تھی۔ بوڑھے پہاڑوں نے آواز دی مگر اس

شاعروں کی برتھ کنٹرول

شاعر پیدائشی ہوتے ہیں اور یہی مسئلہ ہے۔ شاعروں کی افزائشِ نسل کے لیے مشاعرے کھاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پر پابندی دراصل شاعروں کی برتھ کنٹرول ہے۔

نثار اکبر آبادی کہتے ہیں مشاعروں میں شعر پڑھنے کی نسبت کتابی شکل میں چھپوانے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس طرح چوٹ لگنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ ایسے شاعر ہیں کہ ایک مشاعرے میں اسٹیج پر آئے تو لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ''میں نے تو ابھی شعر سنایا ہی نہیں اور آپ داد دے رہے ہیں۔'' تو حاضرین نے کہا۔ ''اسی لیے تو داد دے رہے ہیں۔'' ایک ایسے ہی شاعر کے دوست کی مشاعرے میں جوتی گم ہو گئی۔ شاعر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے اسٹیج پر جا کر شعر سنانے کی دیر ہے، خود ہی مل جائے گی۔'' ویسے مشاعروں میں شعر سنانا اتنا مشکل نہیں جتنا شعر نہ سنانا پھر مشاعرہ دراصل شاعروں کے آپس میں مل بیٹھنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ چنڈت ہری چند اختر اور عبدالحمید عدم مشاعرے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دیر تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اس دوران عدم صاحب موٹے ہو گئے۔ ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تو اختر انہیں پہچان نہ سکے۔ انہوں نے پنڈت جی سے کہا۔ ''پہچانا نہیں؟ عدم ہوں۔'' پنڈت جی نے انہیں دیکھا اور بولے۔ ''اگر تم واقعی عدم ہو تو وجود کیا ہو گا؟'' جتنے زیادہ مشاعرے ہوں گے، شاعروں کی اتنی ہی پہچان ہو گی۔ اب تو سیلف سوسائٹیاں پر بھی مشاعرے ہونے لگے ہیں۔ شاعر تاریخ میں ہو تو ہم اسے اوتار سمجھتے ہیں اور اگر ساتھ والے کمرے میں ہوں تو مذاق اور وہ جس گھر میں ہوتا، وہاں اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ بہر حال وہ جس گھر میں ہو، وہاں چوری نہیں ہوتی۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس گھر میں چرانے کے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ مشاعرہ شاعروں کے لیے مشاہرہ ہوتا ہے۔ یوں مشاعروں پر پابندی دراصل ان کے روزگار پر لات مارنا ہے۔

انتخاب: مزاحیات، ڈاکٹر یونس بٹ
پسند: نگہت آصف، اسلام آباد

نے نہیں سنی۔ پھر پانی کے دانے گریبان بھگونے لگے تو وہ چونکی اور ایک دم کھڑی ہوگئی۔

کانفرنس روم میں رضوان تنہا بیٹھے تھے، سامنے ایک فائل کھلی رکھی تھی اور وہ اسے بے توجہی سے دیکھ رہے تھے جب پارس مُردہ قدموں سے چلتی اندر داخل ہوئی۔

انہوں نے استقبالیہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی مگر وہ سرخ، متورم آنکھیں لیے ان کے مقابل بیٹھی۔ جیسے کوئی مرا ہوا آدمی کھڑے سے بٹھادو، رضوان نے تشویش سے اسے دیکھا۔

''پارس، تم ٹھیک تو ہو؟'' ساتھ ہی اس کا ہاتھ چھوا۔

''آپ ہوٹل امجد صاحب کے نام کردیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور آج کا سورج غروب ہونے سے قبل یہ ہوجانا چاہیے۔'' اس کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔ رضوان بری طرح چونکے۔

''کون امجد؟'' انہوں نے پرکھنا چاہا۔

''آپ جانتے ہیں، میں کیا بات کررہی ہوں رضوان، مجھے نہیں پتا کہ آپ کی اور مسز سویرا کی کیا بات ہوئی ہے مگر میری اُن سے جو بات ہوئی ہے اس کے بعد مجھے کسی ہوٹل کی خواہش نہیں رہی۔''

''پارس، مجھے پوری بات بتاؤ، کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ دونوں اب بالکل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''کیا آپ نہیں جانتے کہ کیا ہوا ہوگا؟ بلکہ نہیں، مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے کیونکہ وہ غلط نہیں ہیں، میں واقعی آپ کو ان کے خلاف بھڑکاتی ہوں، مجھے کبھی بھی ان کے بارے میں اپنی رائے نہیں دینی چاہیے تھی۔'' وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔ رضوان نے تشویش سے اسے دیکھا۔

''تم غلط نہیں کہتیں، میں ان کا غلط دفاع کرتا ہوں، میں جانتا ہوں... مگر میری بات سنو پارس، میں تم سے ان کی طرف سے معافی مانگتا ہوں، بھول جاؤ ان کی باتوں کو۔''

''بھول جاؤں؟'' اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ ''کیسے بھول جاؤں اپنی ذات کی بکھری دھجیاں؟ انہوں نے دو منٹ میں مجھے یوں بے مول کردیا ہے...... جیسے میں......'' آنسوؤں نے اس کا گلا بند کردیا تھا۔ وہ زاروقطار رونے لگی تھی۔

''کسی کے ہمیں برا کہہ دینے سے نہ ہم برے ہوجاتے ہیں، نہ وہ اچھے۔ اپنی زبان سے ہر شخص اپنا ظرف دکھاتا ہے، دوسرے کا عکس نہیں، تم اس کی بات کو دل پر مت......'' رضوان کے موبائل کی گھنٹی نے انہیں بات مکمل کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے عجلت میں فون کان سے لگایا۔

''فیضی میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں بیٹا۔'' پارس ایک دم ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہوئی۔

''میں نے کہا ناں میں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' اپنی بات دُہرا کر انہوں نے بیزاری سے فون رکھا۔

''آپ کرلیں اس سے بات، ورنہ ایک دفعہ پھر مجھ پر الزام آئے گا۔'' تلخی سے کہتی وہ جانا چاہتی تھی مگر انہوں نے زبردستی اسے ہاتھ سے پکڑ کر واپس بٹھایا۔

''تم ہرٹ ہوئی ہو میں جانتا ہوں مگر اس بات کو دل......'' وہ کہتے، کہتے ایک دم رکے۔ فون بند کرنے اور پارس کو دوبارہ بٹھانے کے بعد ان کا رخ ذرا بدلا تھا اور ان کی نگاہ شیشے کی دیوار گیر کھڑکی سے پارکنگ تک گئی تھی۔

''فیضی......؟'' ان کی آنکھوں کی پتلیاں حیرت سے سکڑیں۔

پارس نے چونک کر ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ رضوان کھڑے ہوئے تو وہ بھی کھڑی ہوئی۔ نیچے سڑک ویران تھی، سوائے ایک ریورس ہوتی کار کے جس کے ڈرائیور نے کار چلاتے ہوئے تیزی سے دروازہ بند کیا تھا۔ رضوان نے غالباً اسے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پارس کے چہرے پر آنسو ایسے ہی ٹھہرے تھے، اس نے بے اختیار رضوان کو دیکھا۔ وہ حیرت سے نیچے دیکھ رہے تھے پھر ایک دم وہ مڑے اور تیز قدموں سے باہر کو لپکے۔

وہ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی، آنسو بے دردی سے رگڑے اور نیچے دیکھا۔

وہ کار اب دور جارہی تھی۔ وہ ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکی تھی۔ بس کپڑوں کے رنگ کی جھلک دیکھی تھی۔ بوڑھے پہاڑوں کا رنگ...... چند ساعتوں بعد رضوان گیٹ پر بھاگتے ہوئے آئے اور سڑک پر دائیں بائیں سر گھما کار اب وہاں نہیں تھی۔ وہ اب عجلت بھرے انداز میں گارڈ سے کچھ پوچھ رہے تھے پھر وہ فون ملانے لگے۔ بار بار فون نیچے کرتے اور پھر سے ملاتے جیسے اُن کی کال مسلسل کاٹی جارہی تھی۔ وہ پلکیں سکیڑ کر سارا منظر دیکھتی رہی۔ کچھ منٹ لگے رضوان کو واپس آنے میں۔ اور وہ تھکے، تھکے لگ رہے تھے۔

''وہ فیضی تھا، وہ نیچے آیا تھا، میں سمجھا وہ امریکا میں ہے، اس کا نمبر رومنگ پر تھا۔ اب ناراض ہے شاید۔'' بات کرتے ہوئے وہ اسے نہیں دیکھ رہے تھے، مسلسل کال ملائے جارہے تھے...... پھر شاید اس نے فون ہی بند کردیا کہ انہوں نے کوشش ترک کردی تھی۔

پارس خاموش ہوگئی، بالکل خاموش...... وہ ساری شام ساتھ رہے، حتیٰ کہ رات اترنے لگی۔ رضوان اس دوران ہر دس منٹ کے وقفے سے فیضی کا موبائل ٹرائی کرتے پھر مایوسی سے سر ہلا کر فون رکھ دیتے۔ پارس نے ان سے کوئی بات نہیں کی، وہ چپ رہی، واپسی پر وہ گھر اترنے کے بجائے پارک کی سیڑھیوں کے پاس اتر گئے۔

زینوں پہ برف جمی تھی۔ رضوان نے اپنی ہُڈ والی جیکٹ پہن لی تھی اور اس نے اپنا اوورکوٹ...... ہلکی ہلکی برف پھر سے گرنے لگی تھی۔

''سردی ہے، گھر چلیں؟'' وہ بالآخر بولی تو بس اتنا...... انہوں نے نہیں سنا، اوپر چڑھتے رہے۔

''وہ مجھ سے ناراض ہے، مجھے اس کی بات سننی چاہیے تھی۔'' وہ خود سے کہہ رہے تھے۔

''ہُنہہ!'' اس نے گہری سانس لی، فیضان کے خلاف کدورت مزید بڑھی۔

''وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا؟ تنویر، خواجہ صاحب، اس کے دوست سب سے پوچھ لیا مگر کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اِدھر ہے، وہ بنا بتائے آیا ہے، اس جگہ کے راستے بھی نہیں جانتا، رَش ڈرائیو کرتا ہے، میں اس سے کیسے رابطہ کروں؟'' وہ اب بھی اس سے بات نہیں کررہے تھے تیز ہوا کے جھونکے سے ہُڈ گر کر ان کی گردن کی پشت پر آگیا تھا۔

''آپ کو یقین ہے کہ وہ وہی تھا؟''

''میں نے اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہے، کیا میں ہی نہیں جانوں گا کہ وہ وہی تھا یا نہیں؟'' وہ خفا ہوئے۔ پارس نے ہلکے سے شانے اچکائے...... وہ دونوں اوپر پارک میں پہنچ چکے تھے۔

کیئر ٹیکر گلاس کی دیوار کے اندر کمرے میں بیٹھا نظر آرہا تھا، اس نے ان دونوں کو دیکھ کر ذرا حیرت، ذرا شناسائی سے ہاتھ ہلایا کہ موسم خراب تھا مگر دونوں نے جواب نہیں دیا۔ وہ خود میں الجھے تھے اور الجھتے ہی رہے۔

''میں اس سے کیسے رابطہ کروں؟'' وہ ایک دفعہ پھر اس کا نمبر ٹرائی کررہے تھے۔ پارس اکتا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''وہ مجھ سے بہت خفا ہے۔'' وہ افسوس سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چل رہے تھے، ایک دم جھکے

سے رکے۔ جیسے ان کو کسی نے پیچھے کھینچا ہو، پارس کے لبوں سے دبی، دبی چیخ نکلی۔

رضوان کی بڈ باز کی نوکیلی سلاخ سے الجھی تھی اور قدم آگے بڑھانے کے باعث وہ چر گئی تھی شکر کہ وہ بروقت سنبھل گئے تھے۔ پارس نے جلدی سے ان کی بڈ سلاخ کی نوک سے چھڑائی...... وہ درمیان سے یوں پھٹی تھی کہ سوراخ ہو گیا تھا۔

''آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟''

''جی نہیں......'' وہ پھر سے الجھے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پارس کے ابرو تن گئے، آنکھوں میں غصہ پھر عود آیا۔

''آپ اس کی پروا کیوں کر رہے ہیں جو آپ کی نہیں کرتا؟''

''وہ میرا بھائی ہے۔'' انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''میں آپ کو اس کے خلاف نہیں کر رہی مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو جو یوں گم جائے گا؟'' وہ غصے میں ہاتھ ہلا کر تیز، تیز بول رہی تھی۔

''سب ٹھیک ہے سر؟'' کیئر ٹیکر ان کے بڈ کے اڑنے کا منظر دیکھ کر بھاگا چلا آیا مگر پارس نے ہاتھ جھلا کر اس کو جانے کا اشارہ کیا۔

''مجھے اس کی فکر ہے پارس......''

''اور میں کدھر ہوں؟ سویرا ٹھیک کہہ رہی تھیں، وہ دونوں آپ کو مجھ سے چھین سکتے ہیں اور آج میں نے دیکھ بھی لیا کہ ان دونوں کی ناراضی میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مجھے آپ سے دور کر سکیں۔''

رضوان نے سنا نہیں، وہ پھر سے نمبر ملانے لگے۔ کان پہ لگاتے ہی ان کے چہرے پر امید جاگی۔ گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ بے تاب سنتے رہے۔ پارس بھی رک کر ان کو بغور دیکھنے لگی۔ وہ جو بھی تھے گا، اس کا transcription...... اُسے رضوان کے چہرے پہ نظر آ جاتا تھا۔

مگر ابھی اس سے کچھ کہا بھی نہیں تھا فون بھی نہیں اٹھایا تھا کہ رضوان کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔ وہ سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑے تھے جہاں سے پوری سڑک دکھائی دیتی تھی۔ دور سڑک کے اس طرف ایک سفید کار کھڑی تھی۔ وہاں کوئی کار سے ٹیک لگائے سر جھکائے کھڑا تھا۔

برف کے گالے گر رہے تھے، ہوا تیز ہو رہی تھی۔ پارس نے سوالیہ نظروں سے رضوان کو دیکھا۔ اسی پل وہ تیزی سے ہیلو بولے۔

''کیوں فون کر رہے ہیں آپ مجھے؟ میں کون ہوں آپ کا؟'' پارس نے نہیں سنا مگر فیضی کہہ رہا تھا۔

''فیضی، تم ادھر آئے ہو، مجھے نہیں پتا تھا بیٹے، تم......''

''میں کہاں ہوں، اس سے فرق نہیں پڑتا میں کون ہوں اس سے بھی نہیں کیونکہ میں آپ کا کچھ نہیں لگتا، مجھے آج آپا کی ساری باتیں سچی معلوم ہو رہی ہیں۔ وہ ٹھیک تھیں آپ نے اس گھٹیا عورت کی وجہ سے ہمیں بھلا دیا ہے آج اس کی وجہ سے اپنے دروازے پر آئے کھڑے بھائی کو آپ نے دھتکارا ہے۔''

''فیضی...... میری بات سنو، میں تمہارا بھائی ہوں، ساری زندگی تمہارے سر پر سائے کی طرح رہا ہوں۔'' وہ بے یقینی سے کچھ بولنے کی سعی کر رہے تھے۔

''تو نہ رہتے، بے شک تب نہ رہتے مگر اب یوں نہ کرتے، آپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے، اب آج سے آپ میرے کچھ نہیں لگتے۔ آپ اور میں ایک دوسرے کے لیے مر گئے ہیں، میں نے سنا تھا شادی کے بعد لوگ بدل جاتے ہیں مگر اتنے بدل جاتے ہیں یہ نہیں جانتا تھا۔ بھائی جی اب مجھے فون مت کیجیے گا اور اگر میں مر جاؤں تو میرے جنازے پر بھی نہیں آئیے گا کیونکہ میں جتنا آج اکیلا ہوا ہوں، پہلے کبھی نہیں ہوا، سنا آپ نے؟ میرے جنازے پر بھی مت آئیے گا۔'' ساتھ ہی فیضان نے کار کی کھڑکی پہ زور سے مکا مارا۔ وہ غصے میں ایسے ہی کیا کرتا تھا۔ چھناکے کی ذرا سی آواز تیز ہواؤں کے شور میں دب گئی تھی۔ رضوان نے وہ سنا بھی تھا اور دیکھا بھی...... پارس صرف رضوان کو دیکھ رہی تھی۔

''فیضی، تم ایسے نہیں کر سکتے۔'' وہ بالکل بے یقین تھے۔

''میرا نام بھی مت لیں، مجھے آج آپ سے نفرت محسوس ہوئی ہے بھائی جی...... آپ بھی وہی جوان بیوی کے غلام مرد نکلے...... کم از کم آپ کا جو امیج میں نے ذہن میں بنا رکھا تھا وہ ایسا نہیں تھا۔'' اس نے دروازہ کھولا، شیشے کے چند ٹکڑے سڑک پر گرے، چند اندر وہ پروا کیے بنا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس سڑک پر ہے، وہ دوپہر سے ہوٹل کے اطراف کی سڑکوں پر پھر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رضوان کا گھر یہیں ہے اور یہ تو...... ہرگز نہیں کہ اس اونچے پارک سے اطراف کی چاروں سڑکیں دکھائی دیتی ہیں۔

''فیضان، سنو، میری بات سنو......'' فون بند ہو چکا تھا۔ وہ ایک دم سیڑھیوں کی جانب لپکے پارس ان کے پیچھے بھاگی۔

''رضوان آرام سے، برف ہے۔''

مگر وہ تیز تیز، بدحواسی سے زینے اترنے لگے۔ برف سلپری تھی اور تیسرے زینے پر اس کی پھسلن نے رضوان کا پاؤں لڑکھڑا دیا۔ وہ ایک دم پھسلے اور پھر لڑھکنے لگے۔ سفید کار اب سڑک کا موڑ کاٹ کر دور جا چکی تھی۔ وہ چیختی ہوئی ان کے پیچھے بھاگی، اوپر سے کیئر ٹیکر بھی انہیں پکارتا، دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ رضوان سیڑھیوں کے دہانے پر جا گرے۔

بارس

خون کی بوندیں ان کے سر سے نکلیں اور ارد گرد تالاب بنانے لگیں۔ اس نے بدحواسی سے چلاتے ہوئے ان کا سر اپنے ہاتھوں پر اٹھایا۔ وہ خون میں نہا رہے تھے مگر ان کی آنکھوں میں وہی بے یقینی تھی۔

''فیضی...... ایسے نہیں کر سکتا......'' وہ اب بھی وہیں تھے۔

''میں گاڑی کا انتظام کرتا ہوں۔'' کیئر ٹیکر واپس اوپر کو بھاگا۔ پارس کو صرف لفظ گاڑی سمجھ آیا۔

''میں...... بابا کو بلاتی ہوں۔ رضوان آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں......'' وہ اسی بدحواسی سے سامنے گھر کی سمت دوڑی۔

افضل بابا چند منٹ بعد ان کو اسپتال لے جا رہے تھے۔ پارس نے اپنا کوٹ اتار کر رضوان کے زخم پر رکھ دیا تھا۔ مگر خون بہے جا رہا تھا۔ ان کا سر پھٹا تھا۔ اور اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

''رضوان......'' آنکھیں کھولیں، مجھ سے بات کریں۔'' وہ روتے ہوئے بار بار ان کو پکار رہی تھی۔ وہ ہوش کھو رہے تھے مگر ان ابھرتی ڈوبتی سانسوں میں یہی ایک فقرہ ان کے لبوں پر تھا۔

''فیضی سے کہنا...... میرے جنازے پر آ جائے۔''

''بابا جلدی چلاؤ، تیز!''

وہ بالکل بدحواس ہو چکی تھی۔ گھبراہٹ، بوکھلاہٹ، ڈر...... اس نے اسپتال پہنچتے ہی تنویر صاحب کو فون کیا اور وہ فوراً بھاگے چلے آئے۔ رضوان کو آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔ اسپتال ان کے ہوٹل سے ذرا دور تھا۔ اس لیے پہنچنے میں دیر لگی۔ آدھے راستے بعد ہی رضوان بے ہوش ہو گئے تھے۔ افضل بابا اور پارس وہیں باہر بیٹھ گئے۔ بابا پریشان تھے اور وہ شاکڈ تھی۔ بس بینچ پر بیٹھی رہی۔ جیسے ہوش و حواس کھو دیے ہوں۔ لٹی لٹی سی پارس......

تنویر صاحب کے آنے سے قدرے ڈھارس ملی۔ وہ ان کو دیکھ کر رونے لگی۔

"رضوان ٹھیک تو ہو جائیں گے ناں؟" وہ بار بار ان سے پوچھتی، وہ کوئی جواب نہ دے پاتے۔ افضل بابا کو انہوں نے گھر بھیج دیا تاکہ وہ جا کر فیروزہ مائی کو بتا دیں اور لے آئیں۔

اسی اثنا میں رضوان کو بالآخر ہوش آیا۔ وہ مزید صبر نہیں کر سکتی تھی۔ بلانے پر اندر چلی آئی۔ ان کا سر پٹیوں میں جکڑا تھا۔ بایاں بازو فریکچر ہوا تھا، کمر پہ شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان کو کمر کے آپریشن کی ضرورت ہے جس کے لیے انہیں باہر لے جانا ہوگا۔ فی الوقت وہ خیریت سے تھے خاموش تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔

"میں بہت ڈر گئی تھی۔" ان کو اپنی جانب دیکھتے پا کر اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے۔

"فیضان نے کہا تھا کہ وہ میرے جنازے پر نہیں آئے گا۔" ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے پہلے الفاظ یہ تھے۔ پارس کو جیسے صدمہ لگا۔

"آپ کو اب بھی اس کا خیال ہے؟ رضوان وہ...... وہ آپ کو چھوڑ کر جا چکا ہے...... آپ مت سوچیں اس کے بارے میں۔"

"وہ فیضی تھا...... وہاں سڑک پر...... اس نے مجھے نہیں دیکھا......" وہ رک رک کر بول رہے تھے چھت کو دیکھتے ہوئے جیسے وہ وہاں تھی ہی نہیں...... "میں اسے روکنے جا رہا تھا...... اس نے مجھے نہیں دیکھا۔"

"اگر وہ وہی تھا تو آپ کی اس حالت کا وہی ذمے دار ہے اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں اسے جان سے مار دیتی۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔

"پارس!" انہوں نے تھکی، تھکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ ان کے بستر کے ذرا قریب آئی۔

"کیا تم میری ایک بات مانو گی؟"

"جی بتائیں۔" اس نے آنسو رگڑے۔

"تنویر کو اندر بھیج دو اور پھر وہ جیسے کہے ویسے کرنا۔"

"مگر...... اچھا......" اس نے زیادہ حجت نہیں کی۔ ان کو اندر بھیج کر خود باہر آ گئی۔ کافی دیر بعد تنویر صاحب باہر نکلے۔

"کیا ہوا......؟" وہ ان کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔

"رضوان بھائی کی جان کو خطرہ ہے۔"

"مگر...... ابھی تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ وہ stable ہیں۔" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"اونہوں...... اس چوٹ سے نہیں...... بلکہ سویرا اور ماجد سے۔"

"کیا مطلب؟"

"سویرا اور ماجد کچھ دن تک پاکستان آ رہے ہیں اور ان کے ارادے درست نہیں ہیں، انہوں نے رضوان بھائی کے پرانے وکیل سے بھی رابطہ کیا ہے وہ ساز باز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے انداز سے لگتا ہے جیسے وہ رضوان بھائی کی موت کی جلد توقع کر رہے ہیں۔ ان حالات میں ان کے لیے رضوان بھائی کو مارنا اور بھی آسان ہوگا۔"

"میں...... میں ہوٹل ان کے نام کر دوں گی۔ پلیز، ان سے ہماری جان چھڑا دیں۔" وہ پھر سے رونے کو آ گئی۔

"نہیں مسز پارس، آپ کو یہ نہیں کرنا بلکہ آپ کو وہ کرنا ہے جو میں نے اور رضوان بھائی نے طے کیا ہے ہمیں کچھ عرصے کے لیے رضوان بھائی کو علاج کے لیے باہر بھیجنا ہے اور تب تک ہمیں، ان کی سیکیورٹی کے لیے یہ ظاہر کرنا ہے کہ......" وہ ذرا دیر کو رکے پارس بے قرار نظروں سے ان کو دیکھتی رہی تھی۔

"کہ...... ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"کیا......؟" وہ ششدر رہ گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ ہم ان کی سیکیورٹی سخت کر سکتے ہیں، ان کے لیے اور بھی اقدامات کر سکتے ہیں مگر وجہ صرف یہ نہیں ہے، رضوان بھائی کچھ عرصے

کے لیے منظرِ عام سے غائب ہونا چاہتے ہیں۔ آج کے واقعے کا ان کے ذہن پر گہرا اثر ہے...... وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ مر جائے تو...... آپ کے ساتھ ان کے رشتے دار کیا کرتے، وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی جائداد کس کے لیے چھوڑ کر جائیں۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد کون ان کے لیے کیا کرتا ہے۔"

پارس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔

"وہ فیضی کو آزمانا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ فیضی ان کے لیے آتا ہے یا نہیں...... مگر یہ کھیل وہ کب تک کھیلنا چاہتے ہیں؟"

"بس یہ چند ماہ جب تک کہ ان کا علاج مکمل نہ ہو جائے۔ تب تک میں سویرا اور ماجد کے پیپرز میں امیگریشن والوں کے لیے کچھ سوالات چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔ آپ فون پر رضوان بھائی سے رابطے میں رہیں گی۔ وہ جتنی رقم بتائیں آپ کو میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنی ہوگی تاکہ ان کا علاج ہو سکے۔"

"اور...... اور کیا لوگ سوال نہیں کریں گے؟"

پارس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ وہیں بینچ پہ ڈھے سی گئی۔

"آپ یا تو اپنے شوہر کی فکر کریں یا لوگوں کی، مسز پارس۔" تنویر صاحب نے جذبات سے عاری انداز میں کہا۔ "لاش کا انتظام میں کروں گا تابوت، تالا بند ہوگا آپ کہیں گی کہ لاش کی حالت خراب ہے اس لیے وہ پٹیوں میں جکڑی ہے۔ ٹوٹے شیشے سے آدھا چہرہ کوئی نہیں پہچانے گا۔ آپ نے سب کو کہنا ہے کہ وہ سیڑھیوں سے گرے تھے۔ البتہ میں اپنے طور پر فیضان کو یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان کے سر کی پچھلی طرف کسی نوکیلی چیز کا نشان تھا۔"

"وہ کیوں......؟" وہ چونکی۔

"تاکہ فیضان اور سویرا یہ خیال کریں کہ میں ان کا وفادار ہوں اور ان کو رضوان بھائی کے سو کالڈ قتل کی سازش سے آگاہ کر رہا ہوں۔"

"تو آپ کس کے وفادار ہیں؟" اس نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"میں صرف رضوان بھائی کا وفادار ہوں۔" وہ پہلی بار ذرا سے مسکرائے۔

"اور یہ سب کچھ انہوں نے مجھے خود کیوں نہیں کہا؟" بہت دیر بعد وہ بولی۔

"کیونکہ آپ بحث بہت کرتی ہیں۔" پارس نے تلملا کر انہیں دیکھا مگر ضبط کر گئی۔

"کیا میں ایک دفعہ ان سے مل سکتی ہوں؟"

"نہیں...... ان کو شفٹ کیا جا رہا ہے، مکمل راز داری کے لیے ضروری ہے کہ آپ یہ فرض کر لیں کہ وہ واقعی......" انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں افضل بابا آتے دکھائی دیے ساتھ میں فیروزہ مائی بھی تھی۔

"کیا ہوا بڑے صاحب کو؟"

"وہ سیڑھیوں سے گر گئے تھے، ہم اسپتال لائے ڈاکٹرز نے بہت کوشش کی مگر ان کا دراصل آدھے راستے میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔" تنویر صاحب بتا رہے تھے وہ جانتی تھی کہ اگلے چند ماہ اب تنویر صاحب ہی تمام نشانات کو مٹانے میں لگے رہیں گے۔

وہ بالکل ماؤف ذہن کے ساتھ واپس آئی تھی۔ فیروزہ مائی رو رہی تھی۔ بہت اونچی آواز میں اور اسے بھی رُلانے کی سعی کر رہی تھی مگر اس کی سرخ آنکھیں خشک تھیں۔ وہ ابھی تک ششدر تھی۔

گھر سے قریب وہ اسی جگہ اتری جہاں گزشتہ رات وہ سفید کار کھڑی تھی۔ وہاں برف پر اب بھی شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس نے ایک بڑا ٹکڑا اٹھا لیا اور اپنے پرس میں اسی طرح محفوظ کر لیا جیسے

فیضان کے لیے نفرت اندر مقید تھی۔

برف نے اسے یہ کرتے ہوئے دیکھا مگر خاموش رہی...... بہت عرصے بعد وہ اس بیوہ پہ روئی جس کا شوہر مرا نہیں تھا اور جب وہ روئی تو پگھل کر جھرنوں میں بہہ گئی۔ یہاں تک کہ پہاڑوں کا بڑھاپا ڈھل گیا اور جوانی پھر سے اپنے جوبن پر آپہنچی۔ سات رنگوں کی کمان نے روشنی کی رفتار سے اپنا سفر طے کیا، یہاں تک کہ وہ دو آدھے روشن اور آدھے تاریک چہروں کے ساتھ آن ٹھہری جو اس اسٹڈی روم میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''میں نے اس رات بھی کہا تھا، اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو آپ کی موت کا ذمے دار فیضان ہوتا...... وقت نے ثابت کر دیا کہ میں ٹھیک تھی۔''

''کیا واقعی......؟'' انہوں نے ابرو اٹھائی۔

''آپ اب بھی اس کی حمایت کرنا چاہتے ہیں؟ تو ٹھیک ہے، آپ آج دیکھیے گا سویرا وہ تھیں جو آپ کو مارنے آرہی تھیں، فیضی وہ ہے جو مجھے مارنے آیا ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، آج میں آپ کو دکھاؤں گی کہ فیضی کیا ہے۔''

رضوان نے دھیرے سے شانوں کو اچکایا۔

''میں تیار ہوں، تم جو کرنا چاہو کر سکتی ہو، میں تمہیں اتنا ہی مضبوط دیکھنا چاہتا تھا اور وہ میں دیکھ رہا ہوں۔ آگے، تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔''

پارس نے گہری سانس لے کر خود کو جیسے کمپوز کیا اور مسکرائی۔

''ٹھیک ہے...... پھر میں پارٹی میں جا رہی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ وہاں فائز نہیں، فیضان آیا ہوگا۔ آپ نے بھی مجھ سے چھپایا، حالانکہ سویرا کی آمد کا آپ نے تنویر صاحب سے سنتے ہی مجھے بتایا تھا مگر فیضان کو آپ نے ہمیشہ پروٹیکٹ کیا...... لیکن آج دیکھیے گا کہ میں اس کے بارے میں صحیح کہتی تھی...... سارے بہن، بھائی ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ رضوان مسکراتے ہوئے اس کو جاتا دیکھتے رہے۔

☆☆☆

ہال کمرے کی سجاوٹ نہایت خوب صورتی سے کی گئی تھی۔ پھولوں کی مہک اور روشنیوں کی چکا چوند...... عموماً اس پارٹی کے لیے دوسرے ہال مختص کیے جاتے تھے مگر پارس کی آخری منٹ کی تبدیلی کا ایک حصہ پارٹی کے دعوت نامے کینسل کر کے اس چھوٹے ہال میں تمام ارینج منٹ کروانا تھا۔

اور نشستیں بھی اتنی لگائی گئی تھیں جتنی کی اس نے تاکید کی تھی۔

دو، دو کرسیوں کی چار میزیں...... کسی کے نام نہیں لکھے تھے، پھر بھی فیروزہ مائی، شکیل کے ہمراہ بیٹھی تھیں اور سویرا تنہا۔

ایک میز پر تنویر صاحب اور فائز بیٹھے تھے جبکہ آخری میز کی دونوں کرسیاں خالی تھیں۔ شکیل کافی دیر سے باہر تھا، ابھی واپس آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے سویرا کو آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا تھا، جسے انہوں نے سمجھ کر سر ہلا دیا تھا۔ فائز نے کن انکھیوں سے اس اشارے کو دیکھا تھا اور اس کے متعلق سوچا بھی تھا۔ فیروزہ مائی البتہ ٹکر ٹکر خالی ہال دیکھ رہی تھیں۔

''یہ ہے پارٹی؟ صرف ہم لوگ ہیں؟ باقی کوئی نہیں آیا؟''

''وہ آ گیا ناں تمہارا رشتے دار!'' شکیل نے تمسخر سے اندر آتے شجاع کی طرف اشارہ کیا جو ہال کا سناٹا دیکھ کر متعجب سا رہ گیا تھا۔ اسے اس سب کی توقع نہیں تھی۔ وہ پارس کی خالی میز کی طرف بڑھا تو اس پر ''ریزروڈ'' لکھا پا کر ٹھہر گیا۔ پھر سویرا کے ہمراہ خالی کرسی پر قدرے ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ سب چپ تھے۔ ان کو انتظار تھا...... کس کا؟ وہ جانتے تھے۔ کیوں؟ وہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

باریک ہیل کی ٹک ٹک نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا...... سیاہ ساڑی میں ملبوس پارس، تنی ہوئی گردن کے ساتھ چلتی اندر آرہی تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ وہی مسکراہٹ جو گزرے سات ماہ غائب رہی تھی۔

''گڈ ایوننگ ایوری ون!'' اسے آتے دیکھ کر فائز اور تنویر صاحب کھڑے ہو گئے۔ وہ مسکرا کر سب کو مخاطب کر کے بولی اور اشارے سے فائز کو اپنے ساتھ آ کر کھڑے ہونے کو کہا۔ اس نے سر کو خم دیا اور پارس کے بائیں جانب آ کھڑا ہوا۔ البتہ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔ کیا ہونے جا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

''میرا خیال ہے سب مہمان آچکے ہیں۔ اس لیے مجھے آپ سب کا تعارف کروا دینا چاہیے۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ ''یہ تنویر صاحب ہیں، ہمارے بہت وفادار ساتھی......''

''یہ سویرا ہیں، رضوان کی عزیز بہن۔''

''یہ میرے والد کی وائف مسز فیروزہ ہیں۔''

''یہ ان کے بیٹے شکیل...... اور یہ میرے تایا کے بیٹے شجاع۔'' وہ سب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتی مسکرا، مسکرا کر کہہ رہی تھی، جواب میں کوئی اچھے اور کوئی برے منہ کے ساتھ سر کو خم دے کر تعارف قبول کرتا۔ آخر میں وہ فائز کی طرف گھومی، مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور...... بآواز بلند بولی۔

''اور یہ فیضان حیات ہیں، رضوان کے بھائی! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہماری دعوت قبول کی، فیضان!'' ایک، ایک لفظ پر زور دے کر اس نے کہا۔ فیضان اس جذباتی کیفیت سے نکل چکا تھا جب وہ بوکھلا یا گھبرا جاتا، پارس کے انداز و اطوار اسے پہلے ہی کسی انہونی کی خبر دے چکے تھے، اس لیے وہ اندرونی جھٹکے اور شاک پہ قابو پا کر پھیکا سا مسکرایا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے بلایا، پارس!'' اس کا لہجہ، نگاہیں...... سب مختلف تھا۔ اس کے سامنے کوئی سر جھکاتا، مودب اٹھلاتی نہیں بلکہ اس کے شوہر کا بھائی کھڑا تھا۔

یہ پارس کی امید سے کم ردِعمل تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی۔ شکیل اور فیروزہ مائی بری طرح چونکے تھے۔ مگر کسی نے کچھ نہیں کہا۔

''بہت دیر کر دی آپ نے آنے میں، فیضان!''

''میں تو ہمیشہ سے آپ کے قریب تھا، آپ نے پہچاننے میں دیر کر دی۔'' وہ بھی مسکرا رہا تھا البتہ اس کی نگاہیں سخت پتھریلی تھیں۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ فون بجنے لگا۔ اس نے بات لبوں پہ روک کر ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھا۔ کوئی غیر شناسا نمبر۔

''ہیلو!'' پارس نے فون کان سے لگایا۔ وہ رضوان کی آواز سننے کی توقع کر رہی تھی مگر یہ کوئی نسوانی آواز تھی۔

''مسز پارس، جلدی سے نیچے آئیں، ریسپشن پہ کوئی عورت آئی ہے آپ سے ملنے، اس کے پاس ایک پیکٹ ہے جو اسے رضوان صاحب نے کسی زمانے میں دیا تھا وہ یہی بتا رہی ہے۔ کسی کو وہ پیکٹ نہیں دے رہی۔ پلیز آپ نیچے آجائیں۔''

فون کٹ گیا۔ وہ ذرا سی الجھی۔ فیضان اسی طرح سے دیکھ رہا تھا۔

''ایکسکیوز می!'' وہ سب کو دیکھ کر بولی اور باہر کی جانب بڑھی۔ فیضان نے آنکھیں سکیڑ کر اس کو جاتے دیکھا۔ پھر گردن موڑی تو شکیل کے لبوں پہ ذرا سی مسکان تھی۔ ساتھ ہی اس نے سویرا کو دیکھا اور سویرا نے اس کو...... فیضان نے بغور ان دونوں کی نگاہوں کے تبادلے دیکھے اور پھر باہر جاتی پارس کو......

وہ تیز قدموں سے چلتی باہر آئی۔ وہ کاریڈور مڑ

کر وہ اس راہداری میں آ گئی جہاں لفٹ تھی۔ لفٹ کے باہر سگنل بتا رہا تھا کہ وہ اسی فلور پہ ہے۔ پارس نے موبائل پہ رضوان کا نمبر ملایا اور لفٹ کے دروازے کا بٹن دبایا۔

سس کی آواز کے ساتھ دونوں دروازے کھلے۔ پارس کو اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز آئی اور سامنے نیم روشن لفٹ، اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

اس کا پاؤں ابھی زمین پہ پڑا ہی نہیں تھا کہ کسی نے اس کا بازو دبوچ کر اس کو پیچھے کھینچا۔ اس کے لبوں سے دبی، دبی سی کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر کاریڈور کی دیوار سے ٹکرائی اور گرتی چلی گئی۔ اس کا سر گول، گول گھوم رہا تھا۔ موبائل زمین پہ جا گرا تھا...... بہ مشکل اپنے چکراتے سر کو سنبھالتے اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ سامنے فیضان کھڑا، سختی سے لب بھینچے اسے دیکھ رہا تھا اور لفٹ کا دروازہ ہنوز کھلا تھا۔

پارس نے اب دیکھا...... لفٹ اندر نہیں تھی۔ اندر خلا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھی۔ اور دروازے سے اندر دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔

لفٹ کئی منزلیں نیچے گری پڑی تھی۔ "اگر وہ اندر قدم رکھ دیتی تو......؟" اس نے بے یقینی سے پلٹ کر فیضان کو دیکھا۔

"میری بہن اور تمہارا بھائی...... میں جانتا تھا وہ یہ سب کر رہے ہیں...... یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمہاری فکر تھی، صرف اس لیے بچایا ہے کہ تم میرے بھائی کی بیوی رہی ہو!" وہ اسے سپاٹ نظروں سے گھورتا پلٹ گیا۔ پارس گہری، گہری سانس لیتی...... بے یقین سی اس کی پشت کو دیکھتی دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک اس کے دل پہ تھا۔

موت، موت کھیلنا بہت آسان تھا، جھیلنا بہت مشکل۔

اس نے ذرا سی گردن پھیر کر دوبارہ اس کھائی کو دیکھا۔ بے اختیار جھرجھری آ گئی۔ جسم پہ چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں، چند گہری سانسیں لے کر خود کو کمپوز کیا اور جھک کر موبائل اٹھایا۔ رضوان کی کال ملی نہیں تھی یا بند ہو گئی تھی، اسے معلوم نہ تھا۔

وہ جب دوبارہ ہال میں داخل ہوئی تو بیاوجود کوشش کے اس کے چہرے کی اڑی رنگت، ہاتھوں کی نامحسوس لرزش اور قدموں کی بے ثباتی چھپی نہ رہ سکی۔ اس کو اندر آتے دیکھ کر شکیل بے اختیار سیدھا ہوا پھر سویرا کو دیکھا۔ ان کے لب بھینچ گئے آنکھوں میں غصہ عود آیا۔

"لفٹ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا ہے، میں نے ریسپشن پہ اطلاع دے دی ہے، وہ لفٹ بند کروا رہے ہیں۔" فیضان نے سرسری سے انداز میں اطلاع دی۔ سویرا نے جیسے ضبط کرتے ہوئے پہلو بدلا۔ پارس کا رنگ ابھی تک سفید تھا۔ وہ بہ مشکل پھیکا سا مسکراتی اسی مرکزی جگہ آ کھڑی ہوئی جہاں فیضان اور وہ پہلے کھڑے تھے اور جہاں فیضان ابھی تک کھڑا تھا۔ سارا پلان، سارا لائحہ عمل چوپٹ ہو گیا تھا۔ حالات کی ذرا سی تبدیلی نے سب ڈسٹرب کر دیا تھا۔

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں، مسز پارس!" فیضان نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑنا چاہا۔

"اپنے بھائی کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا علم تو ہوگا آپ کو!" وہ اپنے سوچے گئے الفاظ دہرانے لگی مگر ان میں وہ جان نہیں تھی جو دس منٹ پہلے کیے جانے پہ ہوتی تھی۔

"مجھے معلوم ہے اور میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں کہ اس سب میں کس کا ہاتھ ہے؟"

شجاع نے بے اختیار مضطرب سا ہو کر پہلو بدلا۔ وہ پریشان ہو رہا تھا۔

"آپ کا فیضان حیات! اس سب کے ذمے دار آپ ہیں، کیا آپ کو وہ شیشے کا ٹکڑا کچھ یاد نہیں دلاتا؟" وہ باوجود کوشش کے اپنے الفاظ کو اتنا زہر خند نہ کر سکی جتنا اس کے خیال میں اسے کرنا چاہیے تھا۔

"میں کسی چیز کا ذمے دار نہیں ہوں۔"

"آپ اس وقت وہیں تھے جہاں رضوان اور میں تھے۔ ہم نے آپ کو دیکھا تھا۔ رضوان نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ وہ آپ کے پیچھے بھاگے تھے جس کی وجہ سے ان کا پاؤں پھسلا اور وہ......"

"آپ نے ان کو دھکا دیا تھا مسٹر پارس!" سویرا مزید برداشت نہ کر سکیں اور اونچی آواز میں بولیں۔

ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ شجاع نے بے یقینی سے سویرا کو دیکھا۔ پارس کے چہرے پر وہی اضطراب تھا۔ فیضان...... غور سے پارس کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس اس بے بنیاد الزام کا؟" وہ بولی تو اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور یہ سویرا کے الزام کی وجہ سے نہیں بلکہ اس واقعے کے باعث تھی۔

"آپ کی اپنی ریکارڈنگ، کیا میں سنواؤں؟" سویرا فاتحانہ مسکرائیں، شکیل کا موڈ آف تھا اور فیروزہ بائی پریشان تھی۔

"میری ایسی کوئی ریکارڈنگ نہیں ہے۔"

"تو پھر سنیے......!" سویرا نے موبائل پہ چند بٹن دبائے اور فائل کھول لی، پارس اور شجاع کی آواز ہر سُو گونجنے لگی۔ شجاع کے بس چند فقرے تھے اور پارس ہی زیادہ بول رہی تھی۔

"آڈیو عدالت میں قبول نہیں ہوتی۔" ریکارڈنگ ختم ہوئی تو پارس گہری سانس لے کر بولی۔ فیضان چونکا۔

"کیا آپ جھٹلا نہیں رہیں......؟" وہ واقعتاً حیران ہوا تھا۔

"میں جھٹلاؤں یا نہ جھٹلاؤں، آپ لوگ میرا

خطا معاف کرنا

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا۔ وہ لوگ کہاں ہیں جو لوگوں کی خطائیں معاف کر دیا کرتے تھے وہ اپنے پروردگار کے حضور میں آئیں اور اپنا انعام لے جائیں کیونکہ ہر مسلمان جس کی یہ عادت تھی بہشت میں داخل ہونے کا حقدار ہے۔"

ذرا سی بات

ایک لباس ہے جو دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے انسان پہ جچتا ہے اور وہ ہے مسکراہٹ۔

از: ارم کمال...... فیصل آباد

اپنے آپ کو پہچانیں

کسی نکتہ دان نے انسانی ذہن کا بڑا خوب صورت تجزیہ کیا تھا۔ وہ یہ کہ...

☆ چھوٹے ذہن کے لوگ شخصیات پر بحث کرتے ہیں۔

☆ اوسط درجے کے ذہن رکھنے والے لوگ واقعات پر بحث کرتے ہیں۔

☆ بڑے ذہن کے مالک، نظریات پر بحث کرتے ہیں۔

☆ عظیم ذہن رکھنے والے خاموشی سے عمل پیرا رہتے ہیں اور وہ لوگ عظیم تر ہوتے ہیں۔ جن کے پاس مثال دینے کے لیے اقوال نہیں بلکہ ان کے اعمال ہوتے ہیں۔

مرسلہ: عظمیٰ شاہین، رحیم یار خان

کچھ نہیں بگاڑ سکتے، یہ آڈیو کوئی ثبوت نہیں ہے۔" وہ پُرسکون بھی تھی اور نہیں بھی تھی۔ وہ ایک وقت میں دو لوگ تھی۔

"پارس...... تو نے...... تُو نے مارا تھا اسے؟" فیروزہ مائی بے یقین تھی۔

پارس چند لمحے خاموش رہی، سب اسی کو دیکھ رہے تھے۔

"ہاں میں نے ہی ان کو دھکا دیا تھا مگر آپ لوگ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

فیضان کے جبڑے اتنی سختی سے بھینچے کہ گردن کی نسیں ابھرنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں غصہ عود کر آنے لگا۔

"میں سمجھتا تھا، آپ بے قصور ہیں مگر نہیں، آپ ہی اس سب کی ذمے دار تھیں اگر یہ بات آپ پہلے کہتیں تو میں آپ کو ہرگز، ہرگز نہ بچاتا۔" وہ شدید صدمے میں تھا، دکھ میں تھا، غصے میں تھا۔

"میں اس آڈیو کو میڈیا پہ دے سکتی ہوں، ہر جگہ تمہاری بدنامی ہوگی اور بالآخر اتھارٹیز کو یہ کیس کھولنا ہی پڑے گا پارس۔" سویرا کے پاس پورا منصوبہ تھا۔ پارس بالکل چپ ہوگئی۔

"مگر آپ ایسا نہیں کریں گی۔" وہ پہلی دفعہ پریشان نظر آنے لگی۔

"ہم ایسا ضرور کریں گے۔" فیضان کہتے ہوئے واپس اپنی کرسی کی طرف چلا گیا۔ وہ جیسے اس کے ساتھ کھڑا بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"نہیں، آپ ایسا نہیں کریں گے، ہم اس بارے میں بات کرسکتے ہیں۔ کوئی ایگریمنٹ کرسکتے ہیں۔" وہ بے قرار ہوگئی۔

"مثلاً...... ہماری زبان بندی کی قیمت کے طور پر تم ہمیں کیا دے سکتی ہو؟" سویرا کی آنکھیں چمکیں۔

"آپ...... کیا لینا چاہتی ہیں؟" وہ واضح شکست خوردہ نظر آرہی تھی۔

"بھائی جی کے تمام ہوٹلز...... ورنہ تم جیل میں ساری عمر سڑو گی اور اسی جوانی میں اوپر چلی جاؤ گی۔ فیصلہ تمہارا ہے۔"

"تمام نہیں، صرف باقی کے دو ہوٹلز۔" وہ جیسے جمع تفریق کرنے لگی تھی۔

"میں اس ہوٹل سے نیچے کسی شے پر راضی نہیں ہوں گی پارس۔"

"مگر...... میں نے آپ کو ہوٹل دے دیے تو میں کہاں جاؤں گی؟"

"بھائی جی کی دلائی ہوئی جیولری تم رکھ سکتی ہو، گھر رکھ سکتی ہو، پھر دوبارہ پھنسا لینا کسی بڈھے کو، اسے بھی مار دینا مگر ہمیں اپنے ہوٹلز چاہئیں۔"

"آپ اس کی یوں توہین نہیں کرسکتیں۔" شجاع تلملا کر بولا۔

"چپ رہو......" سویرا نے ناگواری سے اسے گھورا۔

"ٹھیک ہے! میں آپ کو ہوٹلز دے دوں گی۔" اس نے جیسے بہت تکلیف سے فیصلہ کیا تھا۔

"پارس، بے وقوف مت بنو، یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" شجاع نے بے اختیار اسے روکنا چاہا۔

"آپ ہوٹلز کے کاغذات لے لیں اور مجھے یہ ریکارڈنگ دے دیں۔ بس بات ختم۔"

"بات ختم نہیں ہوئی، مسز پارس اور مسز سویرا!" فیضان نے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میں آپ کو پولیس کے حوالے کرنے جارہا ہوں۔"

"فیضی...... رکو......!" سویرا نے بے اختیار اس کا بازو تھاما، اسے آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ پارس نے بے بسی سے فیضان کو دیکھا۔

"آپ کو ہوٹلز چاہییں ہیں، میں دے رہی ہوں، اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے ہوٹل نہیں چاہیے۔ مجھے میرے بھائی جی

کے خون کا بدلہ چاہیے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ایک، ایک لفظ چبا کر بولا۔

"تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا تھا؟ میں سمجھتا تھا میں ہوٹلز کے لیے آیا ہوں، میں سمجھتا تھا کہ میں خود کو صرف مطمئن کررہا ہوں یہ سوچ کر کہ میں بھائی جی کے لیے آیا ہوں مگر جانتی ہو میں بھائی جی کے لیے آیا تھا کیونکہ میں سویرا آپا کی طرح بے حس نہیں ہوں، وہ میرا باپ جیسا بھائی تھا، اس نے مجھے ہر اس وقت میں سہارا دیا جب میں گرنے والا تھا، وہ میرے لیے ایک مضبوط دیوار تھے، جس پہ میں نے ساری عمر ٹیک لگائی مگر کبھی اس کو گرنے سے بچانے کی کوشش نہ کی۔ پارس، میرے بھائی جی کو مجھ سے ہمیشہ تکالیف ہی ملی ہیں۔ آج تم مجھے شہر کے سارے ہوٹلز بھی دے دو، تب بھی تم مجھے میری تمام غلطیوں کا مداوا کرنے سے نہیں روک سکتیں۔"

پارس نے سوچا تھا، وہ اسے جتائے گی، وہ اسے برا بھلا کہے گی مگر سارے الفاظ ختم ہوگئے تھے، آنسوؤں کا پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا تھا۔

"فیضی، پاگل مت ہو......!" سویرا جھنجلا رہی تھیں۔

"کیا تم اپنے بھائی کے خون کی قیمت نہیں لینا چاہتے؟" پارس بولی تو بس اتنا۔

"میں بہت کچھ ہوسکتا ہوں مگر کسی کی گردن پہ سودے کرنے والا نہیں، تم نے مجھے غلط سمجھا۔" اس نے کہتے ہوئے فون پر ایک نمبر ملایا اور ابھی یس کا بٹن دبانے لگا تھا کہ خاموش بیٹھے تنویر صاحب کھڑے ہوئے۔

"تمہارے بھائی جی زندہ ہیں فیضی......" پارس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گال پر لڑھک گئے، وہ صرف فیضان کو دیکھ رہی تھی۔ جس کا نمبر ملاتا ہاتھ رکا تھا اس نے سر اٹھا کر خالی، خالی نظروں سے تنویر صاحب کو دیکھا۔

"وہ زخمی ہوئے تھے مگر بچ گئے تھے، ہم نے یہ سب صرف اس لیے کیا تا کہ اُن کو محفوظ رکھ کر ان کا علاج کرواسکیں۔ مسز سویرا اور امجد صاحب سے ان کی جان کو شدید خطرہ تھا۔"

فیضان نے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ مڑ کر سویرا کو دیکھا۔ وہ فق ہوتی رنگت لیے کھڑی تھیں۔

"اور کیا تم یہ جانتے ہو کہ یہ تمہیں پارس کو مارنے کے لیے کیوں اکسا رہی ہیں؟ تاکہ تم اسے مار کر خود جیل چلے جاؤ اور انہیں ہوٹلز میں سے تمہارا حصہ نہ دینا پڑے۔"

"یہ...... جھوٹ......" سویرا فقرہ بھی مکمل نہ کرسکیں۔

"بھائی جی...... وہ......"

"وہ ایڈمن بلاک میں اپنے آفس میں ہیں، تم جا کر اُن سے مل سکتے ہو......" فیضان نے بے اختیار پارس کو دیکھا۔ نا سمجھی، حیرانی، بے یقینی۔ وہ اس وقت کئی کیفیات میں گھرا تھا۔ پھر ایک دم وہ باہر کو بھاگا، پارس نے جھلملاتی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ چند منٹ میں ان کے آفس کے گلاس ڈور کے باہر پہنچ چکا تھا۔

اندر وہ اپنی گھومنے والی کرسی...... پہ رخ موڑے نظر آرہے تھے۔ وہ ان کی پیٹھ کو پہچانتا تھا، وہ ان کی خوشبو پہچانتا تھا۔ اس نے مردہ ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ رضوان مڑے اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔ وہ پہلے سے کمزور اور بوڑھے ہوگئے تھے مگر وہ زندہ تھے۔

"میں جانتا تھا تم میرے خون کی قیمت نہیں لوگے۔ میں تمہیں جانتا ہوں فیضی...... میں تمہیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔"

"بھائی جی......" وہ رونا چاہتا تھا مگر رو نہیں سکا۔ بس ان کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ ابھی تک بے یقین تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے گردن اٹھا کر اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں نے...... میں ہمیشہ زیادتی کر جاتا تھا مگر کیا...... کیا ہم پہلے جیسے ہو سکتے ہیں بھائی جی؟ جیسے میرے بچپن میں آپ اور میں ہوا کرتے تھے؟"

"بہن، بھائیوں کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ ان کو پہلے جیسا ہونا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں بھی ہونا پڑے گا۔ شاید کچھ وقت لگے مگر وقت تو ہر چیز میں لگتا ہے فیضی۔" وہ اٹھے اور اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ان کی کمر پر ہاتھ رکھنے کے لیے ہاتھ بھی نہ اٹھا سکا۔ ابھی ان کے قریب آنے، ان کا اعتبار بحال کرنے کے لیے، اسے بہت سا وقت چاہیے تھا۔

☆☆☆☆

ہال کمرے میں وہ اکیلی تھی۔ سوائے شجاع کے سب جا چکے تھے۔ تنویر صاحب، شکیل کو وہاں سے لے گئے تھے۔ پارس کو یقین نہیں تھا کہ وہ شکیل کو سیکیورٹی کے حوالے کر بھی سکیں گے یا نہیں کیونکہ وہ ہر ممکن طور پر بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ سویرا کہاں گئی تھیں، اسے نہیں معلوم...... بس وہ خاموش کھڑی تھی اور شجاع ملامت کردہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر تمہارا شوہر زندہ تھا تو تم نے کل میری بات کیوں سنی؟ میرے جذبات کی توہین کیوں کی؟"

پارس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں، ذرا سا مسکرائی اور اس کے قریب آئی پھر ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔

"میرے بیس روپے، شجاع......؟"

"کیا......؟" وہ حیران ہوا۔

"میرے بیس روپے تم پہ ادھار ہیں شجاع...... یاد ہے تم میرے لیے یہ بالیاں لائے تھے؟ میں نے صدر میں دیکھی تھیں، وہاں سو روپے کی تھیں مگر تم ستر کی لائے تھے۔ میں نے اگلے ہی دن محلے کی دکان سے چیک کر لیا تھا۔ وہ تم اسی دکان سے لائے تھے، اور وہ پچاس روپے کی تھیں...... مجھ سے دکاندار نے جھوٹ بولا یا تم نے بھی سب کی طرح میرا استعمال کیا، میں اس مخمصے میں برسوں سے الجھی تھی اسی لیے میں نے کبھی ان بالیوں کو نہیں اتارا مگر آج میرے دل سے وہ پھانس بھی نکل گئی ہے۔ ہوٹل ان کو دیتے پہ تمہاری بے سکونی مجھے بتا گئی کہ تم ہوٹلز کے لیے میرے پاس واپس آئے تھے۔" اس نے کانوں سے ایک، ایک کر کے بالیاں اتاریں اور ان کو فرش پر پھینک دیا۔

"چلے جاؤ یہاں سے شجاع! تم بھی ہمیشہ سے میرا استعمال کرنا چاہتے تھے، چلے جاؤ۔"

وہ واقعی ایک پل وہاں نہ ٹھہرا بس ویران نظروں سے کبھی اسے دیکھتا، کبھی زمین پر گری بالیوں کو دیکھتا باہر نکل گیا۔

پارس کی آنکھ سے ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ ایک قطرے کی بارش اب سوکھ چکی تھی۔

"رضوان ٹھیک کہتے تھے، یہ فیضان کا امتحان نہیں تھا، میں اپنا اور شجاع کا امتحان لے رہی تھی۔" دل میں لگا آخری کانٹا بھی آج نکل گیا۔ اس نے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر خود کو کمپوز کیا اور ذرا سا مسکرائی۔

اب اسے رضوان کے پاس جانا تھا۔ فیضان بھی وہیں ہوگا، اسے برداشت کرنا اور اس سے نارمل طریقے سے بات کرنا مشکل ضرور ہوگا مگر آہستہ، آہستہ چیزیں نارمل ہوتی جائیں گی۔

اسے یقین تھا۔

وہ باہر چلی گئی۔ ہیل کی ٹک ٹک مدھم ہوتی گئی۔ فرش پر گری بالیاں، اپنے اندر کی ان کہی کہانیاں سموئے وہیں پڑی رہیں۔

ان کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔

(ختم شد)